اردو ادب کی مثبت اور صالح قدروں کا امین

عالمگیر ادب

اورنگ آباد (دکن)

کتابی سلسلہ۔۳

عارف خورشید فن اور شخصیت

مہمان مدیر

نورالحسنین

مجلس مشاورت

رابطہ:

نوائے دکن پبلی کیشنز

''بیت العنکبوت'' پلاٹ نمبر ۷، روبرو مستان فنکشن ہال، مجنوں ہلز، رشید پورہ

اورنگ آباد (دکن) ۴۳۱۰۰۱ (مہاراشٹر) موبائیل: 09372737463

عالمگیر ادب.........کتابی سلسلہ نمبر ۳

اشاعت : جولائی ۲۰۱۲ء

قیمت : ۲۵۰ روپے

کمپیوٹر کمپوزنگ : شکیل الرحمٰن خان، الائیو کمپیوٹرس، چیلی پورہ، اورنگ آباد

Alive Computers : 9823976565

مطبع : سویرا آفسیٹ پریس، وی آئی پی روڈ، بھڑکل گیٹ، اورنگ آباد دکن

ناشر : نوائے دکن پبلی کیشنز، بیت العنکبوت، پلاٹ نمبر ۷،

روبرو مستان فنکشن ہال، مجنوں ہلز، رشید پورہ اورنگ آباد۔ ۴۳۱۰۰۱ (مہاراشٹر)

:

AALAMGEER ADAB

Aurangabad *(Deccan)*

BOOK SERIES

"ARIF KHURSHEED - FUN AUR SHAKHSIYAT"

Publication : July 2012

Price : Rs.250/-

Publisher : Nawa-e-Deccan Publications
'Baitul Ankaboot' plot No.7
Infront of Mastan Function Hall, Majnu Hills,
Rasheedpura, Aurangabad-431 001.
(Maharashtra)

Mobile :09372737463

دستیاب ھے :

(۱) مرزا ورلڈ بک، حمید کامپلیکس، جنسی روڈ، قیصر کالونی، اورنگ آباد ۴۳۱۰۰۱

(۲) مکتبہ اسلامی، روبروبنے میاں درگاہ، شاہ گنج، اورنگ آباد ۴۳۱۰۰۱

انتساب

ان مخلص دوستوں کے نام
جو ہمیشہ میری ہمت شکنی میں
صادق رہے۔

عارف خورشید

ترتیب وتہذیب

عارف خورشید کے خاکوں پر مضامین

آزمائش کی گھڑی (کتابوں پر تبصرے اور افسانوں کے تجزیے)

اداریہ

ادب کے ماہتاب و آفتاب

نورالحسنین

''عالمگیر ادب'' کا تیسرا شمارہ تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کر رہا تھا۔ ہر اتوار کی میٹنگ عارف خورشید کے فن پر ملنے والے مضامین پر کھل کر بحث کرتی، اُن میں سے کچھ رد ہو جاتے اور کچھ منتخب کر لیے جاتے، جو منتخب ہو جاتے اُنھیں کتابت کے سیکشن کے سپرد کر دیا جاتا۔ یہ سلسلہ چند مہینوں سے بڑی پابندی کے ساتھ چل رہا تھا۔

اس تیسرے شمارے کی ادارت، مجلسِ مشاورت نے میرے سپرد کر رکھی تھی اور میں پریشان تھا کہ دو شماروں کے بھرپور اور معیاری اداریوں کے بعد اب میں کیا لکھوں؟ دماغ میں ایک ہجوم تھا اور پہلا جملہ کاغذ پر اترنے کے لیے تیار نہ تھا، میں بہت دیر تک اُسے مناتا رہا لیکن وہ اُسی طرح اٹکھیلیاں کرتا رہا۔ آخر تھک ہار کر میں اپنے رائٹنگ ٹیبل پر سے اٹھا اور سامنے پڑے ہوئے تخت پر لیٹ گیا لیکن سوچ سے نجات نہیں ملی۔ میں پھر اُسی میں غرق ہو گیا کہ آخر اپنے اس اداریے کا آغاز کروں تو کہاں سے کروں۔

اچانک ہوائیں تیز تیز چلنے لگیں۔ کھڑکیوں اور دروازے کے پٹ کھڑکھڑانے لگے۔ میں ہراساں اُن کی طرف دیکھ رہا تھا کہ مجھے اپنے دروازے کے اُس طرف بہت سارے افراد نظر آئے۔ ابھی میں اُنھیں پہچاننے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک پوری جماعت وفد کی صورت میں میرے کمرے میں داخل ہو گئی۔ میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ اُن کی آنکھوں سے واضح طور پر غصہ چھلک رہا تھا۔

''اے حضرتِ ولؔی ملاحظہ فرمائیں یہ ہیں آپ کے وارث'' ایک سرگوشی ابھری۔

حضرت ولؔی اورنگ آبادی نے میری طرف گھور کر دیکھا:

''غفلت میں وقت اپنا نہ کھو، ہشیار ہو ہشیار ہو
کب لگ رہے گا خواب میں بیدار ہو بیدار ہو''

''ارے حضور یہ کیا بیدار ہوں گے؟ اُن کے اخلاق تو دیکھیے، سامنے بزرگ کھڑے ہیں لیکن نہ سلام نہ آداب، نہ استقبال نہ احتجاج، بس چشمِ حیراں، گویا حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا......؟'' سوٹ اور ٹائی میں ملبوس ایک صاحب نے مجھ پر طنز کیا۔

''اوہ......!'' میرے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی، کیونکہ میں نے اُن سب کو پہچان لیا تھا۔ میں نے نہایت احترام کے ساتھ کہا: ''حضرتِ عزیز احمد آپ کا غصہ اور طنز بجا ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں اور نہایت خلوصِ دل کے ساتھ آپ تمام کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ آیئے تشریف رکھیے اور مجھ ناچیز کو خدمت کا موقع عنایت فرمایئے۔''

وہ سب کرسیوں پر بیٹھ ہی رہے تھے کہ حضرت شاہ سراؔج اورنگ آبادی نے اپنی گھنی زلفوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا: ''برخوردار! یہاں ہم تم سے اپنی خدمت کروانے نہیں آئے ہیں بلکہ تمھاری تنبیہ ہمارا مقصد ہے۔''

میں نے حیرت سے سب کی طرف دیکھا تو حضرت ولؔی اورنگ آبادی گویا ہوئے: ''یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم لوگوں نے؟ اپنے ہی بارے میں آپ نمبر شائع کر رہے ہو؟ کیا واقعی تم لوگ ادب کے ماہتاب و آفتاب بن چکے ہو؟'' اُن کے چہرے پر طنز اُبھر آیا: ''ہم کو دیکھو، ہم نے کبھی اپنے بارے میں کچھ نہیں لکھا، پھر بھی ہمیں دنیا جانتی ہے اور ہمیں عزت کی نگاہوں سے دیکھتی ہے:

ولؔی ایران و توراں میں ہے مشہور
اگرچہ شاعر ملکِ دکن ہے''

میں نے مسکرا کر اُن کی طرف دیکھا: ''لیکن حضرت آپ کی اس خوبی نے آپ کو بے وطن کر دیا ہے۔ اس کا اندازہ ہے آپ کو؟ یہاں تک کہ آپ کی تاریخِ پیدائش، تاریخِ وفات اور مقامِ مدفن بھی آج معمہ بنے ہوئے ہیں۔ جو بھی ان گتھیوں کو سلجھانے کی خاطر خامہ فرسائی کرتا ہے وہ مشکوک ہو جاتا ہے۔ اس لیے پچھلی صدی نے آپ کو بالکل ہی فراموش کر دیا تھا۔ وہ تو بھلا ہو حیدر آباد دکن کے محقق ڈاکٹر محی الدین قادری زوؔر کا جنھوں نے آپ کو پھر سے ایک بار موضوعِ بحث بنا دیا ورنہ آپ تو زمین سے اُٹھ ہی چکے تھے۔''

''ہائیں......'' ولؔی اورنگ آبادی نے میری طرف حیرت سے دیکھا: ''کیا لوگوں تک

لالہ لچھمی نرائن شفیق کا تذکرہ بھی نہیں پہنچا؟''

''اور کہیے زور سے ہرگز وَلی کے پاس تم باتاں وطن کی مت کہو۔'' شاہ سراج اورنگ آبادی کے چہرے پر شرارت کھیلنے لگی اور وَلی اورنگ آبادی نے اُن کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا گویا شاہ سراج آج کے ایجنڈے سے بغاوت کر رہے ہیں۔

اے شہسوار تو جو چلا ہے رقیب پاس
سینے میں عاشقاں کے اُٹھا ہے غبار دیکھ

تمام لوگ شاہ سراج کی طرف متوجہ ہوئے تو انھوں نے اپنی گردن جھکا دی اور نہایت ادب سے کہا:

''صدق دل سیں غلام ہوتا ہوں
بندہ پرور ہو، اے غریب نواز''

''ہم آپس ہی میں اُلجھ رہے ہیں جبکہ ہمارا آج کا ایجنڈا عالمگیر ادب کے مدیر کی تنبیہ کرنا ہے۔'' عزیز احمد نے پھر سے مقصد کو لاگو کرنے کی کوشش کی، لیکن وَلی اورنگ آبادی کے چہرے سے اب بھی پریشانی جھلک رہی تھی۔

''حضور والا! آپ بلاشبہ بابائے سخن ہیں۔ ادب میں آپ کی سلطنت مستحکم ہے۔ بھلا اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ تری آواز پر ہر صاحبِ دل سر کو دھنتا ہے۔

دکن کا ذکر کیا، ہندوستان خاموش سنتا ہے، لیکن حضور پھر بھی وطنیت کچھ تو معنی رکھتی ہے۔''

''تم چپ رہو سکندر علی وجد۔ تم نے اٹھنے میں دو سو برس لگا دیے۔'' وَلی اورنگ آبادی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ ''تم لوگ مجھے عالمگیر ادب کے مدیر کی تنبیہ کرنے کے لیے یہاں لائے ہو یا مجھے اپنے ہی شہر میں شرمندہ کرنا چاہتے ہو؟''

''اپنا شہر؟'' قاضی سلیم کسی گہری فکر سے اٹھے: ''لیکن حضور آپ نے اشعار تو شہرِ سورت کی شان میں کہے ہیں۔''

''تو کیا میں اُس کی وجہ سے گجراتی ہو گیا؟'' وَلی بھڑک اٹھے ''اور تم قاضی سلیم...... تم نے بھی تو بمبئی پر نظم لکھی ہے...... تو کیا کل لوگ تمھیں بھی بمبئی کا بابو کہیں گے۔؟''

''اگلی تحقیق میں اگر کوئی ظہیر الدین مدنی پیدا ہو جائے تو یہ مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''یہ مسئلہ تو وجد صاحب کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ انھوں نے بھی حیدر آباد پر نظم لکھی ہے۔''

وجد صاحب نے قاضی سلیم کی طرف غصے سے دیکھا: ''عمر ایک میعاد کی چیز ہوتی ہے قاضی سلیم۔ وہ تم پوری کر چکے ہو، لہٰذا اب تم خاموش ہی رہو۔''

''خاموش ہو جاؤ تم لوگ'' ولی نے دونوں کو آنکھوں سے اشارہ کیا اور پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے: ''کہاں ہے وہ ڈاکٹر عصمت جاوید......؟''

اور ڈاکٹر عصمت جاوید، عزیز احمد کے پیچھے چھپنے لگے۔

''میں پوچھتا ہوں، تم تو تحقیق کا کاروبار کر رہے تھے نا عصمت جاوید؟ تم کو یہ کیوں نہیں سوجھا کہ مجھے شہرِ سورت اس لیے پسند آیا تھا کہ اُس وقت وہی تو ایک راستہ تھا جنوب والوں کے لیے جو مکہ، مدینہ پہنچاتا تھا۔''

سب کے چہروں پر تحسین آمیز مسکراہٹ پھیل گئی لیکن عزیز احمد کی زبان سے نکلا: ''لیکن حضور میرے دل میں تو اِس کے بارے کچھ اور ہی خیال آیا تھا۔''

''کیا خیال آیا تھا؟''

''میں سوچتا تھا کہ...... چونکہ اُس زمانے میں شہرِ سورت نہایت خوبصورت حسیناؤں کا شہر تھا اور آپ ٹھہرے رومان پسند شاعر، شاید اسی لیے آپ نے......''

''بس اس کے آگے ایک لفظ بھی نہیں عزیز احمد ...... ساری زندگی تم ادب میں جنسی موضوعات برتتے رہے ہو کیا اس کے آگے تم سوچ نہیں سکتے......''

''لیکن جنابِ والا پھر بھی سوال باقی رہتا ہے کہ آخر آپ نے اپنے شہر اورنگ آباد پر کیوں نہیں لکھا؟'' اختر الزماں ناصر نے اپنی تازہ بہ تازہ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

''اوہ......تو اب تم بھی مجھ پر طنز کرو گے؟ چلو میں بھی تم سے ایک سوال کرتا ہوں، میرے شہر میں رہتے ہوئے بھی تم داغ دہلوی کے مقلد کیوں ہو گئے؟ کیا تم کو میں یا شاہ سراج اورنگ آبادی نظر نہیں آئے تھے؟ مجھ پر طنز کرتے ہو، ارے میں نے تو پورے دکن کو اپنے نام کے ساتھ جوڑ لیا تھا۔''

''اسی لیے تو آپ کو وَلی گجراتی کہتے ہیں۔'' عصمت جاوید نے کہنا شروع کیا: ''کیونکہ محققین کا کہنا ہے کہ کسی زمانے میں گجرات کو بھی دکن ہی کہا جاتا تھا۔''

''بے وقوف ہیں وہ لوگ ...... تم نے کبھی کسی تاریخ میں احمد آباد دکن یا سورت دکن پڑھا ہے؟ جبکہ یہ نام دکن کے بھی صرف دو شہروں کے لیے ہی لکھا گیا۔ اورنگ آباد دکن یا حیدر آباد دکن۔ اس کے بعد بھی کیا میرے اورنگ آبادی ہونے کا کوئی اور ثبوت چاہیے؟ کہو تو اب میں لکھ کر دوں؟''

''حضور! اب آپ کی بات پر بھی لوگ بھروسہ نہیں کریں گے، کیونکہ ادب کی عدالت دلیل اور حوالہ مانگتی ہے۔'' میں نے پھر آہستہ سے کہا۔

وَلی کا چہرہ فکر و تردد سے بھر گیا اور وہ اپنی ڈاڑھی کے بال نوچتے ہوئے مایوس لہجے میں گویا ہوئے'' کیا دکن میں اب کوئی محقق و ناقد باقی نہیں رہا؟''

''ہیں...... '' ایک بھاری بھرکم آواز ابھری، سب آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ دروازے کے پردے کے پیچھے سے جاوید ناصر جھانک رہے تھے'' حضرت یہ سارے ناقد علاقائی حیثیت رکھتے ہیں اور اخباروں میں چھپ کر ہی خوش ہو جاتے ہیں۔''

میں نے آگے بڑھ کر اُن کا ہاتھ پکڑا اور انھیں کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہنے لگا: '' جاوید صاحب ...... یہ سب لوگ تو کب کے یہاں پہنچ چکے ہیں۔ آپ کہاں رہ گئے تھے؟''

جاوید ناصر کے چہرے پر بچوں جیسی معصوم مسکراہٹ پھیل گئی: '' میں نکلا تو ان ہی لوگوں کے ساتھ تھا لیکن راستے میں حضرت غالبؔ مل گئے تھے۔''

سب نے اُن کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوئے: '' آپ بھی تو اپنوں پر نہیں لکھتے، آپ کی نظریں بھی کوہِ ست پڑا کے اُس طرف کے لوگوں پر ہی ٹھہرتی ہیں۔''

میرا سر جھک گیا لیکن پھر بھی میری زبان سے نکلا: '' جناب میں نے اپنے شہر کے تمام افسانہ نگاروں پر لکھا ہے۔''

'' اچھا تو کیا میرے شہر اورنگ آباد کی اپنی افسانہ نگاری کی بھی کوئی روایت بن چکی ہے؟'' حضرتِ وَلی کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا، میاں یہ شہر ہے ہی تخلیق کاروں کا۔'' اُن کی نگاہیں اور اٹھ گئیں۔

''جی ہاں......میں نے......''

''عزیز احمد تمھارا تعلق شہر عثمان آباد سے ہے۔ میں اپنے شہر خجستہ بنیاد اورنگ آباد کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔'' انھوں نے عزیز احمد کی بات کاٹی اور مجھے اشارہ کیا تو میں نے بتانا شروع کیا:''جناب والا اس شہر میں پہلا افسانہ کس نے لکھا یہ تو معلوم نہیں......لیکن ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے ترقی پسند تحریک کے زمانے ہی میں وہ افسانہ لکھا تھا جو بعد میں جدیدیت سے ہوتا ہوا مابعد جدیدیت کا افسانہ ٹھہرا، بعد میں وہ تحقیق اور تنقید کی طرف راغب ہوگئیں اور حیدرآباد کو ہمیشہ کے لیے آباد کرلیا تھا۔ اُن کے ساتھ ہی وحیدہ نسیم اور زہرہ رضویہ نے افسانے لکھے لیکن بدقسمتی سے یہ دونوں اورنگ آباد چھوڑ کر ممالک غیر میں آباد ہوگئیں۔''

''یعنی وہی شہرت کا شوق، ایران وتوران والا......؟'' شاہ سراج کے چہرے پر پھر سے شوخی دوڑ گئی اور حضرتِ ولی نے اُن کی جانب گھور کر دیکھا، تو عصمت جاوید نے آہستہ سے کہا:''شاہ صاحب آپ نے بھی تو شہرت کے آسمانوں کی خوب سیر کی ہے۔''

''خبر تحیرِ عشق سُن...... یہ کیا کہہ رہے ہیں۔'' اور وہ دروازے سے باہر دیکھنے لگے اور ٹھیک اُسی وقت وجدؔ صاحب کا ترنم فضاؤں میں گونجنے لگا:

''ترے در پر بہارِ نوجوانی چھوڑ آیا ہوں
نیاز و ناز کی پہلی کہانی چھوڑ آیا ہوں''

''اے میاں وجدؔ...... یہاں صرف تمھارے ہی نیاز و ناز کی اکیلی کہانی نہیں ہے۔ ہم نے بھی جانے کتنی کہانیاں چھوڑی ہیں......

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

حضرتِ ولیؔ بھی یادوں کے نگر میں کہیں بھٹکنے کے لیے نکل ہی رہے تھے کہ میں نے انھیں ٹوکا:''حضور آپ اورنگ آباد کے افسانہ نگاروں کی روایت جاننا چاہ رہے تھے۔''

انھوں نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا گویا اشارہ کررہے ہوں ''بیان ہو'' اور میں نے کہنا شروع کیا:''۱۹۴۷ء کے بعد افسانہ نگاروں کی جو نسل سامنے آئی اُن میں الیاس فرحت، رفعت نواز،

اثر فاروقی، محمود شکیل اور رشید انور کے نام ہیں۔ الیاس فرحت کے افسانوں پر سعادت حسن منٹو کا رنگ غالب ہے۔ رفعت نواز نے گھر کی چار دیواری سے اپنے افسانوں کا ایوان سجایا ہے۔ اثر فاروقی نے روایتی اور جدید دونوں قسم کے افسانے لکھے۔ محمود شکیل نے ہندو میتھالوجی کی روایتوں سے اپنے افسانوں میں گہرائی و گیرائی پیدا کی۔ رشید انور کے افسانے موضوعی اعتبار سے رفعت نواز سے قریب اور اسلوب میں محمود شکیل کے ہمرکاب رہے ہیں۔ اُن کے بعد عارف خورشید اور عظیم راہی اور اس خاکسار نورالحسنین نے اس فن کو اپنایا۔ ہمارے بعد ساحر کلیم، سلیم احمد اور شیخ حسین بھی ہیں۔ ان تینوں میں ساحر کلیم پوری دلجمعی کے ساتھ لکھ رہے ہیں اور ہاں ...... یہاں پر مشہور افسانہ نگار جوگندر پال نے بھی کافی عرصہ بتایا ہے اور یہیں پر رہتے ہوئے انھوں نے اردو افسانے کے نئے اُفق دریافت کیے......''

''لیکن ان سب کو تو آپ نے صرف ایک ہی مضمون میں سمیٹ لیا۔'' جاوید ناصر کی آواز قدرے اونچی ہوگئی'' حالانکہ اِن میں سے ہر ایک افسانہ نگار تفصیلی مضمون کا متقاضی ہے۔''

''میں جلد ہی سب پر علیحدہ علیحدہ تفصیلی مضامین لکھوں گا۔'' میں نے فوراً اقرار کیا۔

''ہاں ہاں ...... سب پر کام ہونا چاہیے۔'' غالباً ڈاکٹر عصمت جاوید نے کہا تھا۔

''میں نے بھی یہاں رہ کر بہت کام کیا ہے۔'' دور سے ایک آواز ابھری۔

''یہ کون بولا......؟'' وَلی نے سب کی طرف دیکھا۔

''یہ آواز میرے محسن مولوی عبدالحق کی ہے۔'' عزیز احمد کا چہرہ خوشی سے جگمگانے لگا:'' واقعی بابائے اردو نے یہاں رہ کر ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔''

''وہ اندر کیوں نہیں آتے؟''

''حضرت وہ آپ کی موجودگی میں یہاں نہیں آسکتے۔'' بہت دیر سے خاموش بیٹھے ہوئے شیخ چاند نے آخر اپنی زبان کھولی۔

وَلی اورنگ آبادی نے پھر ایک بار سب کی طرف حیرت سے دیکھا۔

''حضور یہی تو وہ ہیں جنھوں نے اپنی تنقید اور تحقیق کی آڑ میں کاٹ چھانٹ کر آپ کی وطنیت کے خلاف سارا مواد ظہیرالدین مدنی جیسے ناقدین تک پہنچایا ہے۔ وہ اس محفل میں کیسے آسکتے ہیں؟'' میری زبان سے نکل گیا۔

ولیؔ اورنگ آبادی پھر ایک بار اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

''بس حضور اسی سبب سے ہم نے عالمگیر ادب کو جاری کیا ہے اور اپنے بارے میں ساری حقیقتیں خود ہی لکھ رہے ہیں تاکہ ہمارے بارے میں کوئی غلط سلط بات بعد کے محققین کا کارنامہ نہ بن جائے۔ حضور والا! ہم کو نہ تو ادب کے ماہتاب و آفتاب ہونے کا دعویٰ ہے اور نہ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ ہماری شہرت ایران و توران تک ہے۔ ہاں اپنے علاقے میں بیٹھے ہیں اور خاموشی سے ادب کا کام کر رہے ہیں۔ ہمیں نہ تو کوئی خوش فہمی ہے اور نہ ہم کسی غلط فہمی میں گرفتار ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس سے نہ نیک نامی ہوگی نہ بدنامی...... لیکن کم از کم ہمارے بارے میں صحیح باتیں تو جمع ہو جائیں گی۔ اب آپ ہی کہیے کیا ہم کوئی غلط کام کر رہے ہیں؟''

''قطعی نہیں......'' حضرت ولیؔ نے میری طرف نہایت شفیق نظروں سے دیکھا: ''کاش ہمارے زمانے میں بھی کوئی اس طرح سوچتا اور ایسا کام کر جاتا تو آج ہم اپنے وطن میں رہتے ہوئے بھی بے وطن نہ ہوتے۔'' پھر وہ میری طرف بڑھے اور مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور مسرت سے اتنی زور سے بھینچا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میں حیرت سے اپنے کمرے کا جائزہ لینے لگا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ کھڑکیوں اور دروازے کے پردے ہوا سے جھول رہے تھے۔ میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور میں کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ گیا۔

عارف خورشید کے اس نمبر کی تیاری کا جس وقت آغاز ہوا تھا تو اندازہ بھی نہیں تھا کہ اُن کے فن پر اس قدر احباب مضامین لکھیں گے اور وہ اتنا ضخیم نمبر ہو جائے گا۔ مجبوراً ہمیں وہ کام کرنا پڑا جس کے لیے ہم قطعی تیار نہیں تھے۔ بہت سارے مضامین تمام تر پسندیدگی کے باوجود ہم اس نمبر میں شامل نہ کر سکے۔ ادارہ اس کے لئے اُن تمام بہی خواہوں سے معافی چاہتا ہے، اس وعدے پر کہ آئندہ جب بھی عارف خورشید پر اس سلسلے کا ضمیمہ شائع ہوگا انھیں شامل کر لیا جائے گا۔

یہ نمبر اب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہم نے پہلے بھی کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا اور اب بھی ہم کوئی دعویٰ نہیں کر رہے ہیں، صلہ اور ستائش کی تمنا سے پرے بس اپنا کام کیے جا رہے ہیں اور آپ تمام کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ آپ کی آرا ہی ہماری محنت کا ثمرہ ہے۔

☆☆☆

شخصی کوائف

نام	:	عارف علی خان
قلمی نام	:	عارف خورشید
والد	:	مصطفیٰ علی خان
والدہ	:	اقبال بیگم
ولادت	:	یکم دسمبر ۱۹۵۰ء
تعلیمی قابلیت	:	ایم۔اے (اردو)، بی۔پی۔ایڈ
بہنیں	:	(۱) سلطانہ بیگم زوجہ غلام محمد خان
		(۲) رضیہ بیگم زوجہ عبدالوحید خان
		(۳) صابرہ بیگم زوجہ سید عظیم الدین
		(۴) وصیہ بیگم زوجہ مقتدا خان افسر
عقدِ نکاح	:	پندرہ جولائی ۱۹۷۳ء
رفیقۂ حیات	:	فرحانہ سلطانہ
اولاد و احفاء	:	بیٹے
		(۱) مصطفیٰ علی خان آصف
		(بہو: معراج فرحین)
		(۲) ڈاکٹر مجتبیٰ علی خان جاوید
		(بہو: ڈاکٹر سیدہ سیرت قادری)
		(۳) مرتضیٰ علی خان شارق
		(بہو: عطیہ فاطمہ)

پوتے

(۱) اواب علی خان ولد مصطفیٰ علی خان آصف

(۲) ثروان علی خان ولد مصطفیٰ علی خان آصف

(۳) اجتبیٰ علی خان ولد ڈاکٹر مجتبیٰ علی خان وجاوید

پوتیاں

(۱) عابیہ فاطمہ بنت مصطفیٰ علی خان آصف

(۲) احور فاطمہ بنت مصطفیٰ علی خان آصف

(۳) ایمن خان بنت مرتضیٰ علی خان شارق

(۴) مبرور خان بنت مرتضیٰ علی خان شارق

ملازمت : وظیفہ یاب مدرس مولانا آزاد ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج اورنگ آباد

تصانیف :

(۱) ٹوٹا ہوا آئینہ	شاعری	1985ء
(۲) سنہری رت کا فریب	افسانے	1986ء
(۳) یادوں کے سائبان	افسانچے	1987ء
(۴) لمحوں کی صلیب	شاعری	1987ء
(تین شاعروں کی شاعری)		
(۵) یہ شام بھی کہاں ہوئی	افسانے	1987ء
(تین افسانہ نگاروں کے افسانے)		
(۶) آنکھوں کی زبان	افسانچے	1987ء
(۷) دھول کی شال	نظمیں	1988ء
(۸) آتشیں لمحوں میں	افسانچے	1989ء
(۹) لہولہو آرزو	ناولٹ	1990ء
(۱۰) احساس کا زخمی مجسمہ	افسانے	1991ء
(۱۱) تنظیم کثیر رنگی	خاکے	1992ء

(۱۲) قافلے والو سچ کہنا افسانے 1999ء

(۱۳) اور کچھ بھی نہیں کہانی میں افسانچے 2000ء

(۱۴) رنگِ امتزاج (تبصرے اور خاکے) 2003ء

(۱۵) سوچ کے جزیرے شاعری 2009ء

(۱۶) وقت کے چاک پر نثری کاوش 2010ء

آنے والی تصانیف : (۱) چیخ کی میعاد ناول

(۲) اور کیا ہے نیا کہانی میں افسانچے

دیگر مسودوں کے ابھی عنوانات طے نہیں کیے گئے۔ اس کے علاوہ دماغ میں بہت سی کتابیں ہیں پتہ نہیں وہ کاغذ پر آپائیں گی بھی یا نہیں اس لیے کہ بظاہر وقت کم رہ گیا ہے۔

انعامات واعزازات: ایک بھی نہیں۔ کیونکہ سفارش پسند نہیں۔ خریدنے کا قائل نہیں۔

سماجی روابط :

(۱) صدر: ہند اردو سوسائٹی رجسٹرڈ اورنگ آباد دکن

(۲) صدر: صدف ایجوکیشنل لکچرر اینڈ ویلفیئر سوسائٹی رجسٹرڈ، اورنگ آباد دکن

(۳) صدر: مولانا آزاد وضیاء العلوم کوآپریٹیو کریڈٹ سوسائٹی لمیٹیڈ اورنگ آباد دکن

(۴) خازن: مجلس اردو صحیفہ نگاران رجسٹرڈ، اورنگ آباد دکن

(۵) مینیجنگ ڈائریکٹر: نوائے دکن پبلیکیشنز اورنگ آباد دکن

(۶) پروپرائٹر لینڈ لنکر، مجنوں ہل، رشید پورہ اورنگ آباد دکن

(۷) مدیر ''عالمگیرادب'' کتابی سلسلہ، مجنوں ہل رشید پورہ اورنگ آباد دکن

(۸) مدیر ''فن اور فنکار'' ادبی صفحہ روزنامہ ''مفسر'' اورنگ آباد دکن

(۹) سکریٹری، مولانا آزاد ہاؤزنگ سوسائٹی مجنوں ہل، رشید پورہ اورنگ آباد دکن

(۱۰) مشغلہ: دوستانہ، چھیڑ چھاڑ (مقصد خوش رہنا اور رکھنا)

(۱۱) شوق: فنونِ لطیفہ سے خصوصی دلچسپی

(۱۲) رابطہ: ''بیت العنکبوت'' پلاٹ نمبر ۷، روبرو مستان فنکشن ہال، مجنوں ہل، رشید پورہ، اورنگ آباد۔ ۴۳۱۰۰۱ مہاراشٹر۔ موبائیل نمبر: 0937273763

مہتاب لب جو

(سراپا)

سراپا

نورالحسنین

چہرہ وہ کتاب جس کی ایک ایک سطر میں سخت محنت اور جدوجہد کی داستانیں رقم ہوں، گھنے بالوں کے نیچے روشن پیشانی جو اعلان کرتی ہو کہ تقدیر کا حصول بنا تدبیر ممکن نہیں، بلند ستواں ناک جس سے پٹھانی جلال و جمال جھلکتا ہو، بڑی بڑی آنکھیں جن سے بیک وقت ذہانت اور شرارت کے فوارے اچھلتے ہوں، چہرے پر گھنی کھچڑی داڑھی جس میں ڈھونڈھے سے بھی کوئی تنکا نہ ملے، اوسط قد و قامت، صحت مند جسم، مضبوط اِرادوں کے دھنی، دل کے غنی، وجاہت کے پیکر، دوستی کے خوگر، ادب کے رسیا، سب کے من بسیا، یہ ہیں عارف خورشید!

میں جب بھی انھیں دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ زبان کی محبت میں یہ اور کتنے دشمن پیدا کریں گے۔ ان کی عدالت میں ہر خطا پر معافی ممکن ہے لیکن زبان کی غلطی پر کوئی گنجائش نہیں، وہ تو بھلا ہوا کہ زمانہ بدل گیا ورنہ پتہ نہیں کتنے قابلِ گردن زدنی کی سزا پا کر ادب ہی سے نہیں زندگی سے بھی محروم ہو جاتے۔

عارف خورشید ان لوگوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی زندگی آپ تعمیر کی، ورنہ اس مکافاتِ عمل میں ان کے لیے آزمائشوں کی کمی نہ تھی۔ بچپن ہی میں یتیمی نے دھول کی شال اڑھائی۔ جوانی میں قدم رکھا تو سوچ کے جزیروں نے سنہری رُت کا فریب دینا چاہا لیکن جو شخص وقت کے چاک پر آتشی لمحوں سے کھیلتا رہا، ٹوٹا ہوا آئینہ اس کا مقدر کیوں کر ہو سکتا تھا؟

چنانچہ زمانہ ہار گیا اور عارف خورشید اس جہانِ آب و گل مین خوشیوں کا باغ لگانے میں کامیاب ہو گئے۔

ادب کی بساط پر کتنے کامیاب و کامران ٹھہرتے ہیں اور کتنے گمنامی اور بدنامی کے غاروں میں دھکیل دیے جاتے ہیں لیکن عارف خورشید اس بساط پر بھی سرخرو ثابت ہوئے۔ انھوں نے افسانے

کے طلسم ہوش رُبا سے آخر شہرت کا سورج روشن کر ہی لیا۔ شاعری سے دل لگایا تو شاعری نے بھی انھیں دھوکا نہیں دیا۔ پیشہ درس و تدریس کو گلے لگایا تو عزت و توقیر کے ساتھ سبکدوشی بھی نصیب ہوئی۔ تجارت سے آنکھیں چار کیں تو تجارت نے بھی انھیں ہاتھ نہیں دیا۔ غرض انھوں نے ہاتھ میں مٹی اٹھائی تو محنت نے اسے سونا بنا دیا۔

عارف خورشید کی ان کامیابیوں کا راز جاننے کے لیے ایک دن جب مراقب ہوا تو مجھ پر کھلا کہ جس وقت وہ عالم بالا سے عالم آب و گل کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو انھیں ایک ندا آئی تھی کہ دل کی دنیا چاہیے یا عقل و حکمت؟

تو انھوں نے جواب دیا تھا، دل پروانوں کی میراث ہے اور عقل جہانداروں کا کھیل اور مجھے کھیل پسند ہے۔

چنانچہ نہ کبھی کسی سے دل لگایا نہ چوٹ کھائی نہ مجنوں بنے۔ عقل کا استعمال کیا ایک حور شمائل کا انتخاب کیا اور زندگی کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اسی عقل کے بل بوتے اولاد کو اعلیٰ تعلیم دی، زندگی کے بڑے بڑے معرکے سر کیے اور مانند خورشید اپنی تابانی بکھیرتے رہے۔

آج ادب اور زندگی کے بازار میں عارف خورشید ایک کامیاب انسان کی صرف پہچان ہی نہیں بلکہ زندگی کو کس طرح کامیاب بنایا جا سکتا ہے اس کی علامت بن چکے ہیں اور وقت ان کے پیچھے آنے والوں سے سوال کر رہا ہے کہ اے قافلے والو سچ کہنا، کیا تم نے عارف خورشید سے کچھ سیکھا؟

☆☆☆

رنگ رخ

(خاکے)

عزم و عمل کا پیکر

احمد اقبال

اورنگ آباد کے قدیم مولانا آزاد اسکول میں ۷ مارچ ۱۹۷۲ء کو ایک خوش پوش اسمارٹ نوجوان سے میری ملاقات ہوئی۔ کلین شو، سرخ و سفید رنگت، متناسب قد و قامت، چہرے پر ذہانت اور سنجیدگی، پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ بحیثیت ڈرائنگ ٹیچر رجوع بہ کار ہوا ہے۔ نام ہے عارف علی خان۔

ہم سب نے اس کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ اُسے وہ کمرہ دکھایا گیا جسے ''ڈرائنگ روم'' کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ چند روز کے اندر ہی چپراسیوں اور طلباء کی مدد سے کمرے کو بڑے سلیقے سے سجایا گیا۔ دیواروں پر عارف نے اپنی بنائی پینٹنگز آویزاں کی۔ ایک بڑی میز، جس پر ایک خوبصورت میز پوش، ضروری کاغذات، پیپر ویٹ، قلم دان، چند کرسیاں، طلباء کے لیے ڈیسک رکھے گئے۔ ڈرائنگ کے پریڈ میں طلباء اسی کمرے میں آتے۔ خالی اوقات میں ساتھی اساتذہ بھی آکر وقت گزارتے، حالانکہ اسٹاف روم موجود تھا۔

دورانِ گفتگو معلوم ہوا کہ وہ یکم دسمبر ۱۹۵۰ء کو اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے والدِ محترم مصطفےٰ علی خان ۱۹۶۰ء میں صرف تیس سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اُس وقت والدہ محترمہ کی عمر محض پچیس سال تھی۔ عارف علی خاں کی عمر تیرہ برس ہی کی تھی وہ بھی چل بسیں۔

دادا حضرت، چونکہ حضرت عارف باللہ کے معتقد تھے۔ اِس لیے ان کا نام عارف علی خاں رکھا گیا۔ ننھیالی لوگ نواب خورشید علی خاں سے متاثر تھے اس لیے خورشید کے نام سے بھی پکارے جاتے۔ لیکن سرکاری دستاویز میں نام عارف علی خاں ہی لکھا جاتا۔

انسانی زندگی میں بچپن کی یادیں، حادثات و واقعات کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے، پلنا بڑھنا، گلی محلے کی گلیاں، دوست، جاننے پہچاننے والے لوگ، رشتہ دار سب یاد آتے ہیں۔ بچپن کیسے بیتا، لڑکپن کہاں گزرا، کون کون سی خوشیاں ملیں، کس کس سے تکلیف پہنچی، یہ سب باتیں مرتے دم تک ذہن کے کسی نہاں خانے میں موجود رہتیں ہیں۔

والدہ کے ایک بھائی محمد یونس صدیقی کی سرپرستی میں عارف علی خاں کی پرورش اور تعلیم وتربیت ہوئی۔ وہ شہر کے ایک مالدار بزنس مین تھے، انھوں نے اپنے بچوں سے زیادہ اُن کا خیال رکھا۔ ہر خواہش پوری کی جاتی اور کسی چیز کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا جاتا۔ مگر نہ جانے کیوں عارف علی خاں کو لگتا کہ سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود وہ ہر شئے میں کسی نہ کسی شئے کی کمی محسوس کرتے۔ وہ سوچتے، یہ سب کچھ میرا نہیں ہے، مجھ پر رحم کیا جارہا ہے۔ والدین سے محرومی کی وجہ سے وہ بچپن ہی سے ہر وقت سوچ میں ڈوبے رہتے اور یہی غور وفکر کی عادت اور غم انھیں آج بھی ہے۔ نوجوانی کی عمر ہی سے وہ اپنے دکھ درد اور محسوسات کو ایک ڈائری میں لکھ لیا کرتے جو آگے چل کر اُن کے لکھنے لکھانے کی بنیاد بن گیا۔

ایک جگہ عارف خورشید لکھتے ہیں:

> ''یکم دسمبر ۱۹۵۰ء کو جب میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنی دائیں طرف پٹھانوں کو اور بائیں طرف صدیقیوں کو کھڑا پایا۔ دائیں طرف سے عارف اور بائیں طرف سے خورشید کی آوازوں نے مجھے عارف خورشید بنا دیا۔ گویا عارف اور خورشید الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے میں شامل ہو گئے۔ ایک طرف اعتدال اور دوسری طرف سرکشی میری پہچان بن گئی۔ جنھوں نے مجھے دنیا میں لا کھڑا کیا۔ خود تو ہمیشہ کے لیے سو گئے اور میں جب سے جاگا ہوں آج تک کڑی دھوپ میں کھڑا ہوں۔ سفر جاری ہے اور یہ نہیں جانتا کہ میری منزل کہاں ہے۔''

اسی تحریر کو وہ یوں آگے بڑھاتے ہیں:

> ''مولانا آزاد ہائی اسکول میں بحیثیت مدرس ۷ مارچ ۱۹۷۲ء کو داخل ہوا ......ٹوکن جمع کرنے کے شوق نے مختلف ڈگریاں جیسے ڈی ایڈ، بی کام، بی پی ایڈ اور ایم اے میری جیب میں ڈال دیے۔ ٹوکن جمع کرنے کا جو شعلہ میری ہابی بن گیا ہے یہ شعلہ آج بھی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ زندہ ہے۔''

عارف خورشید آسمان ادب کا ایک درخشاں ستارہ، جو اپنی مخصوص، بے باک طرزِ تحریر کی وجہ

سے جانا جاتا ہے اِسی مولانا آزاد اسکول کی فضا کا پروردہ ہے۔ بات کو آگے بڑھانے سے پہلے علاقے کے اس سب سے بڑے اسکول کی تعلیمی اور ادبی خدمات پر طائرانہ نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اس میں اُن غریب گھرانوں کے بچوں کا بھی ایڈمیشن ہو جاتا تھا جو تعلیم کی اہمیت سے واقف نہ تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے بزرگ اپنے بچوں کو نان میٹرک یا مڈل پاس ہونے کا فخریہ اعلان کرتے تھے۔ اس اسکول کو اس سلسلے میں فوقیت حاصل ہے کہ یہاں کے بیشتر طلباء اور اساتذہ نے ادبی دنیا میں اپنی پہچان بنائی۔

جن طلباء نے اورنگ آباد کا نام روشن کیا، ان میں معروف افسانہ نگار نورالحسنین اور ڈاکٹر عظیم راہی کے علاوہ شاعروں میں فاروق شمیم، قاضی رئیس، عبدالقدیر خاں سیفی، صدیق احمد وقار، وحید کلیم وغیرہ شامل ہیں۔ سعید زیدی اور وجاہت قریشی انشائیہ نگار کے طور پر مشہور ہیں۔

اساتذہ میں جے پی سعید، محمد شکیل، عارف خورشید، ڈاکٹر سلطان شمیم، بختیار ادیب کے علاوہ احمد اقبال شامل ہیں۔ مولانا آزاد ہائی اسکول کے پہلے صدر مدرس ماہر تعلیم مولوی محمد محی الدین صاحب تھے۔ ان کے بعد یہ بارگراں استاد الاستاذہ جے پی سعید نے اٹھایا۔

جے پی سعید نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی فراموش کردہ ادبی سرگرمیوں کو دوبارہ زندگی دینے کی کوشش کی۔ انھوں نے ایک ادبی انجمن ''مطلع ادب'' قائم کی تھی۔ ''مطلعِ ادب'' کی ادبی اہمیت کا اندازہ اس کے شرکاء کے ناموں سے ہوتا ہے مثلاً حضرت یعقوب عثمانی، اخترالزماں ناصرؔ، قاضی سلیم، ڈاکٹر صفی الدین صدیقی، بشر نواز، رفعت نواز، قمر اقبال، غوث ساجد، منیر الدین سحرؔ، رؤف انجم وغیرہ کے علاوہ ادب دوست بزرگ غازی معین الدین ایڈوکیٹ، غلام جیلانی ہاشمی، قاضی متین الدین وغیرہ کے علاوہ نوجوانوں کی ایک خاصی تعداد بھی ہوتی۔

اِس تفصیل کا مقصد یہ بتانا ہے کہ شہر اورنگ آباد میں ادبی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ ایسے میں مولانا آزاد ہائی اسکول بھی ذہن سازی اور ادبی تربیت کی دوڑ میں پیچھے نہیں تھا۔ آس پاس کے اضلاع اور خود شہر میں یوں تو کئی تعلیمی ادارے ہیں لیکن مولانا آزاد اسکول کو اس لحاظ سے جو بلند مقام ملا اس سے انکار ممکن نہیں۔

میری شروع سے ہی یہ عادت رہی کہ میں نئے طلباء کے ساتھ ساتھ نئے آنے والے

اساتذہ سے بھی کھلے دل ودماغ کے ساتھ ملتا رہا ہوں۔ میرے بعد آنے والوں میں نثار احمد صدیقی، سید محمود، محمد ضیاء الحق، خلیل الحق فاروقی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ چونکہ میں ان سب سے سینئر تھا اس لیے سب میری عزت کرتے تھے۔ عارف علی خاں سے بھی بہت جلد دوستی ہوگئی۔ ہمارے درمیان بے تکلفی تو تھی لیکن ایسی بھی نہیں کہ معاملہ ''تو'' اور ''تیرے'' تک پہنچتا۔ اتنا عرصہ گزر گیا لیکن ہمارے تعلقات فزوں تر ہی ہوئے۔ بہر حال دن گزرنے لگے۔ وہ ایک اچھے آرٹسٹ ہیں۔ ان کی ادبی سرگرمیاں بھی جاری تھیں۔ قمر اقبال کے آگے زانوے ادب تہہ کر کے شاعری شروع کی۔ افسانے اور افسانچے بھی لکھنے لگے۔ تثلیث نگاری بھی کی اور رباعیاں بھی لکھیں۔ ادبی محفلوں اور مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ اِس دوران انھوں نے اردو سے ایم اے بھی کرلیا۔ اخبارات اور رسائل میں وہ عارف خورشید کے نام سے چھپنے بھی لگے۔ خودشناسی اور خوداعتمادی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ آج ادبی دنیا میں اُن کا نام ایک جانا پہچانا نام ہے۔

عارف خورشید ابتدائی عمر سے ہی محنتی، جہد مسلسل کے عادی، حقیقت پسند، اپنی بات اور کام کے دھنی مضبوط قوتِ ارادی والے وہ شخص ہیں جس نے صرف آگے بڑھنا سیکھا ہے۔ مزاج میں ضد کہ کچھ کر کے دکھایا جائے۔ اپنے آپ کو منوانے والے انرجیٹک، سیلف میڈ شخص ہیں۔ وہ بیک وقت کئی منصوبوں پر کام کرتے ہیں اور انھیں پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں۔ ان پر اختر الزماں ناصر کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے:

دے دعوتِ آرام کسی اور کو منزل
میں اپنی تھکن بھی نہ کروں تیرے حوالے

اس زمانے میں جب تنخواہیں بہت کم ہوا کرتی تھیں ملازمت پیشہ حضرات زائد آمدنی کے دیگر ذرائع ڈھونڈتے رہتے تھے۔ عارف خورشید نے بھی ایک دو نہیں کئی ذرائع تلاش کر رکھے تھے۔ ''بیسی'' چلاتے، زمینوں کی خرید وفروخت کرتے، بھینس بھی پالی، حکومت کی ایک اسکیم کے تحت ''مینڈھیاں'' بھی پالیں۔ سڑکو میں بوتلوں کے ڈھکن بنانے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ بھی لگایا۔ محلّہ بڑی لین میں ''ریلائبل'' کرانہ کی دکان بھی کھولی۔ اسمگلنگ کا سامان گھڑیاں، چشمے، انگوٹھیوں کے علاوہ کپڑوں کا بزنس بھی کرتے۔ پینٹ پیس، شرٹ پیس، ساڑیاں، میچنگ ڈریس، بیڈشیٹ اور نہ جانے کیا کیا اُن

کے پاس سے مل جاتا تھا۔ اُن کے اصل خریدار عموماً ہمارے اساتذہ اور معلمات ہوتے۔ خصوصاً عیدین کے موقع پر کپڑے اقساط پر مل جاتے۔ بروقت اقساط کی ادائیگی ہماری اولین ترجیح ہوتی۔ ہم انھیں خوش رکھنے کی شعوری کوشش کرتے۔ ضرورت کی اشیاء کے لیے معلمات ان کے گھر پہنچ جاتیں۔ اس سلسلے میں ان کی اہلیہ اُن کی مددگار تھیں۔ بعد کے زمانے میں وہ مینڈھیوں سے بھی دست بردار ہوگئے اور ڈھکن کا کارخانہ بھی کہیں غائب ہوگیا۔ اِن سب مصروفیات کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک اور محاذ پر بھی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑھے ہیں اور وہ ہے اپنے تینوں لڑکوں کی تعلیم و تربیت کا محاذ۔ اُن کے بڑے لڑکے مصطفیٰ علی خان نے DAMLT کی ڈگری حاصل کی اور آج کل اورنگ آباد کے بھگوان میڈیکل کالج میں پڑھا رہے ہیں۔ دوسرا لڑکا MBBS, MD, MBA ڈاکٹر مجتبیٰ علی خان ہے۔ تیسرا لڑکا مرتضیٰ علی خان نے MBA کیا اور مینگلور میں کروما کمپنی میں بطور منیجر خدمات انجام دے رہا ہے۔ اپنے بچوں کی خاطر وہ باہر نہیں گئے حالانکہ مواقع تھے۔ اس موقع کے لیے اُن کا کہنا ہے: ''گائے اچھی ہو تو اپنے گاؤں میں بکتی ہے۔'' اسی لیے انھوں نے ملازمت کے ساتھ ساتھ آمدنی کے مختلف ذرائع بھی دریافت کیے اور خوب لگن اور جستجو سے ہر وہ کام کیے جس سے ضروریات زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے لڑکوں کی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات پورے کیے جاسکیں۔

آج میں سوچتا ہوں کہ اگر وہ اسی طرح بزنس کے میدان میں ڈٹے رہتے تو آج ایک کامیاب بزنس مین یا نامور صنعت کار ہوتے۔ جس کو ورثے میں پھوٹی کوڑی تک نہیں ملی وہ آج کروڑوں کا مالک ہے اور یہ سب کچھ اُن کی اپنی سخت محنت، جدوجہد اور عمدہ پلاننگ کی بدولت ہی ممکن ہوسکا ہے۔

عارف خورشید ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''زندگی کے نشیب و فراز سے کبھی فرار اختیار نہیں کی اور نہ ہی کبھی سوچا کہ خود کو چھوڑ کر بھاگوں۔ اس دوڑ میں میرے ساتھ فرح بھی شامل ہے...... ناکامی کبھی بھی راستے کی رکاوٹ نہیں بنی ...... سوچتا ہوں کچھ نشاں اپنے قدموں کے میں بھی چھوڑ جاؤں۔''

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کاروبار یا ملازمت کے دوران لکھنے لکھانے کے مواقع کم ہی ملتے

ہیں۔لیکن عارف خورشید جیسا کہ سابقہ سطور میں لکھا جا چکا ہے کئی محاذوں پر کامیابی سے ڈٹے رہے۔ اس کی وجہ اُن کی طبیعت کا ''باغیانہ پن'' اور اپنے آپ کو منوانے کی ضد کے علاوہ غالبؔ کا ایک شعر جو اُن کے حوصلوں کو ممیز کرتا تھا۔ یہ شعر ان کے اپنے سرائے کی مسجد والے چھوٹے سے گھر کے چھوٹے سے کمرے میں خود انھوں نے لکھ کر آویزاں کیا تھا۔ یہ شاید ۱۹۸۴ء کی بات ہے:

اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

ہمارے شہر کے ایک دانشور، اردو، انگریزی اور مراٹھی پر یکساں قدرت رکھنے والے، سابقہ (ڈائریکٹر بی سی یو ڈی مراٹھواڑہ یونیورسٹی) ڈاکٹر ارتکاز افضل نے عارف خورشید کے بارے میں لکھا:

''عارف خورشید من کا پکا اور لگن کا سچا ہے، آپ اس شخص کی چاہے جتنی دل شکنی، ہمت شکنی، شعر شکنی کیجیے اس کی چوڑی پیشانی پر کبھی بل نہیں پڑتے۔ مراٹھی کا ایک لفظ ہے ''پرتی وادی'' یعنی ایسا شخص جو تقدیر سے نہیں گھبراتا بلکہ کسی نہ کسی تدبیر میں لگا رہتا ہے۔ اس کو کبھی یہ مت کہو کہ وہ فلاں کام نہیں کرسکتا۔ بس یہی ہے عارف کی پہچان۔''

انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد نے ایک مرتبہ محمود ہاشمی کے اعزاز میں محفل افسانہ کا اہتمام کیا تھا۔ اس موقع پر سینئر اور جونیئر افسانہ نگاروں کے علاوہ کثیر تعداد میں سامعین بھی شامل تھے۔ عارف خورشید نے افسانہ ''قضائے عمری'' سنایا۔ محمود ہاشمی نے اپنی پوری تقریر میں اس افسانے کی خوب تعریف کی اور عارف خورشید کو مستقبل کا ایک اہم افسانہ نگار قرار دیا۔ اور ان کے زبان و بیان پر گرفت اور پیرائے اظہار کی بھی تعریف کی۔ اس پر شاہ حسین نہری نے کہا تھا: ''یہ آپ کے لیے اعزاز کی بات ہے۔'' گو کہ کچھ گوشوں سے ردعمل میں کہا گیا تھا کہ ''اقوال زریں لکھنے سے افسانہ نہیں ہو جاتا۔'' عارف خورشید کا مذاق بھی اڑایا گیا۔ قمر اقبال نے ''بکری نامہ'' اور ڈاکٹر مجید بیدار نے ''علامہ جگمگ'' کے نام سے ہزلیں بھی لکھیں۔ جملے بھی کسے گئے۔ (بکری نامہ اور ایک ہزل آئندہ صفحات پر دی گئی ہیں) جواباً مخالفین کو یہ سننا پڑا:

''ہم ان میں سے نہیں جو بیل گاڑی کے نیچے چلتے ہوئے یہ سمجھتے ہیں کہ ان

کے چلنے سے ادب کی گاڑی چل رہی ہے۔''

بعد کے زمانے میں لوگ سمجھ گئے کہ اس دیوانے کی سختی میں چاہت اور گالی میں خلوص ہے۔ عارف خورشید کا ایک جملہ ''جس لائن میں کھڑے ہو سب سے آگے رہو، ورنہ الگ ہٹ جاؤ'' مجھے آج بھی یاد ہے۔ چنانچہ وہ اس پر تادم تحریر عامل ہے۔

اسکول کے ایک بے تکلف ساتھی عزیز الدین صدیقی کو عارف خورشید کی چوبیس گھنٹے کی مصروفیت پر حیرت تھی۔ پوچھا:

''یہ تم صبح ۷ بجے سے اسکول آجاتے ہو، اسکول کے اوقات کے بعد رات گیارہ بجے تک بیاگ لے کر بیوپار کرتے ہو، تامل ناڈو کی شطرنجیاں اور چادریں بیچتے ہو، لکھتے کب ہو؟ وقت کیسے ملتا ہے؟''

جواب ملا:

''ملتا تو کچھ نہیں عزیز بھائی اور دیتا بھی کوئی نہیں، سب لینا پڑتا ہے آپ نیک نیتی سے کام کیجیے اللہ دیتا ہے۔''

جب عزم سلامت ہے تو ہے اس کا یقین بھی
منزل میرے قدموں سے بہت دور نہیں ہے

اور ہوا بھی ایسا ہی۔ منزلیں قدم چومتی گئیں اور وہ آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔ آج جب کہ وہ حسن خدمت پر علیحدہ ہو چکے ہیں اُن میں تھکن کے آثار بالکل بھی نہیں پائے جاتے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ عارف خورشید نے نامساعد حالات کا نہ صرف پامردی سے مقابلہ کیا بلکہ ادب اور معاشرے میں اپنا مقام بھی بنایا۔ ورنہ عام طور پر ان کے ماضی کے حالات جس طرح سے گزرے، نوجوان بے سمتی کا شکار ہو کر معاشرے پر بوجھ بن جاتے ہیں اور خود کی زندگی بھی برباد کر لیتے ہیں۔ وہ ایک wel settled اور مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔ عزت، دولت، جائیداد، محبت کرنے والی بیوی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تینوں بیٹے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور مصروفیت یعنی اپنے قائم کردہ پبلی کیشن ''نوائے دکن'' کے تحت وہ اب تک کئی معیاری کتب شائع کر چکے ہیں۔ ان میں کچھ دوستوں کی کتابیں عارف خورشید نے اپنے خرچ سے چھپوائی ہیں۔ قریب و دور کے شعراء و ادبا کا تعاون حاصل کر کے وہ معیاری کتب کی اشاعت

کا ایک سلسلہ شروع کرنا چاہتے ہیں۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر انھوں نے ''نوائے دکن پبلیکیشنز'' کے بینر تلے ''عالمگیر ادب'' کے عنوان سے چند ہم خیال احباب کی سوانح وادبی کارناموں پر مشتمل خصوصی شماروں کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ ان تمام کاوشوں کو دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ کوئی غیر مرئی قوت ہے جو ان سے یہ سارے کام کرواتی ہے۔

''عالمگیر ادب'' کے تحت اب تک دو کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ پہلی کتاب اسلم مرزا کی حیات اور خدمات پر اور دوسری ڈاکٹر سحر سعیدی پر۔ یہ دونوں اورنگ آباد کی جانی پہچانی ادبی شخصیات ہیں۔ اسلم مرزا ادبی حلقوں میں تحقیق وتنقید ترجمہ نگاری وتبصرہ نگاری میں ایک بلند مقام حاصل کر لیا ہے جبکہ سحر سعیدی نے بابائے اردو کے شاگرد خاص پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا جس پر انھیں ڈاکٹریٹ ملی تھی نیز شیخ چاند کے کئی مضامین کو تلاش کر کے ''مضامین شیخ چاند'' کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ عالمگیر ادب کے تحت پروفیسر شاہ حسین نہری، نورالحسنین، ساحر کلیم اور ڈاکٹر عظیم راہی پر بھی خصوصی شمارے عنقریب آنے والے ہیں۔

عارف خورشید کا نام اورنگ آباد دکن کے حوالے سے ادبی دنیا میں جانا جاتا ہے۔ آ کا شوانی سے بھی ان کی نثری وشعری تخلیقات نشر ہوتی رہتی ہیں۔ دور ونزدیک کے ادبی سمیناروں اور مشاعروں میں انھیں مدعو کیا جاتا ہے۔ ان کے پیش رو افسانہ نگاروں میں رفعت نواز، الیاس فرحت، نورالحسنین، محمود شکیل، غوث ساجد، رشید انور، سلطان شمیم خان وغیرہ کے نام آتے ہیں جبکہ جونیئر افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر عظیم راہی، متین قادری، سلیم احمد اور شیخ حسین قابل ذکر ہیں۔

عارف خورشید اور محمد شکیل کی پہلی ملاقات بڑی دلچسپ تھی۔ انھیں پتہ نہ تھا کہ جس محمود شکیل کے بارے میں وہ اکثر پڑھتے رہتے اور سنتے رہے ہیں وہ خود اُن کے ساتھی اساتذہ میں شامل ہیں۔ ایک دن ''ڈرائنگ روم'' میں محمود اللہ خان، محمد محسن، خلیل الحق فاروقی ودیگر اساتذہ موجود تھے۔ بات ہو رہی تھی افسانے پر، دورانِ گفتگو عارف خورشید نے کہا کہ انھیں محمود شکیل کے افسانے، لکھنے کا اسٹائل بہت پسند ہے۔ خلیل فاروقی نے پوچھا ''محمود شکیل سے ملو گے؟'' اور پھر ایک طرف اشارہ کر کے کہا: ''لو ملو، یہ ہیں محمود شکیل'' ان دونوں کی یہ پہلی ملاقات بہت جلد دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ یہاں یہ بات دلچسپی

سے خالی نہ ہوگی کہ محمود شکیل نے اپنا مشہور ناولٹ ''خوابوں کے جلتے شہر'' عارف خورشید کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر لکھا تھا۔ اکثر و بیشتر اِن دونوں میں ادب پر گفتگو ہوتی۔ ایک دوسرے کے افسانے سنے اور سنائے جاتے۔ مشورے ہوتے، بحث و تنقید ہوتی۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

عارف خورشید کیا سوچتے ہیں؟ ان کی ضرورتیں کیا ہیں؟ انھیں اگر کوئی دکھ یا تکلیف ہے تو اس کی دوسروں کو خبر تک نہیں ہو پاتی۔ حتیٰ کہ اس کا اظہار ان کے چہرے اور برتاؤ تک سے نہیں ہونے پاتا۔ اس کے برخلاف، ایسے موقعوں پر وہ ہشاش بشاش نظر آتے ہیں۔ اُن کی شوخی اور بشاشت سے اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا کہ یہ شخص، جو مختلف قسم کی مصروفیات اور ذہنی طور پر فکر مند ہونے کے باوجود دل کھول کر ہنستا بھی ہے اور ہنساتا بھی ہے بظاہر وہ جتنے سنجیدہ نظر آتے ہیں اندر سے اتنے ہی زندہ دل اور ماحول کو خوش گوار بنانے والے انسان بھی ہیں۔ اکثر لوگ انھیں خودسر، منہ پھٹ اور مغرور کہتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو انھیں نیک دل، بامروت اور ہمدرد سمجھتے ہیں۔ ان کی زندہ دلی سے متعلق یہ واقعہ دیکھیے:

ایک مرتبہ محمود شکیل طلباء کے ساتھ گراونڈ پر کھڑے تھے۔ ڈرل کا پیریڈ تھا۔ عارف خورشید اور خلیل الحق فاروقی اسکول کی گیلری سے دیکھ رہے تھے۔ خلیل فاروقی کو شرارت سوجھی، عارف خورشید سے بولے۔ وہ گنجا شکیل کھڑا ہے اگر ہمت ہے تو اس کے گنجے سر پر ایک چپت لگا کر آؤ۔ اس کے بدلے میں مَیں پانچ روپے دوں گا۔ اُس زمانے میں پانچ روپے بڑی رقم تھی خود عارف کی تنخواہ لگ بھگ دوسوا دوسو سے زائد نہ تھی۔ عارف خورشید نے خلیل فاروقی سے کہا بھائی میں تو اِس کام کے دس روپے لوں گا۔ خلیل فاروقی نے کہا ''ٹھیک ہے میں دس روپے دوں گا۔'' عارف خورشید تیزی سے نیچے اُترا اور ہم نے دیکھا انھوں نے واقعی محمود شکیل کے سر پر ایک چپت لگائی اور تیز تیز قدموں سے اوپر آ کر دس روپے وصول کر لیے۔ حسن اتفاق سے یہ نظارہ کھیل میں مصروف طلباء نے نہیں دیکھا۔ پریڈ ختم ہونے کے بعد محمود شکیل، عارف کو تلاش کرنے لگے۔ انھیں پتہ چلا کہ وہ فلاں کمرۂ جماعت میں ہیں۔ ہم سمجھے کہ اب یقیناً تو تو، میں میں ہوگی۔ مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ ایک منٹ بعد محمود شکیل واپس جاتے نظر آئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ چپت لگانے سے پہلے ہی عارف خورشید نے انھیں بتا دیا تھا کہ آپ کے چپت لگانے کے لئے دس روپے مل رہے ہیں۔ اس میں سے آدھے آپ کے۔ اِس ایک واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بچپن کی شرارتیں اور محرومیاں اس طرح اچانک سر اٹھا سکتی ہیں۔

ایک دن صدر مدرس عبدالواحد بن سعید باحشوان کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا وہ عارف خورشید کو ڈانٹ رہے ہیں:

''گویا کہ آپ طالب علم نہیں، بلکہ ایک ذمہ دار مدرس ہیں''گویا کہ'' آپ اسکول سے بھاگنا چھوڑ دیجیے'' ''گویا کہ'' واحد صاحب کا تکیہ کلام تھا۔ عارف خورشید ''جی سر'' کہہ کر باہر نکل آئے۔ اُن کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ معلوم ہوا وہ میٹرک میں اُن کے کلاس ٹیچر رہ چکے تھے۔

زمانۂ طالب علمی میں واحد صاحب نے اُن سے ایک مرتبہ یہ بھی کہا تھا:

''میاں سنجیدگی اختیار کرو، تم بہت ترقی کرو گے۔''

ان کی اس سرزنش نے دعا کا اثر کیا۔ وہیں سے انھوں نے غیر محسوس طور پر ترقی کرنی شروع کی۔ اس ترقی میں اُن صلاحیتوں کا، جو انھیں ودیعت کی گئی تھیں، بڑا ہاتھ ہے۔

وہ ہر کام کو صحیح وقت پر کرنے والے اور وقت کی صحیح قدر و قیمت کرنے والے شخص ہیں۔ جو کام بھی شروع کیا اُسے اُس کے منطقی انجام تک پہنچایا۔ ان تمام کامیابیوں میں اللہ ان کی مدد کرتا ہے۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ جب میں اللہ سے مانگ سکتا ہوں تو کسی اور سے کیوں کچھ مانگوں۔ انھوں نے کسی سے اپنے لیے دعا کرنے کے لیے بھی نہیں کہا۔ دوسروں سے دعا کرنے کے لیے وہ لوگ کہتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اللہ اُن کی نہیں سنتا۔

عارف خورشید کے فن اور شخصیت پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ ناکافی ہے۔ ناقدین کی جانب سے ہونے والی خاموشی پر ہم بھی خاموشی اختیار کریں مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ زیرِ نظر کتاب اس کا جواب تو نہیں لیکن اس خاموشی میں شگاف ڈالنے کی ایک چھوٹی سی کوشش کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔

بہرحال ہم مطمئن ہیں کہ اُن کے قدم مضبوطی سے زمین پر جمے ہوئے ہیں۔ ان کی مستقل مزاجی روزِ اول ہی کی طرح قائم ہے۔ دعا ہے کہ اللہ انھیں اور زیادہ استقلال اور ہمت دے کہ وہ اپنے شہر کا نام روشن کرتے رہیں:

اے ولی تجھ سخن کو وہ پہنچے
جس کو حق نے دیا ہے فکرِ رسا

(ولی اورنگ آبادی)

اِن صفحات کے آخر میں ڈاکٹر مجید بیدار اور قمر اقبال کی طنزیہ نظمیں پیش ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عارف خورشید نے ابتداء ہی سے اہل قلم کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

بکری نامہ

علامہ گمنام اورنگ آبادی (قمر اقبال)

شائع شدہ اورنگ آباد ٹائمنر۔۷/۷/۱۹۸۸ء

افسانچہ کبھی ذہن میں لاتی ہیں بکریاں
یوں مینگنی سے اود جلاتی ہیں بکریاں

حصہ ہے بکریوں کا ادب میں نہ بھولیے
یعنی ادب کو راہ دکھاتی ہیں بکریاں

ہر جھول میں سمیٹ لو دو چار میمنے
افسانچوں کا ''جھول'' مٹاتی ہیں بکریاں

مشہور اک کہانی ہے ذاکر حسین کی
اقبال کی بھی نظم میں آئی ہیں بکریاں

پوچھو نہ کیا کمال ہے بکری کے دودھ میں
ڈھنگر کو بھی ادیب بناتی ہیں بکریاں

بکرے بھی شوہروں کی طرح زن مرید ہیں
بکروں پہ اپنا حکم چلاتی ہیں بکریاں

اپنی غذا ذرا سی انھیں بھی کھلایئے
کھاتے ہیں آپ جو وہی کھاتی ہیں بکریاں

دیتی ہیں گھر میں دودھ سعادت یہ کم نہیں
کھانا ہے جو پڑوس میں کھاتی ہیں بکریاں

گمنامؔ اک خرید لو بکری اُدھار تم
راتوں کو لوریاں بھی سناتی ہیں بکریاں

ہر فن میں ادھورے

علامہ جگمگ اورنگ آبادی (ڈاکٹر مجید بیدار)

مطبوعہ اورنگ آباد ٹائمنر۔۹/۳/۱۹۸۹ء

نہ بکری نہ مرغی چرانے کے دن ہیں
فقط ناولٹ اک چھپانے کے دن ہیں

غزل ہو، نظم ہو، کہ تثلیث کوئی
ہر اک فن میں ٹانگیں اڑانے کے دن ہیں

چھڑکتا ہے وہ جان افسانچوں پر
فقط اس کے خاکے اڑانے کے دن ہیں

چلانے لگا ہے پلاٹوں کا دھندا
پلاٹوں میں اس کو کھپانے کے دن ہیں

مقالہ لکھے گا بڑے شوق سے اب
ہنر بے قلم آزمانے کے دن ہیں

مکاں کو دیا نام مکڑے کا جالا
اسی نام پر سر کھپانے کے دن ہیں

کسی نے یہ اک دن جگمگؔ سے پوچھا
یہی کیا ہزل کو چھپانے کے دن ہیں

سر سلامت تو فن سلامت

اظہر فاضل

عارف خورشید کے بڑے فرزند مصطفیٰ علی خان میرے ساتھی ہیں۔ ان کی زبانی ان کے والد کے افسانچے سن کر ان سے ملنے کا اشتیاق بڑھا۔ ملنے سے قبل میں ان کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہا۔ ان کی کتابیں تلاش کرتا رہا۔ جب کچھ تخلیقات مجھے میسر آ گئیں تو ملنے کا اشتیاق اور بڑھ گیا۔ میں عارف خورشید کے افسانچے پڑھ کر بہت متاثر ہوا۔ الحمدللہ مطالعہ نے مجھے بھی ضبطِ تحریر پر آمادہ کیا۔

ایک سال کی ریاضت کے بعد میں نے ایک سو بیس افسانچے لکھے اور سیدھے عارف خورشید کے گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ وہ مولانا آزاد ہائی اسکول برانچ شاہ بازار میں ہیں۔

میں اور عبدالغفار ذیشان سیدھے اس مسودے کے ساتھ شاہ بازار پہنچے۔ قلب مطمئن تھا مگر گھبراہٹ شور مچا رہی تھی۔ محترم نے ہمیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ مختصر تعارف کے بعد میں نے یہ کہنے کی ہمت کی کہ سر، میں بھی افسانچے لکھتا ہوں۔ عارف خورشید ریوالونگ چیر گھما کر بیٹھ گئے اور نیم دراز ہوتے ہوئے پوچھا: آپ نے کس کس کو پڑھا ہے؟

آپ کو، عظیم راہی اور ساحر کلیم کو......

منٹو کو پڑھا ہے۔ نہیں۔ جوگندر پال کو پڑھا۔ نہیں اچھا پھر بھی افسانچے لکھ لیے۔ خیر۔ بتائیے۔ دس منٹ تک میری افسانچوں کی بیاض وہ دیکھتے رہے پھر کہا ٹھیک ہے، کچھ ترمیم کر کے شائع کروا دیجیے۔ قارئین خود آئینہ دکھا دیں گے۔ لیکن مطالعے پر بہت سختی سے کاربند رہنے کی ہدایت کرتے رہے۔ اتوار کو گھر پر بلا کر باقاعدہ کتاب کا کام شروع کروا دیا۔ میں سوچنے لگا کہ اردو ادب کی اتنی قد آور شخصیت اپنے اندر اتنی سادگی اور مدد کا جذبہ رکھتی ہے۔ انھیں دیکھ کر اور ان سے مل کر لگا کہ بڑا ادیب واقعی بڑا آدمی ہوتا ہے۔ سر نے پورے افسانچون کا باریک بینی سے مطالعہ کیا، نوک پلک درست کی، عظیم راہی سے فلیپ لکھوایا۔ خود فلیپ لکھا ''مجسموں کا درد'' کی DTP کروائی۔ پروف ریڈنگ کی

اور زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے کتاب میرے حوالے کردی۔ اس کے بعد جب دوسری کتاب ''آنسوؤں کی چیخ'' کا سارا کام میں نے کیا تو اندازہ ہوا کہ DTP سے لے کر طباعت کے مرحلے تک کے سفر میں کتنے آنسو بہانے پڑتے ہیں۔ عارف خورشید نئی نسل کی جس طرح حوصلہ افزائی کرتے ہیں، اس کی مثال کم ہی ملتی ہے اور وظیفے کے بعد بھی ان کی اس بھاگ دوڑ نے میرے دماغ کے دریچوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ سر کے خلوص اور اردو ادب سے اس قدر محبت اور بڑی آسانی سے اس فن کو برتنے کی تیکنیک نے مجھے آج تک تین مجموعے شائع کرنے پر مائل کیا اور میں نے بھی عہد کرلیا ہے۔ ''سر، سلامت تو فن سلامت''۔ سر کی شخصیت نے میرے دماغ میں ہمہ اقسام کے رنگوں کی روشنائی پھیلا دی ہے۔ میں نے اس قسم کا تعاون کرنے والا شخص نہیں دیکھا۔ میری سرزمین جالنہ پر انھوں نے اپنے احسن طریقہ سے مجھ جیسے کم علم کو ادیبوں کی صف میں لا کھڑا کیا اور جو مجھ میں اور میرے فن کے درمیان خلا تھا اس کو پُر کردیا۔ تخلص سے لے کر معاشرے میں اپنے خیالات کی رسائی تک وہ مراحل مجھے سکھائے جنھیں میں جانتا نہ تھا۔ اب یہ حال ہے کہ میں اورنگ آباد صرف عارف خورشید کے لیے آتا ہوں۔ سر کی شخصیت میرے نزدیک بہت معنی رکھتی ہے۔ ہر نقطۂ نظر سے ان کے مشفقانہ طریقے نے مجھے زندگی جینے کے انگنت پہلو دے ہیں۔ جو میرے لیے بہترین اثاثہ ثابت ہو رہے ہیں۔ اتنی بڑی شخصیت پر میرے کمزور قلم سے ان کی شخصیت اور فن کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن جو دل میں تھا اسے قرطاس کے حوالے کرنا ضروری تھا کہ آئندہ نسلیں ادبی کاز میں مخلصانہ طرزِ عمل اختیار کریں۔

عارف خورشید کے فن و شخصیت پر مضامین پہلے بھی لکھے جا چکے ہیں سہ ماہی ''توازن'' نے عارف خورشید پر گوشہ بھی شائع کیا ہے۔ لکھا ہے ''حرف و معنی شناس کہانی کار- عارف خورشید'' ادبی حلقہ کا معتبر نام ہونے کی وجہ سے ان کے فن پر لکھتے وقت قلم کو بہت تیز دھار میں لانا پڑتا ہے۔ سر فن کے آئینہ میں ایک پہاڑ کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس کی بلندی سر کرنا یقیناً مشکل ہے۔ ایک آدمی میں کچھ صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ لیکن اتنی صلاحیتیں کہ صلاحیت خود اعتراف کرے کہ اتنی بڑی شخصیت تو میں نہیں ہوں۔ ان کے افسانچوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ (۱) یادوں کا سائباں (۲) آتشیں لمحوں میں (۳) آنکھوں کی زبان (۴) اور کچھ بھی نہیں کہانی میں۔ ناولٹ ''لہولہو آرزو'' پڑھ کر اگر کسی کی آنکھیں نم نہ ہوں تو سمجھ لیجیے کہ زبان و بیان سے واقف نہیں ہے۔

''قافلے والو سچ کہنا'' کے افسانوں کو سلیم شہزاد نے ''سچ کہنے والے افسانے'' لکھا ہے۔ اس کتاب کے گیارہ افسانے عام آدمی کے اردگرد گھومتے ہیں اور بڑی چابکدستی سے ذہن کے پردے پر اجاگر ہوتے ہیں۔ ان کی اس کتاب کو پڑھ کر محسوس ہوا کہ افسانے ہی نہیں خود عارف سر ہی اردو فکشن کے لیے طرۂ امتیاز ہیں۔ افسانہ ''آکاش بیل'' نے تو زندگی کی حقیقت کو مکمل طور پر اجاگر کر دیا ہے۔

عارف خورشید کی کتاب ''رنگِ امتزاج'' ادب کے سترہ افراد پر لکھا ہوا دستاویز ہے۔ ایک عمر گزارنے کا حاصل ہے ان خاکوں میں خاص کر ''مان اس کو ہنر میرا۔۔۔'' جو خان شمیم پر لکھا ہوا ہے۔ بہت ہی عمدہ ہے۔ اس خاکے کو پڑھنے کے بعد ہی خان شمیم سے میری آشنائی ہوئی اور روابط استوار ہوئے۔ خان شمیم سے مل کر اگر ان کی فلم بندی کر کے دیکھنا ہے تو یہ خاکہ پڑھ لینا چاہیے۔ بدنام ہوتے شخص کو صحیح سوچ دے کر جسم بنا دینا یہ عارف خورشید کا کمال ہے۔ خان شمیم سے ہزار ہا ملاقاتوں کے بعد بھی یہ خاکہ میرے ذہن سے راہ فرار اختیار نہیں کر سکا۔ شاہ حسین نہری کو جانتا تھا لیکن پوری باریکیوں کے ساتھ ''آدمی ہو کے بھی ......'' میں پایا۔ خاکہ پڑھنے کے بعد شاہ صاحب کے لیے دل میں عزت اور بڑھ گئی۔ ''اور کچھ بھی نہیں کہانی میں'' پچاسی افسانچے ہیں۔ جس میں ''لاحول''، ''سپرٹ''، ''سزا''، ''نزاکت''، ''شانِ بے نیاز''، ''قوت نامہ''، ''صاف گوئی''، ''مرشد''، ''سخت پردہ''، ''وجود وزن''، ''بیت الخلاء''، ''مجرم ضمیر''، ''بے گناہ''، ''چھوٹا گناہ'' وغیرہ وغیرہ۔ بعض ایسے افسانچے ہیں جسے پھیلا دیا جائے تو وہ بہترین کہانی، افسانہ، ناول بن جائیں گے اور اس کے بعد بھی تشنگی باقی رہ جائے گی۔ ہزاروں صفحات بھرنے کے بعد بھی جو کاٹ اور دھار ان چند سطور میں چھپی ہے وہ پھیلانے پر بھی نہیں آپائے گی۔ افسانوی مجموعہ ''وقت کے چاک پر'' میں افسانہ ''سات چاند'' کا نزول میرے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ میں بھی مدرس ہوں۔ اندھے سفر کا مسافر (افسانوں کا مجموعہ مصنف سلیم احمد) کا موصوف نے کچھ اس طرح آپریشن کیا ہے کہ مریض ہوش میں بھی ہے اور ٹانکے بھی لگائے جا رہے ہیں۔

عارف خورشید کے فن اور شخصیت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن پورے دعوے کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ ابھی بہت کام باقی ہے۔ ''توازن'' کا عارف خورشید نمبر میں مفصل معلومات ملتی ہیں لیکن نورالحسنین کے خاکوں پر مشتمل اپنی خوش بیانیاں میں موصوف کو ''ادب کا رابن ہڈ'' کہا ہے جو مجھے موصوف کے متعلق صحیح جملہ لگا۔ ☆☆☆

سائبانی رنگ

شاہ حسین نہری

عارف علی خاں المعروف بہ عارف خورشید رہائش پذیر تو اورنگ آباد دکن میں ہیں لیکن درحقیقت بین الاقوامی شخصیت ہیں۔ نثری وشعری ادب میں ان کی بلندیِ قد کی ایک دنیا معترف ہے، لیکن وہ درازیِ قد کی کمی کو اپنی وضع داری سے پورا کرتے ہیں، حالانکہ اب تو ندذرا نکل آئی ہے۔ بھرا بھرا بدن ہے، اکسٹھ کے سن میں مٹاپا کچھ کچھ چڑھنے لگا ہے۔ جامہ زیبی قائم رکھنے کے لیے خوش لباس بھی بنے رہتے ہیں۔ وضع وضع کے کپڑے بنانے اور پہننے کا شوق ہے۔ اس شوق کی تکمیل کا سامان بھی اللہ پاک کے فضل سے انھیں میسر ہے۔ سر کے گھنے بالوں کو، جب وہ کالے تھے، روزانہ صبح غسل کے بعد دبا کر رکھتے تھے، سر کو کفن کی طرح سفید کپڑے سے باندھ کر۔ اب سفیدی کا غلبہ ہے، چاندی سی چمک ہے تو بالوں کو چھوٹ دے رکھی ہے۔ ایک لٹ پیشانی پر جھولنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔ بال ہیں اور خوب ہیں اس لیے پوششِ سر کی فی الحال ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ آئندہ بھی غالباً یہ ناگزیر نہ ہو۔ کبھی کبھی دھوپ ستاتی ہے تو وزیر آغا کی سی سائبانی ٹوپی اوڑھ لیتے ہیں۔ سرپوش اس وقت ہوتے ہیں جب مصلے پر یا مسجد میں ہوتے ہیں یا پھر جب جب قبرستان جانا پڑتا ہے۔ بھانت بھانت کی ٹوپیاں مختلف مکاتب فکر ومشارب کی ترجیحات والی جمع کر رکھی ہیں۔ موقع محل کے لحاظ سے اور کبھی چھیڑ خانی کو جی چاہے تو بدل بدل کر پہنتے رہتے ہیں یہ ٹوپیاں۔ پاپوش کا معاملہ بھی یہی ہے کہ ہمہ اقسام کے موجود ہیں جوتے اور چپلیں۔ اعتماد بھرے انداز میں، مگر غیر محسوس طور پر کچھ جھولتے ہوئے سے، قدم جما جما کر راستی کے ساتھ ان کا چلنا، آگے بڑھنا شانِ وقار رکھتا ہے۔

کہانی ہے کہ علی بابا کو قسمت سے خفیہ خزانہ ہاتھ لگا تھا۔ چالیس چوروں کو اس نے پکڑا تھا۔ واقعہ ہے کہ ہمارے عارف علی بابا نے ڈائمنڈ نگینوں کی چالیس انگوٹھیاں اپنی انگلیوں سے گویا پکڑ رکھی ہیں کہ جس انگوٹھی کے پہننے کو جی چاہا، پکڑ کر انگلی میں پھنسا لیتے ہیں۔ بیش قیمت عینکوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی نمبر والی اور دھوپ کی بھی، مگر اب نظر کے بار بار بدلتے جانے کی وجہ سے ان کی تعداد کم

ہوگئی ہے۔ گھڑیاں بھی ہیں متعدد۔ اللہ کے فضل کو تلاش وحاصل کرتے اور شان سے خرچ کرتے ہیں حالانکہ کفایت شعاری کو چھوڑا نہیں ہے۔ خدا ہی جانے کہ یہ توازن کیسے نبھاتے ہیں۔

ددھیالی پٹھان ننھیالی صدیقی، سختی ونرمی کا مرکب عارف خورشید حوصلہ آزما خود ساز شخص ہیں۔ خداترسی کے ساتھ تائیدِ ربانی پر بھروسہ ان کی جدوجہد بھری زندگی کے ہر ہر پل سے جھانکتا ہے۔ اچھے آدمی ہیں۔ معلم تھے اس لیے انسان پَن میں ترقی ہوتی رہی ہوگی۔ انسانوں کے درد سے آگاہی ملی ہے، اس لیے اپنے ڈھنگ سے ہر ممکن طریقے پر حکمت کے ساتھ، چپ چاپ بھی اور حسب موقع علی الاعلان بھی ہمدردی وغمخواری کرتے رہنا ان کا وتیرہ ہے۔ حساب کتاب چوکھا رکھتے ہیں۔ یاد رکھتے ہیں اور یاد دلاتے بھی ہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ ان کی درون خانہ زندگی تسکین کا ہر جذباتی ونفسیاتی اور خارجی ومادی سامان رکھتی ہے۔ اللہ کرے ازدواجی زندگی کا یہ سکھ ہمیشہ قائم رہے۔ اللہ نے تین بیٹے دیے ہیں جو ماشاءاللہ نیک مزاج، خوش مذاق، سعادت منداور بحیثیتِ مجموعی اسلامی شعائر کی پابندی کا میلان رکھتے ہیں، بڑے فرزند تو بطور خاص۔ بیٹی کی خواہش تو ہوتی ہوگی لیکن آج کل کے حالات کو دیکھ کر غالباً دل ہی دل میں خوش بھی ہوتے اور خالق ومالک کا شکرادا کرتے ہوں گے کہ اس نے بیٹی نہیں دی۔

عارف خورشید کی ہمدردی وغمخواری خود اپنے آپ سے بھی جاری ہے۔ اس کی ایک شکل یہ ہے کہ اپنی قوتِ ارادی کو آزماتے رہتے ہیں۔ ایک دن اچانک شراب چھوڑ دی، حالانکہ ڈاڑھی جیسی چاہیے ابھی تک نہیں چھوڑی ہے۔ ڈاڑھی بڑھا لیں گے تو تقریباً مدوّر چہرے والے شیر ببر کی طرح مسکین مگر اسی کی طرح بارعب نظر آئیں گے۔ لت میں لت پت لوگوں کی خستہ حالی، بیچارگی اور بے غیرتی دیکھی تو سگریٹ پینے سے توبہ کرلی۔ حقہ پارلر عام ہوئے تو انھوں نے اپنا حقہ بند کیا۔ گٹکے کی قاتل اداؤں کا احساس ہوا تو اسے جھٹک دیا۔ پان کے بِیڑے چھوڑنے کا بِیڑا ابھی نہیں اٹھایا، اس لیے ان کی بتیسی اب بھی کبھی کبھی پان چبانے کا مزا چکھ لیتی ہے۔

فن کاریِ عارف خورشید یوں تو فرد اور معاشرے کی اصلاح کا رجحان رکھتی ہے لیکن اصلاح کی شدید خواہش کے علی الرغم ان کے لہجے سے ناراض بیزاری صاف جھلکتی ہے، خصوصاً عورتوں سے۔ ہوتا یہ ہے کہ اس طرح منفی پہلو کچھ زیادہ اجاگر ہوجاتے ہیں۔ ہمہ اصناف فن کار ہیں۔ شاعری، خاکہ،

ناولٹ، افسانہ، افسانچہ، تنقید و تبصرہ، سب کچھ موجود ہے ان کی زنبیل میں۔ فن کا جو نمونہ وسیلۂ اظہار بنتا ہے، اس کو اچھے سے اچھے انداز میں برتنے کی سعیِ بلیغ ان کا خاصہ ہے یعنی متعلقہ صنف کے فنی تقاضوں کی تکمیل کو ترجیحاً اولیت دیتے ہیں۔ چوکنے رہتے ہیں کہ کہیں غلط زبان نہ لکھی جائے۔ کفایت لفظی پر توجہ ہے۔ خیال رکھتے ہیں کہ کہیں کوئی غیر ضروری لفظ نہ آجائے۔ شستہ، شائستہ، موقع محل کو نظر میں رکھتے ہوئے نکھ سکھ سے درست زبان لکھنے کی کوشش ان کی تمام تحریروں کا وصف ہے، لیکن ہیں بہر حال ابنائے آدم ہی میں سے، بے خطا ہونے کا دعویٰ بے خطا ہو ہی نہیں سکتا۔

شاعر ہیں عارف خورشید، المتخلص بہ عارفؔ، تازہ کاری اور شگفتگی کے ساتھ لیکن دائرۂ مضامین بہت پھیلا ہوا اور فلسفیانہ رنگ لیا ہوا نہیں ہے۔ اصناف سخن میں سے ان کے کیسۂ شاعری میں غزل بھی ہے ثلاثی بھی، نظم بھی ہے حمد و نعت بھی۔ افسانہ نگاری میں بھی بالواسطگی کے ساتھ ساتھ تجربہ پسندی کا دامن تھام رکھا ہے۔ افسانے بھی اپنے خاکوں کی طرح تکنیک بدل بدل کر لکھے ہیں۔ فن کاری کے سواد و بیاض سے واقف ہیں، تنقیدی نظر رکھتے ہیں، اس لیے انتقادی تجزیاتی تبصراتی مضامین بھی سپرد قلم کیے ہیں۔ کسی رو رعایت کے بغیر سخت گرفت کے قائل ہیں۔ کوئی ان کی گرفت کرے تو سنتے، سمجھتے اور درست معلوم ہو تو تسلیم بھی کر لیتے ہیں۔ عملی زندگی میں بھی منہ دیکھی بات کے قائل نہیں۔ افسانوں اور افسانچوں میں معاشرے میں پھیلی ہوئی انفرادی و اجتماعی خرابیوں اور کمزوریوں کے ذکر کا غلبہ ہے۔ عارف خورشید افسانچہ نگاری کی خردہ گیری کو چھوڑ کر اصلی افسانہ نگاری ہی پر توجہ کریں اور اس سے آگے بڑھ کر زندگی کی کشمکشوں کے فن کارانہ اظہار سے مملو ناول نگاری کی طرف جلد سے جلد راغب ہوں تو اچھا ہے، کیوں کہ محض افسانچہ نگاری کی بنیاد پر لوگ نہ منٹو کو جانتے ہیں اور نہ جوگندر پال کو۔

رنگ رنگ کے شخصی خاکے ان کے مصورانہ رنگا رنگ اسلوبیاتی و اظہاری تنوع کا ناقابلِ فراموش مظہر ہیں۔ ان شخصی خاکوں سے ان کی قیافہ شناسی، دقیق نظری اور باریک بینی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا اور یہ کہ انسان احسنِ تقویم پر پیدا کیا گیا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کا مفہوم ہے کہ انسان سلیم فطرت پر پیدا ہوتا ہے، یعنی اصلاً یہی انسان کی مکمل شخصیت ہے۔ تقصیر و خطا، لغزش و گناہ جیسے امور اس کی شخصیت کی تکمیل نہیں کرتے بلکہ ان کے ہوتے وہ تکملیت کے مقام پر نہیں ہوتا۔ کیا ضروری ہے کہ قصور و عصیان کا ذکر کیا ہی جائے لازماً، اللہ تعالیٰ کو نہ صرف یہ کہ گناہ پسند نہیں بلکہ ان کا ذکر، ان پر گفتگو

اور بدی پر زبان کھولنا بھی پسند نہیں کیوں کہ چٹخارہ پسند زبانوں اور کمزور و مریض مزاجوں کو شیطان تنزّل کی طرف مزید آگے بہالے جاتا ہے۔ افسانے میں ہو یا خاکے میں یا آگے چل کر ناول میں، اللہ کرے عارف خورشید آئندہ اس امر کا خیال رکھیں۔

نوائے دکن پبلیکیشنز کے تحت عارف خورشید نے اپنی کتابیں تو چھاپی ہی ہیں، دوستوں وغیرہ کی کتابیں بھی طبع کرواتے رہتے ہیں، اور اس طرح کہ کبھی کبھی حساب دوستاں دردل رہ جاتا ہے۔ ان کی محبتِ اردو اور ادب دوستی نے احباب کے ساتھ مل کر ''عالم گیر ادب'' کا ڈول ڈالا۔ اب اس کتابی سلسلے کے مدیر بنے پوری تن دہی اور لگن سے کتابیں نکالنے میں لگ گئے ہیں۔ اجتماعیت کے اپنے فائدے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں۔

''آدمی ہو کے بھی۔۔۔'' کے زیرِ عنوان خاکہ لکھ کر پتہ نہیں کیوں مجھے عارف خورشید نے انسانوں کے زمرے سے خارج کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ میری بے خطائی کا ان کا دعویٰ بر بنائے محبت ہے ورنہ وہ بھی سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ دعویٰ امرِ واقعہ نہیں ہو سکتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے پردہ رکھا ہے تو اس کا احسان ہے، رہنے دیجیے۔ مجھے اپنے ''روحانی پیشوا'' (حالانکہ لفظ ''پیشوا'' کے ساتھ ''مراٹھا پیشوا'' ذہن میں آتے ہیں) کا لقب دے کر محبت و احترام کا عجیب مرکب تیار کیا ہے میرے لیے۔ عید بقر عید پر ''پیٹ میں مُنڈی ڈل کر'' بھی ملتے ہیں۔ کسی نہ کسی کو ''بزرگ'' بنا کر رکھنا شاید ان کی نفسیاتی ضرورت ہے۔

عارف خورشید کا چہرہ دیکھتا ہوں، تصور کرتا ہوں کہ جب یہ بے دانت ہو جائیں گے تو منہ پوپلا ہو جائے گا، اندر کو دَب جائے گا، زوردار دبنگ آواز کمزور اور پلپلی ہو جائے گی تو اس طرح کی بدلی ہوئی آواز اور ان کے پوپلے منہ والے چہرے کو تصور میں لا کر مسکراتا ہوں محبت سے کیوں کہ میرے لیے ان کی واقعی پوپلی صورتِ حال دیکھ لینے کا امکان تو نہیں کے برابر ہے۔

سر کے صفاچٹ ہونے کا بظاہر امکان نہیں، لیکن عارف خورشید اگر ''فارغ البال'' ہونے لگیں تو سائبانی ٹوپی مستقل طور پر سر چڑھنے لگے گی۔ اللہ کرے ان کی شخصیت کی طرح ان کے بال بھی ایسے ہی گھنے رہیں۔ انسانی ہمدردی والا ان کے مزاج کا سائبانی رنگ بھی آخر تک باقی رہے بلکہ گہرا ہوتا رہے۔ ان کی زندگی تمام معاملات میں حلال و حرام کی پابندی کا خیال رکھتے ہوئے گزرے اور قیامت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سائے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب ہو۔ ☆☆☆

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

صدیقؔ احمد وقار

آبِ رواں، تمام رکاوٹوں کے باوجود منزل کی جانب رواں دواں رہتا ہے۔اپنی دھن میں آگے بڑھتے رہنا، اردو ادب کے فروغ میں لگاتار کاوشیں کرتے رہنا، ادب سے وابستہ فن کاروں کو آسمانِ ادب پر کہکشاں کی مانند دمکتے رکھنا اور اپنی اختراعی صلاحیتوں سے دنیائے ادب میں فقید المثال ''عالمگیر ادب'' کتابی سلسلہ شروع کرنا، ایسے محرکات کو اہلِ فہم و دانش اور سخنوروں کے تعاون سے انجام دینے والی شخصیت کا نام ہے، عارف خورشید۔

آفریدگار نے موصوف کو گوناگوں صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ یہ ملنسار بھی ہیں اور بردبار بھی، پُر خلوص بھی ہیں اور پُرکار بھی، نکتہ سنج بھی ہیں اور نکتہ داں بھی، لسانیات کے رموز سے واقف بھی اور نقد و نظر کے حامل بھی۔ بااین ہمہ، عارف خورشید کی شخصیت کو رفیع الشان بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے ان کی خوش لباسی اس آگہی کے تحت برموقع لباس زیب تن کرنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ تن ڈھانکنے کی خوش سلیقگی کے ساتھ ساتھ سر کو ڈھانکنے کے لیے مختلف انداز کی ٹوپیوں کا انتخاب بھی موصوف کا خاصہ ہے۔ اس امر میں کبھی تساہل سے کام نہیں لیتے۔ یہی خوبی ان کی شخصیت کو ایک الگ پہچان دیتی ہے۔ موصوف کی بلند حوصلگی دیکھیے کہ اپنے انتخاب لباس پر کسی گئی پھبتی کو بھی ضبط تحریر میں لاتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ 'جامع مسجد' اورنگ آباد میں ایک تقریب عقد میں عارف خورشید نے شیروانی، چوڑی دار پاجامہ اور معین کیپ پہن کر شرکت کی۔ موصوف کے ایک بے تکلف دوست ڈاکٹر الطاف قریشی نے بعد عقد ان کے مہذب لباس کو بیگانہ وضع تصور کرتے ہوئے ان کے قریب آکر کہا ''نمونہ بن کے آنے کی کیا ضرورت تھی۔'' یہ واقعہ موصوف نے اپنی سترہ تصانیف میں سے ایک ''رنگ امتزاج'' صفحہ ۱۰۸ پر مشار الیہ دوست پر خاکہ نگاری میں قلمبند کیا ہے۔

دوسروں کو مذاق کا نشانہ بنانا بہت آسان ہے لیکن خود کا مذاق اڑا لینا وہ بھی اپنی ہی تحریر میں! یہ بڑے جگر کا کام ہے۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کی عمر تک اکثر لوگوں کے سر کے بال داغِ مفارقت دینے لگتے ہیں اور قدرتی طریقہ پر، پُر نہ ہونے والا خلا چھوڑ جاتے ہیں مگر عارف خورشید کے سر کے بال اپنا ڈیرہ جمائے ہوئے ہیں۔ ہاں، بالوں کی رنگت میں سیاہی کے ساتھ ساتھ نُقرئی رنگت بھی شامل ہوگئی ہے۔ جو موصوف کی شخصیت کو مزید پُر وقار بنادیتی ہے۔

موصوف کی آنکھوں کی چمک سادہ آنکھ سے زیادہ چشمہ لگانے کے بعد بڑھ جاتی ہے۔ کسی بھی ادبی شہ پارے کو بڑی ژرف نگاہی سے دیکھتے ہیں۔ راقم الحروف کے دعوہ کی بنیاد یہ ہے کہ موصوف کو اجیت سنگھ حسرت لدھیانوی کے مجموعے کلام (تنویرِ فن، مرقع) کے دو نسخے دستیاب ہوئے۔ موصوف نے ایک نسخہ مجھے عنایت کیا اور کہا کہ مطالعہ کریں۔ فدوی نے مطالعہ شروع کیا تو جا بجا پنسل سے نشان زد الفاظ نظر آئے جن میں (کمپیوٹر کی) غلطیاں پائی گئی تھیں۔ ہوا یوں کہ موصوف نے عجلت میں زیرِ مطالعہ کتاب مجھے دیدی اور جو کتاب مجھے دینا چاہتے تھے وہ ان کے پاس ہی رہ گئی۔ موصوف کی اس بھول سے مجھے ان کی ژرف نگاہی کا پتہ چلا۔

عارف خورشید ادب سے وابستہ اشخاص سے ربط پیدا کرنے اور دوسروں سے متعارف کرانے میں خاصی دلچسپی دکھاتے ہیں اور اس طرح قلم کاروں کے درمیان ایک کڑی کا کام کرتے ہیں۔ نوائے دکن پبلیکیشنز کے مالک ہیں۔ یہ صرف طباعت کا مرکز ہی نہیں بلکہ ان کے ادبی ذوق اور فروغِ ادب کی علامت بھی ہے۔ اس گلشنِ ادب سے طبع ہونے والی کتابیں فضاء ادب کو معطر کرتی رہتی ہیں۔ ادبی سرگرمیاں تو ان کا اوڑھنا اور بچھونا ہیں بہ الفاظ دیگر ادب ان کے لیے 'عذرا' ہے تو یہ ادب کے لیے 'وامق' ہیں مستقل ذریعہ معاش، معلّمی کے ساتھ ساتھ پارچہ فروشی، صنعت کاری بھی ان کے مشاغل میں شامل تھے۔ صنعت کار بننے کی خواہش میں، صنعت کاروں کے لیے مختص علاقہ، چکل تھانہ، اورنگ آباد میں، کانچ کی شیشیوں پر جرمن دھات کے ڈھکن بنانے کی فیکٹری کے مالک بھی رہے ہیں۔ مذکورہ سرگرمیاں موصوف کو زبان شمع کی طرح ہر لمحہ متحرک رہنے پر اُکساتی رہتی تھیں اور اپنی صلاحیتوں کی ضیاء پاشیوں کے جلوے بکھیرتی رہتی ہیں۔ عارف خورشید نامور افسانہ نگار ہیں، عمدہ افسانچے بھی لکھتے ہیں، غزل ثلاثی کے ساتھ ساتھ خاکہ نگاری اور تبصرہ نگاری میں اپنے قلم کے جوہر دکھاتے ہیں۔

تبصرہ نگاری میں، خُذْ مَا صَفَا وَ دَعْ مَا کَدِرْ کے قائل نہیں ہیں۔ وہ خوبیوں کو سراہتے

تو ہیں لیکن خامیوں اور غلطیوں کو قطعی نہیں بخشتے۔ اپنے بے لاگ قلم سے نشتر کشی کرتے ہوئے ایک صحتمند ادب کو روبرو لانے کی سعی فرماتے ہیں۔ ان میں چھپا ہوا نقاد معائب پر چشم پوشی کو روا نہیں رکھتا۔

خاکہ نگاری میں ان کے قلم کی نیرنگیاں متاثر کیے بغیر نہیں رہتیں۔ شخص مذکور کی ظاہری و باطنی محاسن و معائب کو تحلیل نفسی کے ذریعہ منظر عام پر خوش اسلوبی سے لاتے ہیں۔ خاکہ نگاری میں قوت مشاہدہ کا بڑا دخل ہے اس خصوص میں موصوف کے خاکے، ان میں قوتِ مشاہدہ کے بدرجہ اتم ہونے کا بیّن ثبوت ہیں۔

بعض واقعات کو پیش کرنے میں الفاظ کا جامہ اتار لیتے ہیں نتیجتاً لفظ برہنہ سے لگتے ہیں۔ مکنون نکات کو کھل کر پیش کرنے میں ذرا بھی عار محسوس نہیں کرتے۔ بسا اوقات، خاکہ نگاری میں دریا کو کوزہ میں بند کرنے کا عمل انجام دیتے ہیں اور کم سے کم الفاظ میں پر مغز و پر معنی بات پیش کرنے میں اشہبِ قلم کے جوہر دکھاتے ہیں۔ محترم شاہ حسین نہری (معروف شاعر) پر خاکہ نگاری میں رقم طراز ہیں کہ ''میں پہلی ہی ملاقات میں سمجھ گیا تھا کہ آدمی مذہبی ہونے کے باوجود نیک ہے۔''

عارف خورشید کے یہ کلمات، سماج میں دوہرے معیار کو لے کر جینے والے حضرات کی دوغلی حرکتوں پر نہ صرف نشتر زنی کا کام کرتے ہیں بلکہ اس نکتہ پر سوچ کے دریا کو روانی عطا کرتے ہیں۔

نثر میں نقد و نظر کے ساتھ ساتھ اپنے مافی الضمیر کو مؤثر ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں نیز ان کی تحریر میں نرالا پن ہوتا ہے۔ صیغۂ نظم میں غزل اور ثلاثی پسندیدہ اصناف ہیں۔ موصوف کی کتاب ''سوچ کے جزیرے'' میں سو سے زائد ثلاثیاں ہیں جن مین سے چند اس طرح ہیں۔ (ثلاثی میں صرف تین مصرعوں میں اپنی بات پیش کرنی ہوتی ہے)

لفظ کو وار سے نہ کم سمجھو
میرے ہاتھوں میں ہے قلم دیکھو
اس کو تلوار سے نہ کم سمجھو

فن کی سلامتی و آبیاری کے لیے 'غم' کو ذریعہ مانتے ہوئے کہتے ہیں۔

کیا ہے ابہام کیا علامت ہے
ایسی باتوں سے مجھ کو کیا لینا
دل میں غم ہے تو فن سلامت ہے

عام انسان رنج و غم سے دوری کا خواہاں اور مسرتوں کا طلب گار ہوتا ہے عارف خورشید خوشیوں پر غم کو ترجیح دیتے ہیں اور اللہ سے التجا کرتے ہیں کہ خوشیاں کم دے اور غم کو سلامت رکھ، کہتے ہیں:

چاہے خوشیوں کو کم سلامت رکھ
تجھ سے ہے بس یہی دعا یارب
میرے سینے میں غم سلامت رکھ

خوشیوں پر غم کو فضیلت دینا صوفیوں کا طرزِ عمل ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے عارف خورشید صوفیانہ مزاج کے حامل بھی ہیں۔ صوفیوں کے نزدیک رنج و غم خالقِ کائنات سے قرب حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ''انسان کو آتا ہے مصیبت میں خدا یاد''۔ شاید عارف خورشید نے اس حقیقت کو پالیا ہے کہ شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت کی منزلوں کو طے کرنے کے لیے اللہ کا قرب ضروری ہے اور اس مقصد کے لیے غم ہی وسیلہ بنتا ہے۔ اسی لیے حصولِ غم کی تمنا رکھتے ہیں۔

موصوف کی غزلوں میں سے منتخبہ اشعار اس طرح ہیں۔

میں ارادہ ہوں مجھے توڑ کبھی
اور دشمن سے ہرا دے یارب

حضرت علیؓ سے کسی نے سوال کیا کہ'' آپ نے کیسے جانا کہ اللہ موجود ہے؟''

آپ کا جواب تھا'' اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے میں نے اپنے رب کو پہچانا۔'' مذکورہ شعر میں بھی موصوف کی تڑپ کہ عرفانِ حق ہو جائے مخفی نظر آتی ہے۔ رنج و غم کو سوغات سمجھتے ہوئے جوش ملیح آبادی نے بھی کیا خوب کہا ہے کہ۔

غم دیے، رنج دیے تم کو خدا نے اے جوشؔ
پھر بھی یہ پوچھ رہے ہو کہ خدا ہے کہ نہیں

اپنی ایک غزل میں طنزاً، احتیاطاً اور قصداً جیسے ادق قافیوں کا استعمال کیا ہے۔ لیکن ایک شعر میں اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ۔

قافیہ پیمائی عارفؔ فن نہیں
ہر غزل بس کہہ کہ رسماً ڈال دی

اس شعر میں، غالبؔ کے نظریہ شاعری کا ادعا ہوا ہے۔

غالبؔ فرماتے ہیں ''شاعری قافیہ پیمائی کا نام نہیں، معنی آفرینی کا نام ہے۔''

شرم وحیا، نسوانیت کا زیور ہے۔ اس لفظ 'حیا' کو بڑی چابکدستی سے اپنے شعر میں برت کر ایک لطیف خیال کے ذریعہ شعر کو پر اثر بنادیا ہے۔ کہتے ہیں ۔

درمیاں میں کیا حیا کافی نہیں
کس لیے تم نے یہ چلمن ڈالدی

عشقِ رسولؐ کے اظہار میں تا قیامت سخن آرائی جاری رہے گی، عارف خورشید کے ایک شعر میں عشقِ رسولؐ کا والہانہ انداز دیکھیے ۔

جنھیں تلاشِ دو عالم ہے وہ تلاش کریں
مرے لیے تو خدا کا رسول کافی ہے

غرض، عارف خورشید ہمہ صفت موصوف ہیں۔ ان کے حلقہ احباب میں ارباب قلم ان کے ادبی ذوق کی دلیل ہیں۔ مردم شناس ہیں، قابل قدر اصحاب کی قدردانی کرتے ہیں ان کی شہرت صرف مہاراشٹر تک محدود نہیں ہے بلکہ، کرناٹک، آندھراپردیش میں مختلف جلسوں میں مدعو کیے جاتے ہیں، اردو دنیا کے تقریباً ہر ادیب وشاعر سے ربط میں رہتے ہیں۔ موصوف کے شناساؤں کا دائرہ ساکن پانی مین کنکر پھینکنے کے بعد متواتر بننے والے دائروں کی طرح پھیلتا ہی جارہا ہے یہ ان کے ہردلعزیز ہونے کی دلیل بھی ہے۔ موصوف کی عملی زندگی اس شعر کے مترادف ہے کہ ۔

اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں
ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

☆☆☆

میرے قد کا وہ شخص نہ تھا

وجاہت قریشی

میں اگر نام لیے بغیر کہوں کہ وہ معلم، اخلاق کا پیکر ہمدرد، قلم اور زباں کی طاقت سے اپنا لوہا منوانے والا۔ جدید افسانہ نگار، شاعر، خاکہ نگار اور نہ جانے کیا کیا۔ نگار ڈھیر ساری کتابوں کا خالق، منٹو کا ہم مشرب، قد درمیانہ، چال مستانہ، چہرے کے خط وخال پر کشش، چہرے پر سفید داڑھی جو مذہبی بھی نہیں لگتی، عینک جو چہرے کی جاذبیت میں اضافہ کرنے والی، نکالنے کے بعد بھی یہی تاثر قائم رہتا ہے کون ہے۔ اس سے قبل تو میں اپنا وضاحتی بیان جاری رکھتے ہوئے آگے بڑھوں تو ایسے خواتین و حضرات بھی جن کو ادب چھو کر بھی گزرا ہو درمیان ہی میں بول اٹھیں گے یہ حلیہ وشخصیت تو عارف خورشید کی ہے۔ جی ہاں! بے شک عارف خورشید کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ ایسے بہت کم پٹھان ہوتے ہیں جن سے بہت کم لوگ خفا رہتے ہیں۔ اگر عارف خورشید کسی معاملے میں کسی سے خفا بھی ہو گئے تو یہ سلسلہ دیرپا نہیں رہتا بلکہ ''میں نے یہ سوچ کر صلح کر لی کہ دشمن میرے قد کا نہ تھا'' پر عمل کرتے ہوئے یوں مل جاتے جیسے کبھی خفا نہ تھے۔ عجیب سی ہر دل عزیز شخصیت پائی ہے۔ عزیز واقارب، دوست احباب، پڑوسی سب ان پر مہربان، یہ سب پر مہربان۔ پتہ نہیں یہ تمام اوصاف ان میں کیسے یکجا ہو گئے۔ کہیں! ایسا تو نہیں کہ انھوں نے ان کے حصول کے لیے باضابطہ کوئی ٹریننگ حاصل کی ہو۔ غالباً نہیں۔ ان کے ہمسائے اکثر ان کے ادب کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ اپنے سے زیادہ اردو کتب ورسائل پر خرچ کرتے ہیں۔ کتابیں اور قرض دے کر بھول جاتے ہیں۔ لوگوں کی بکواس بغور سنتے ہیں۔ لکھنا، پڑھنا اور سوچنا اردو میں ہوتا۔ خوب سے خوب تر کے متلاشی ہیں جس کا ثبوت اب تک سولہ کتابیں ہیں مزید تیزی سے اچھال آنے کی توقع ہے۔ عارف خورشید ۱۹۸۵ء میں ''ٹوٹا ہوا آئینہ'' لے کر ادب کے میدان میں آئے، پھر ''سنہری رُت کا فریب'' کھا کر ہمت نہیں ہاری بلکہ ''یادوں کا سائباں'' لیے ''دھول کی شال'' اوڑھے ''آتشیں لمحوں میں'' اپنی ''لہو لہو آرزو'' کو ''لمحوں کی صلیب'' کے حوالے کر کے سوچنے لگے کہ جلد منزل پر پہنچنا تھا مگر ''یہ شام بھی کہاں ہوئی'' جہاں صرف ''آنکھوں کی زبان'' سے کام

لینا ہوتا ہے۔اس طرح کی پابندیوں نے ان کے احساسات کو گویا مجروح کر دیا۔انھیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ ''احساس کا زخمی مجسمہ'' بن کر رہ گئے۔تب ہی ان کے اندر کے فن کار نے انھیں جھنجھوڑا جس کے نتیجہ میں ''تنظیم کثیر رنگی'' اور ''رنگ امتزاج'' کا وجود عمل میں آیا۔پھر انھوں نے اپنے ساتھ والے قافلے پر ایک نظر ڈالی اور انھیں پابند کرتے ہوئے کہا ''قافلے والو سچ کہنا'' میں اتنی کہانیاں لکھ چکا ہوں کہ اب ''اور کچھ بھی نہیں کہانی میں''۔رہی سہی کہانیاں خود ''وقت کے چاک پر'' گھوم کر اپنی ''چیخ کی میعاد'' جلد ہی قائم کرلیں گی۔فی الحال تو جیسے ''سوچ کے جزیرے'' پر بیٹھ کر اپنے قلم کے سپاہیوں کو ''عالم گیرادب نمبر'' کے ذریعے یکجا کرنا ہے، جس پر تمام سپاہیوں نے لبیک کہہ کر اتفاق بھی کیا ہے۔

چنانچہ عارف خورشید کی اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے قرعہ اندازی کی گئی جس میں پہلے سپاہی کے طور پر معروف شاعر، نقاد اور تاریخ داں اسلم مرزا کی پرچی ہاتھ لگی۔لہٰذا آغاز تو اچھا ہے سوچ کر اس کارِ خیر کم کارِ ادب کا آغاز اگست ۲۰۱۱ء سے کر دیا گیا۔یہ سلسلہ کب تک اور کہاں تک جاری رہے گا اس کا فیصلہ تو باذوق قارئین اور وقت ہی کرے گا۔

اردو کتابوں کی اشاعت اور خرید کے علاوہ مہمان نوازی کا جذبہ بھی عارف خورشید میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ان کے بڑے سے دیوان خانے میں مہمانوں کے لیے ایک فریج ہے جس مین اب صرف کھانے پینے کی چیزیں ہوتی ہیں (کبھی پینے کھانے کی بھی ہوا کرتی تھیں) اور ہمہ وقت دستیاب رہتی ہیں۔اب غذائے جسمانی کے علاوہ غذائے روحانی کی تکمیل کے لیے مختلف رسائل واخبارات بھی پاس ہی موجود رہتے ہیں۔

عارف خورشید صاحب کی اہلیہ صاحبہ بھی کافی باذوق اور مطالعے کی شوقین ہونے کے علاوہ امورِ خانہ داری ونظم نسق میں ماہر ہیں۔انھوں نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنے شوہر کے بے تحاشا کتابیں شائع کرنے پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ان کی خاموشی بھی معنی خیز ہے۔وہ اپنے شوہر نامدار کو کسی کام میں مصروف رکھنا چاہتی ہیں چاہے وہ بظاہر نقصان دہ اور غیر اہم ہی کیوں نہ ہو، تاکہ گھر کا نظام بھی بہتر طریقہ سے جاری رہے۔

عارف خورشید صاحب کو کتابوں کے علاوہ مختلف شوق رہے ہیں۔عمدہ پوشاک، کبھی سوٹ ٹائی، بہترین اسپرے اور عطر، قیمتی پتھر اور نگینوں کی انگوٹھیاں، اینٹک چیزیں، سکے جمع کرنا وغیرہ۔سیاروں اور

ستاروں کا بھی انھیں علم ہے۔ کون سا پتھر یا نگینہ کس راس کا ہے فوراً بتادیتے ہیں۔ ایسے ہی نگینوں میں گھری ان کی شخصیت ہیرا ہے، جس کی روشنی سے دیگر ستارے بھی منور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی قسمت کا ستارہ ہمیشہ عروج پر رہا ہے۔ وہ گھر میں ہوں یا باہر انھیں یہ علم بخوبی رہتا ہے کہ کون سا ستارہ گردش میں ہے اور اس پر کس طرح قابو پایا جاسکتا ہے۔ کون سے نگینے کی انگوٹھی کب اور کہاں استعمال کرنا ہے۔ وہ اپنی صلاحیتوں اور تجربوں کو بڑی کامیابی سے استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا ہنر ہے جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

عارف خورشید صاحب بہت زیادہ متقی پرہیزگار نہ بھی ہوں تو خدا نے ان کی زبان اور قلم میں ایسی تاثیر دی ہے کہ ان کی نصیحتیں اور مشورے بڑے کارآمد ہوتے ہیں۔ یہ خود میرا اور دیگر احباب کا نظریہ ہے۔

عمدہ اور صاف لباس پر عطر کی خوشبو ان کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ وہ صبح بستر سے اٹھ کر حنا، سلمیٰ، شمامہ کا استعمال کرتے ہیں جو انھیں رات میں بستر پر بھی معطر رکھتی ہیں۔

عارف خورشید صاحب کی شخصیت جہاں طلبہ کے لیے بہترین استاد، بیوی کی نظر میں مثالی شوہر تو اولاد و بہوؤں کے لیے مشفق باپ نما دوست کی سی ہے۔ ہر ایک سے یہ حسب درجہ انصاف کرتے ہیں اس لیے اندرون و بیرون خانہ ہر دل عزیز ہیں۔ عارف خورشید صاحب کی شخصیت ان کی خوبیوں کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ انھوں نے جس فیلڈ میں بھی چھلانگ لگائی کامیاب رہے، چاہے وہ ادب کا میدان ہو یا صنعت و حرفت کا۔ ادب میں بھی نثر اور شاعری پر طبع آزمائی کی اور کامیاب رہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عارف خورشید صاحب ایک بھرپور ادبی زندگی گزار رہے ہیں۔ جس کا ثبوت ان کی اب تک سولہ کتابیں ہیں۔ جو ادب میں پذیرائی حاصل کرچکی ہیں۔ اتنی ڈھیر ساری کتابیں دیکھ کر انھیں ادب میں کتابوں والا آدمی بھی کہا جاتا ہے۔ وہ تو اچھا ہوا حکومت نے اب تک کتابوں پر بھی صرف دو کی پابندی نہیں لگائی اسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس عمر میں بھی ان کا تخلیقی کام جاری ہے۔ قمر اقبال کا مصرع ”میری کتابوں سے دیمک کو غذا تو ملی“ سے بھی انھوں نے خوف زدہ ہو کر عبرت حاصل نہیں کی۔

عارف خورشید صاحب اکثر الزامات کی زد میں بھی رہے، کبھی ان کی شاعری کو مشکوک کہا گیا کبھی افسانوں پر انگلیاں اٹھائی گئیں کہ فحش و عریاں ہوتے ہیں۔ کبھی ان کی افسانوی زبان کو قاری کے

سر کے اوپر سے گزرنے والی بھی کہا گیا۔ انھوں نے مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا اور ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا۔

عارف خورشید صاحب کی کتابوں سے اہلیانِ ادب کو کس حد تک فائدہ ہوا بھی یا نہیں یہ ایک تحقیقی کام ہے، ہاں مگر ان کے معصوم پوتے پوتیوں کے لیے دادا کی کتابیں کسی معراج سے کم نہیں ہیں۔ جس کا احساس گزشتہ دنوں مجھے ہوا۔ ہوا یوں کہ میں عارف خورشید صاحب سے ملنے ان کے دولت خانے ''بیت العنکبوت'' گیا معلوم ہوا کہ موصوف کہیں باہر گئے ہیں، مجھے چند لمحوں کے لیے انتظار کرنے کو کہا گیا۔ میں دیوان خانہ میں بیٹھا رہا۔ میری نظر عارف خورشید صاحب کی کتابوں پر پڑی، جسے ان کا معصوم پوتا ثروان بڑے سلیقے سے جما رہا تھا۔ میں نے مذاقاً پوچھا ''بیٹا اتنی ساری دادا جان کی کتابیں آپ نے پڑھنے کے لیے نکالی ہیں؟''

تب ثروان نے معصومیت سے کہا ''ارے نہیں انکل، آپ بھی بس......

یہ ہم نے پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ ہم دادا جان کی کتابوں پر چڑھ کر روشن دان سے اپنی گیند نکالنے کے لیے رکھی ہے۔''

کتابوں کا یہ نیا اور انوکھا استعمال دیکھ کر دکھ کے ساتھ مسرت بھی ہوئی کہ موصوف کی ادب میں محنت رائیگاں نہیں گئی ان کی کتابیں کسی کے لیے تو کار آمد ثابت ہو رہی ہیں۔

عارف خورشید صاحب شاعر ادیب ہونے کے علاوہ ایک کامیاب تاجر اور کمرشیل شخصیت کے مالک بھی ہیں۔ مگر انھوں نے ہمیشہ ادب کو تجارت سے دور رکھا۔ سینکڑوں خرچ کر کے کتابیں شائع کرواتے اور ادبی حلقوں میں ''ہدیۂ خلوص'' کے طور پر تقسیم کروا دیتے ہیں۔ سرکاری و دیگر اکادمیوں نے ان کو انعام دینے کے لیے کتابیں بھی منگوائیں مگر انھوں نے وہاں کبھی کتابیں نہیں بھیجیں شاید وہ اکیڈمیوں کو انھیں اعزاز و انعام دینے سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہیں یا ان کی کتابیں انعام کی مستحق نہیں ہو سکتیں۔ انعام یافتہ کتابوں کے میعار کو دیکھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عارف خورشید صاحب کی ذات میں مصلحت اندیشی اور ریاکاری کا شائبہ تک نہیں۔ انھوں نے انعام و اعزاز کے لیے کبھی اپنے مرتبہ اور رتبے کو ذلیل نہیں ہونے دیا، نہ سیاستدانوں کی چوکھٹ پر

سرِ تسلیم خم کیا اور نہ اکیڈمیوں کے اراکین کے آگے۔ اخبارات، رسائل میں کلام چھپانے کے لیے بھاگ دوڑ نہیں کی۔ جب کہ آج سماج میں سستی شہرت و ہتھکنڈے استعمال کر کے لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔

ایک عرصہ قبل موصوف نے ڈھکن بنانے کی فیکٹری بھی شروع کی تھی تا کہ مخالف کے منہ پر لگا سکیں۔ مگر فیکٹری کا شروع ہونے سے قبل ہی ڈبہ گول ہو گیا۔ نہ انھوں نے کہیں ڈھکن لگایا نہ آج تک ادب میں تیزی سے بڑھتی ہوئی ان کی مقبولیت کو کوئی ڈھکن لگانے کی جرأت کر سکا۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ عیاں ہے کہ جن کا دل اُجلا ہوتا ہے ان کا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ جو بھی ان کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے وہ ضرور اُجلا ہو جاتا ہے۔ خدا نظرِ بد سے بچائے اور ان کے قلم کو یوں ہی رواں، دواں اور جواں رکھے۔

میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ ایسے باذوق، باادب، بااخلاق شخصیت سے میری یاد اللہ ہے۔ وہ نہ صرف ہمدرد دوست ہیں بلکہ میں انھیں اپنے سیاہ وسفید کا ذمے دار بھی مانتا ہوں۔ میری دوستی ان کے لیے باعثِ ملال بھی ہو تو مجھے ان کی دوستی پر نہ صرف ناز بلکہ فخر بھی ہے۔

☆☆☆

منظوم خراج تحسین

پہلی بارش سے اگی ہریالی

خان شمیم

تو نے بھیجی ہے مجھے اپنی کتاب
اور کچھ ایسے ورق
ایسے صفحات جو شاید اے دوست
تیری دانست میں ناکارہ تھے
تیرے احساس کے
زخمی اوراق
جلد بندی سے گریزاں جیسے
تیری تخلیق کا مستور لباس
درد ہیں غم ہیں تو سہنے ہوں گے
طنز کے کچھ تو قرینے ہوں گے
کیا ضروری ہے کہ پھر دہراؤ
وہ کہانی
جو مری ذات سے موسوم ہوئی
مرتکب میں تو نہیں تھا عارفؔ
اور بھی دوست مہرباں تیرے
جن کی چاہت کے قرینے ہوں گے
تو نے بھیجی ہے مجھے اپنی کتاب
ہر ورق

جیسے مرے گاؤں کا دلکش منظر
بہتے چشموں کا مچلتا پانی
پہلی بارش سے اگی ہریالی
تیرا اسلوب
مہکتی ہوئی امرائی ہے
میری مٹی کی امانت ہے تو
تو کہ ہے
اپنے قبیلے کا اکیلا غازی
یار زندہ ہے تو صحبت باقی
تو نے بھیجی ہے مجھے اپنی کتاب

☆☆☆

نذرِ عارف خورشید

ڈاکٹر صدر الحسن ندوی مدنی

فلاطوں کی کہانی کب سنی تھی
کہہ نہیں سکتا
مگر مرمر کے سینے پر
عبارت کندہ ہے اب تک
چلو اک ساتھ از بر تم بھی کر لو
ہم بھی پی جائیں
قلم کی طاقت پنہاں کو رشک صد سحر کر دیں
گہن آلودہ اشکوں کو
مہ و انجم کی تابش دیں
قلم شمع فروزاں ہے
قلم علم فراواں ہے
قلم کے دیدۂ تر کی
درخشاں اشک صد پارہ
فراز فکر تک پہنائیاں اس کے قلم زد کی
لب یخ بستہ گویا
اس کے اک پندار برہم سے
وہ اک فیض مسلسل ہے
وہ اک سیل دمادم ہے

دکن کی سرزمیں

اور میرزا اسلم کی جاں کاہی

بہ ہر سو اشہب فکر و نظر کی تاخت و تاراجی

کبھی ''گیلے'' کبھی ''گلدستہ'' ''نغمے'' اور کبھی ''عزلت''

پریشاں ہر طرف ہے اس کے علم و فکر کی نکہت

تمنائے ستائش ہے نہ عادت خودستائی کی

سنا ہے ''عارف خورشید'' بھی ہے ہم نفس اس کا

قلم کی آتشیں زنجیر، خلعت اس کے نغموں کی

وہ چشم فکر و فن کا اور منبع علم و دانش کا

وہ فیض بے کراں ہے

بحر و بر ہے اسکی جولانگہ

کہانی ہو کہ خاکہ ہو، فسانہ ہو کہ ہو تثلیث

لٹاتا ہے گہر وہ طنز کے، جدت کے، افسوں کے

سناتا ہے کہانی رنج کی، اشکوں کی، آہوں کی

وہ اک جہد مسلسل ہے

وہ فکر جادہ پیما ہے

رخِ زیبائے اردو کا ہے غازہ ہر عمل اس کا

مصافِ زندگی میں ہر زباں پیہم دواں ہے وہ

ولی کی سرزمیں پہ ہر طرف ''خورشید'' کی ضو ہے

وہ خلاقِ ادب ہے

ڈھالتا ہے نغمگی سانچے

دکھاتا ہے ادب کو فکر کی نو رستہ

وہ راہیں
کہ جن کے دم سے محفل ہوگئی ہے رشک صد انجم
وہ اک ابر کرم ہے
سینچتا ہے مَرغ زاروں کو
گلوں کو، گلستاں کو، خار و خس کو
گل عذاروں کو
ادب کے پیکر سیمیں کی نکہت اس کے شہ پارے
وفو، جذب و مستی کے امیں ہیں اس کے فن پارے

☆☆☆

رباعیات

(چند تاثرات بر صفاتِ ذاتی عارف خورشید)

طہور منصوری نگاہ

اصناف کا گلزار ہیں عارف خورشید
اک شاعر و فنکار ہیں عارف خورشید
تخلیق و تصانیف کے ہر پہلو سے
ہشیار خبردار ہیں عارف خورشید

اصناف کئی اِن کے تصرف میں ہیں
جو چھوٹ گئی ہیں وہ تالیف میں ہیں
افسانے ہوں خاکے ہوں ثلاثی کہ غزل
افسانچے نظمیں بھی تعارف میں ہیں

جو حق ہے وہی بات کیے جاتے ہیں
ہستی کا ہر اک چاک سیے جاتے ہیں
خورشید میں ہے تاب و تواں کچھ ایسی
ہر بھیڑ میں پہچان لیے جاتے ہیں

سینے میں دھواں ذہن میں آتش بھی ہے
کچھ کر کے دکھا دینے کی خواہش بھی ہے
لفظوں کو عطا کرتے ہیں خود اپنا لباس
اپنی ہی طرح طرزِ نگارش بھی ہے

رباعیات

(چند تاثرات بر صفاتِ ذاتی عارف خورشید)

علقمہ شبلی

☆

تصویر شرافت ہیں کہ عارف خورشید
تنویر صحافت ہیں کہ عارف خورشید
ہر ہونٹ پہ کھلتے ہیں تبسم کے پھول
تعبیر ظرافت ہیں کہ عارف خورشید

☆

ہونٹوں پہ ہے فریاد نہ لب پر شکوہ
ہر حال میں ہے شکرِ خدائے اعلیٰ
اجداد کا کردار چراغ رہ ہے
ہے گردِ قدم سرمۂ چشمِ بینا

☆

ہیں چرخِ صحافت پہ درخشاں خورشید
ہیں بزمِ سخن میں بھی نمایاں خورشید
ہیں شعر و ادب، دانش و فن کی رہ میں
ہر گام پہ شب تاب و فروزاں خورشید

☆

مشرق کی روایات کو رکھا زندہ
مغرب کو بھی لیکن نہ کیا شرمندہ
اسلاف کے قدموں کے نقوشِ روشن
رہتے ہیں نگاہوں میں سدا تابندہ

☆

ٹوٹے نہ دلِ زار کا ساغر ان سے
لیں درس محبت کا، ستم گر ان سے
عارف بھی ہیں، خورشید درخشاں بھی ہیں
عرفان کی راہیں ہوں منور ان سے

☆

راہوں میں سدا پھول کھلاتے یہ رہیں
صحرا کو بھی گل زار بناتے یہ رہیں
ہے آرزو، تطہیر قلم کی خاطر
آئینہ زمانے کو دکھاتے یہ رہیں

☆

تجھ سے یہ دعا ہے مری، ربِّ ارباب
گل زارِ صحافت رہے ان سے شاداب
پژمردہ شگوفے بھی کھِل اٹھیں دل میں
ایوانِ ظرافت رہے ان سے خوش آب

خاکوں پر خاکہ

قمر اجلال

بہت رنگین اور سنگین ہیں خورشید کے خاکے
کہیں تنقید کے ٹانکے کہیں عشوے کہیں غمزے

کہیں الفاظ کی شدت کہیں تعبیر کی ندرت
کہیں انداز ہیں بانکے ، کہیں تحریر کی ندرت

لگے جب سامنے دیکھے تری تحریر کے کشتے
کہا دل نے قمر لکھوائے کیوں خورشید سے جا کے

اٹھائے تو نے خاکوں میں کئی اسرار سے پردے
شمیم و رفعت و محسن کے پردے اور انور کے

ظرافت دیکھ کر تیری قمر اجلال حیراں ہے
شرارت سے تری تحریر و فن کا دل پریشاں ہے

وحید کلیم

فن میں پائی جو تو نے یکتائی
تیری محنت کا ہے ثمر یہ بھی

تیری لکھی ہوئی ہر اک تحریر
آج کے دور کی ہے غمازی

فن کی معراج مبارک تجھ کو
فن میں پائی جو تو نے یکتائی

رنگ باتیں کرے

(انٹرویو)

انٹرویو

● **شراب نوشی آپ نے کن اشخاص کے ساتھ اور کن حالات کے تحت شروع کی تھی؟**

☆ بشر نواز، قمر اقبال اور جاوید ناصر کی صحبت میں شروع کی تھی۔

● **شراب نوشی ترک کرنے میں کس واقعے اور یا کن اشخاص کا حصہ ہے؟ ایسا ہے یا نہیں؟**

☆ گرو بار پیٹھن گیٹ جہاں میرے اور جاوید ناصر کے لیے ایک ٹیبل بک ہوا کرتا تھا۔ ایک دن میں طہارت کے لیے گیا تو دیکھا کہ بازو کھڑا شخص پیشاب کرتے ہوئے رو رہا ہے۔ میں نے رونے کی وجہ دریافت کی۔ اس نے بتایا کہ وہ کلرک ہے، روزانہ آفس سے سیدھے ادھر آجاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے بال بچوں کا حق مار رہا ہے۔ میں نے معصومیت سے کہا، تو مت آیا کرو۔ بہت کوشش کی مگر......... کہہ کر وہ زاروقطار رونے لگا۔ میں اپنے ٹیبل پر پہنچا، پورا گلاس ایک سانس میں پی گیا اور جاوید ناصر سے کہا: کل سے میں شراب نہیں پیوں گا۔ وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوئے۔ شراب آہستہ آہستہ پینی چاہئے۔ اس طرح پینے سے چڑھ جاتی ہے، معلوم ہے نا۔ میرے مسلسل اصرار پر انھوں نے شرط رکھی کہ چالیس دن تک حسب معمول آتے رہئے اور مجھے کمپنی دیتے رہئے گا۔ دوسرے دن جب میں گیا تو بیرے نے میرے سامنے گلاس رکھا، میں نے نہیں کہا تو جاوید ناصر نے کہا: رہنے دو ''صاحب'' تھوڑی دیر کے بعد پئیں گے۔ میں cold drink پیتا رہا۔ وہ سمجھے میں نے آج تو برداشت کرلیا کل دیکھیں گے۔ چالیسویں دن میں نے اعلان کیا کہ کل سے میں نہیں آؤں گا اور پھر میں کبھی نہیں گیا اور آج اپنی بات پر قائم ہوں۔ اس بات کو تقریباً ۳۰ سال کا عرصہ گذر چکا ہے، میں سمجھتا ہوں پروردگار عالم کا مجھ پر خاص کرم ہے ورنہ شراب کا چھوٹنا بہت مشکل ہے۔ میں جتنا اس کا شکر ادا کروں کم ہے۔

● **ایسا کہا جاتا ہے کہ کسی مسلمان کے لیے سگریٹ نوشی چھوڑ دینا شراب نوشی چھوڑ دینے سے زیادہ مشکل ہے کیونکہ شراب کے بارے میں احساس رہتا ہے کہ ''حرام'' ہے جبکہ سگریٹ کے متعلق ایسا خیال نہیں ہوتا۔ آپ کی رائے کیا ہے؟**

☆ کوئی بھی بری عادت چھوڑنا آسان نہیں ہے اور جہاں تک حرام کے احساس کی بات ہے تو یہ رفتہ رفتہ

مر جاتا ہے۔ مگر میں جب بھی پیتا مجھے احساس رہتا تھا کہ یہ حرام ہے اور پی لینے کے بعد جب نشہ تیز ہونے لگتا تو میرا یہ احساس شدید ہو جاتا تھا۔ ایسے ہی حساس لمحے کی ایک ثلاثی سنئے:

"جب نشہ تیز ہونے لگتا ہے
جام ہاتھوں سے چھین کر میرے
وہ تصور میں رونے لگتا ہے"

● کیا سگریٹ نوشی ترک کرنے میں کوئی خاص واقعہ معاون ثابت ہوا؟

☆ میں ٹرین میں سگریٹ پی رہا تھا۔ ایک متمول ادھیڑ عمر شخص بیٹھا مجھے مسلسل دیکھ رہا تھا۔ میں سمجھا شاید وہ مجھے سگریٹ پینے سے روکے گا کہ یہ نقصان دہ ہے۔ مگر جیسے ہی سگریٹ ختم ہونے لگی اور میں آخری کش لے کر پھینکنے والا تھا۔ اس نے کہا: پھینکو مت، مجھے دے دو، مجھے طلب لگی ہے۔ میرے پاس پیسے ہیں مگر نہ جانے اسٹیشن کتنی دیر بعد آئے۔ اس خوش پوش، متمول شخص کی بے غیرتی نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا اور اس وقت میں نے طے کر لیا کہ میں سگریٹ چھوڑ دوں گا۔ پھر اس کے بعد انگلیوں نے سگریٹ پکڑنے کی اجازت نہیں دی حالانکہ دل نے کئی بار چاہا اور یاد دلایا کہ "اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل لیکن کبھی کبھی......"

● آپ خاکہ نگاری کی طرف کیوں مائل یا راغب ہوئے؟

☆ نورالحسنین کی وجہ سے۔ آپ نے میر ہاشم پر خاکہ لکھا اور ان کی کتاب "در دِنارسا" کے رسم اجراء میں پڑھا۔ اس کے بعد جے پی سعید کی کتاب کے رسم اجراء میں ان پر لکھا خاکہ پڑھا۔ اُن کے خاکے پسند کئے گئے۔ کسی نے مجھ سے کہا کہ نورالحسنین کہہ رہے تھے کہ اورنگ آباد میں ان کے علاوہ کوئی خاکہ نہیں لکھ سکتا۔ اس وقت میں کٹ کٹ گیٹ کے مکان میں رہتا تھا اور روز شام نثار پان شاپ پر میں رشید مدنی اور قاضی رئیس جمع ہوتے۔ ہم لوگ چائے پیتے پان کھاتے اور دو تین گھنٹے ایک ساتھ گذارتے تھے۔ میں نے تذکرتاً کہا کہ حسنین ایسا کہہ رہے تھے۔ مولانا رشید مدنی نے کہا: کیوں نہیں لکھ سکتے۔ آپ لکھ سکتے ہیں۔ آپ پہلے مجھ پر لکھئے۔ ایک عالم کا مذاق اڑانا مشکل ہے۔ اگر آپ نے لکھ لیا تو آپ کامیاب خاکہ نگار بن جائیں گے۔ میں نے پہلا خاکہ "رنگ بلالی مولانا" کے عنوان سے لکھا۔ آپ جانتے ہیں اس کے بعد دوستوں پر خاکے لکھنا شروع کئے جو "اورنگ آباد ٹائمز" میں شائع ہوتے

رہے۔ ڈاکٹر یوسف عثمانی کی ہمت افزائی سے ''تنظیم کیثر رنگی'' ترتیب دے سکا۔ جس کو پڑھ کر جاوید ناصر نے کہا تھا: ''اگر چند ہمعصر کی تحریروں کو خاکے تسلیم کیے جائیں تو آپ کی کتاب مراٹھواڑا کی دوسری کتاب ہے۔''

● افسانچہ نگاری کا چکر کب اور کیوں شروع ہوا؟

☆ میں جوگندر پال کی زبان اور اسلوب کا عاشق ہوں۔ میں نے ''کتھا نگر'' پڑھی، اس کے بعد چند افسانچے لکھے۔ جوگندر پال نے میری تعریف کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو ہند کے دفتر میں کہا: ''عارف خورشید تم فوارے اڑاتے ہو بوند بوند ٹپکو یار'' اس کے بعد افسانچوں کی کتنی کتابیں آئیں آپ جانتے ہیں۔ ''اور کیا ہے نیا کہانی میں'' زیر ترتیب ہے۔

● آپ نے کون سی اہم پینٹنگ بنائی ہے اور آپ کو سب سے زیادہ کونسی پسند ہے؟

☆ میں نے جتنی پینٹنگس بنائی میرے نزدیک سبھی اہم ہیں۔ اپنی اور دوستوں کی کتابوں کے ٹائٹل بنائے۔ مجھے ایک پینٹنگ بہت پسند ہے جس میں ایک چھوٹا بچہ بال اچھالتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ اس کے ہاتھ اوپر، پنجے اٹھے ہوئے اور بال ہوا میں ہے۔

● اسلام نے جاندار کی تصویر بنانے کو حرام قرار دیا۔ کیا تجریدی مصوری اس کی زد میں آتی ہے؟

☆ تجریدی مصوری اس کی زد میں نہیں آتی، اس لیے کہ اس کی کوئی واضح شکل ابھر کر سامنے نہیں آتی۔ ناظرین کی سوچ کے اعتبار سے شکلیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ وہ حرام نہیں ہے۔

● کیا ادب (نثری و شعری) سے لطف اندوز ہونے کے لیے تربیت یافتہ ذوق کی ضرورت نہیں؟

☆ تربیت یافتہ ذوق کی ضرورت تو ہے اور خداداد صلاحیتیں بھی فنونِ لطیفہ کو سمجھنے اور سمجھانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ میری سات پشتوں میں کوئی شاعر و ادیب نہیں ہوا۔ کسی کا کسی بھی فن لطیف سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ برسر پیکار پٹھان کسی سے محبت کریں تو جان دیں، دشمنی پر اتر آئیں تو جان لے لیں۔

● اپنے والدین کے بارے میں آپ کے خیالات، تصورات اور احساسات؟

☆ ہے دعا کا بھی عکس ممتا میں

ماں ہے اس کائنات کی عظمت

ہے خدا کا بھی عکس ممتا میں

جو اپنے والدین سے محروم ہو گیا اُس سے آپ پوچھ رہے ہیں (اس کے آگے عارف کچھ نہ کہہ سکے ان پر رقت طاری ہوگئی اور پھر کافی دیر تک سناٹا چھایا رہا۔ موڈ بدلنے کے لیے میں نے اگلا سوال داغا)

● سچ بولنا اچھی بات ہے مگر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ ''منہ پھٹ'' ہیں اور غیر متوازن ہو کر نامناسب باتیں بھی کہہ جاتے ہیں؟

☆ بالکل صحیح فرما رہے ہیں آپ۔ اس کا مجھے بھی احساس ہے اور اکثر بعد میں شرمندہ بھی ہو جاتا ہوں مگر انا اجازت نہیں دیتی کہ معافی مانگوں، یہ جانتے ہوئے کہ انا بد دماغی ہے۔

● کیا بحیثیت استاد اپنے دورِ زندگی سے مطمئن ہیں؟ (شخصی طور پر)

☆ ہاں۔ مجھے دو آفر، ایک بمبئی مرکنٹائل بنک کا عبدالحسین کے ذریعہ اور دوسرا مولانا آزاد ہائی اسکول میں مدرس کا، ایک ساتھ ملے تھے۔ بنک شروع میں ۱۲۵ روپے دے رہا تھا اور اسکول ۷۵ روپے۔ میں نے اسکول کی سروس کو ترجیح دی۔ جب احساس ہوا کہ Bank میں زیادہ مواقع ہیں اور تنخواہیں بھی معقول ہو جاتی ہیں تو میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح بنک میں سروس مل جائے مگر نہیں ملی۔ جب تھک ہار کر تدریس کی طرف متوجہ ہوا تو مجھے پڑھانے میں مزا آنے لگا اور میں مطمئن ہو گیا اور آج تک ہوں۔

● کیا آپ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ بنک میں نوکری کرنے سے بچ گئے؟

☆ ہاں، مجھ پر اللہ کا بڑا اکرم رہا ہے۔

● مسلمانوں میں مختلف جماعتیں کام کر رہی ہیں جو خود کو دینی جماعتیں کہتی ہیں کیا وہ واقعی صحیح معنی میں دینی ہیں؟

☆ نہیں ہیں۔ سب کی اپنی الگ منطق ہے اس کے تحت وہ کام کر رہی ہیں۔ ان کو تو مسلمانوں کی جماعت بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی وجہ سے مسلمانوں میں نظریاتی اختلافات پیدا ہو گئے۔ اجی جناب جماعتیں نہیں یہ سب الگ الگ دکان لگائے بیٹھے ہیں۔ مسلمانوں کو ساری ڈیڑھ اینٹ کی مسجدوں سے نکل کر ایک بڑی مسجد میں آجانا چاہئے اور ایسا ایک نہ ایک دن ہوگا۔ اسلام میں جماعت بندیوں کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ دین اسلام کے نام پر دنیاداری میں لگی ہیں۔

● آپ کا نسبی تعلق پٹھانوں کے کس قبیلے سے ہے؟

☆ قبیلۂ یوسف زئی سے ہے۔

● بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نزاکتِ خیال والی شاعری اردو میں زیادہ تر پٹھانوں نے کی۔ اگر ہاں تو چند نام؟

☆ شاعری ہی نہیں فنونِ لطیفہ میں پٹھانوں کا بڑا حصہ رہا ہے۔ آپ نے شاعروں کے نام پوچھے ہیں تو میں مومن خان مومن ، اورنگ زیب علی خان ، قتیل شفائی ، اسرار احمد خان ، مجروح سلطانپوری ، بشارت نواز خان، بشر نواز، اقبال محمد خان قمر اقبال۔

● آپ کے اجداد میں کون ہند آئے تھے اور اورنگ آباد میں کون تشریف لائے تھے؟

☆ میرے دادا احمد علی خان کے والد ولایت علی خان افغانستان سے شاہ جہاں پور وہاں سے حیدر آباد پھر کنڑ سے اورنگ آباد آئے تھے۔

● آپ کا قد پٹھان ہونے کے لحاظ سے کم معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟

☆ پٹھان جسم کا نہیں دماغ کا ہوتا ہے۔ میرا قد پانچ فٹ چھ انچ ہے اور تیسری بات یہ کہ میری والدہ پٹھان نہیں تھیں، صدیقی تھیں اور ان کا قد زیادہ نہیں تھا۔ والد چھ فٹ کے تھے۔

● کیا آپ کو پشتو زبان آتی ہے؟

☆ نہیں آتی۔

● کیا آپ نے کبھی پشتو زبان سیکھنے کی کوشش کی؟

☆ نہیں کی۔ ضرورت ہی نہیں تھی۔

● کیا آپ کے دادا پشتو زبان بولتے تھے؟

☆ دادا کے والد ولایت علی خان بولتے تھے۔

● آپ کے فرزندان کا ذریعہ تعلیم؟

☆ انگریزی

● کیا آپ کے بیٹوں کو اردو لکھنا پڑھنا آتا ہے، اچھی طرح؟

☆ ایک اردو میڈیم میٹرک پاس سے اچھا آتا ہے۔

● آپ کل کتنے بھائی بہن ہیں؟

☆ میں اکیلا ہوں اور چار بہنیں ہیں۔

● بہنوں کی شادی کی ذمہ داری کس نے نبھائی؟

☆ ظاہر ہے۔ میں نے۔

● آپ کے بچپن اور اسکول کے زمانے کا کوئی خاص واقعہ؟

☆ **بچپن کا واقعہ:** میری عمر چار پانچ سال رہی ہوگی۔ محلے کے بچوں کے ساتھ ٹوٹی چوڑیوں اور مٹی کے کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ ان میں ایک آٹھ نو سال کی لڑکی بھی تھی۔ اس کی انگوٹھی کھوگئی۔ اس نے الزام مجھ پر لگایا۔ میرے لاکھ انکار پر بھی وہ نہیں مانی تو میں نے ایک لکڑی اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری۔ وہ خون میں نہا گئی۔ اس کی والدہ اسے لے کر گھر پہنچیں، امی جان کو خوب برا بھلا کہا۔ انھوں نے مجھے بھی باتیں سنائیں۔ ابا جان آئے تو امی نے سارا ماجرا سنایا اور کہا: آپ نے اسے کہا تھا کہ مار کھا کر نہیں آنا۔ پٹھان کی اولاد ہے مار کر آنا۔ اس کا یہ نتیجہ ہے۔ ابا جان مجھ سے مخاطب ہوئے: عورت پر ہاتھ بزدل اٹھاتے ہیں۔ آئندہ سے کسی لڑکی پر ہاتھ مت اٹھانا۔ ابا جان کی اس نصیحت پر آج تک عمل پیرا ہوں۔ مگر بڑی خواہش ہے کہ فلمی انداز میں ایک طمانچہ کسی کو ماروں جیسے ہیرو، ہیروئن کو مارتا ہے۔ لگتا ہے یہ خواہش بھی پوری نہیں ہوگی۔

پرائمری اسکول کا واقعہ: گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول کھڑکیشور میں جماعت چہارم تک مخلوط تعلیم ہوتی تھی۔ میں چہارم کا طالب علم تھا اور رابعہ باجی (مرحوم پروفیسر فاروق محمد خان کی والدہ) کلاس ٹیچر تھیں۔ ایک دن کاپیاں چیک کرتے ہوئے ان کی نظر آخری صفحہ پر ٹھہر گئی۔ اپنی ہر کاپی کے آخری صفحہ پر میں اِدھر اُدھر سے سنے سنائے اور پڑھے ہوئے اشعار بغیر سوچے سمجھے صرف آہنگ کی بنیاد پر لکھ لیا کرتا تھا۔ سرخ روشنائی سے لکھا یہ شعر:

”خون سے لکھتا ہوں سیاہی نہ سمجھنا
ملنے سے مجبور ہوں جدائی نہ سمجھنا“

پڑھتے ہی وہ جھٹکے سے کھڑی ہوگئیں اور میرے ہاتھوں پر یہ کہہ کر چھڑیاں برسانے لگیں ”ابھی سے عاشقی کرتا ہے، آئندہ سے تیری کسی بھی کاپی پر اشعار لکھے ہوئے دیکھوں گی تو تیرا نام خارج کردوں گی

سمجھا۔'' اور کاپی پھاڑ کر کھڑکی کے باہر پھینک دی۔ اس وقت جو معصوم آنسو بہے تھے وہ عاشقی کے معنی و مفہوم سے ناواقف تھے۔

مڈل اسکول کا واقعہ: میں نیو مڈل اسکول کی ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اگلی بنچ پر میرے ساتھ اختر حسین بمبئی والا اور سید لائق علی بیٹھے تھے۔ ہم تینوں پابندی سے اسکول آتے تھے اور ہمارا شمار ہونہار طلباء میں ہوتا تھا۔ میں تین دن اسکول نہیں گیا۔ چوتھے دن جب گیا تو عبدالقادر صاحب میرے قریب آئے ''تین دن سے کہاں تھے'' کہہ کر ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔ میں ادباً کھڑا ہو گیا۔ اختر سے برداشت نہیں ہوا، وہ غصہ سے اٹھا مگر ادب سے بولا۔ سر ان کی امی کا انتقال ہو گیا اس لیے............ وہ جانتے تھے کہ میرے والد کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔ قادر صاحب نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ٹیبل پر انگلش کی کتاب اوندھی رکھ کر کرسی پر بیٹھ گیے (پانچویں چھٹی اور ساتویں میں ان تینوں برسوں میں) میں نے پہلی مرتبہ دیکھا کہ وہ کرسی پر بیٹھے اور گھنٹہ ختم ہونے کے بعد خاموشی سے چلے گئے۔ والدہ کے انتقال کے بعد میری تعلیمی حالت کمزور ہو گئی تھی، ہفتم کے بعد میں نے چیلی پورہ ہائی اسکول میں داخلہ لیا کہ مڈل اسکول ہفتم تک ہی تھا۔

میٹرک کے result کے دوسرے دن قادر صاحب سے جونا بازار میں ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے میٹرک پاس کرنے کی مبارکباد دی اور کہا: میں نے تمھارا .seat No معلوم کر لیا تھا اور اخبار میں دیکھا۔ توقع تو فرسٹ کلاس کی تھی مگر .... چلو ٹھیک ہے سکنڈ کلاس بھی۔ کالج میں پڑھنا، عاشقی واشقی کے چکر میں مت جانا سمجھے۔ تمھارے والدین نہیں ہے اس لیے سمجھا رہا ہوں کہہ کر گلے لگا لیا۔ میں نے دیکھا ان کی آنکھوں میں صبر وضبط کا سمندر موجزن ہے۔ ان کا ڈر اور احترام ایسا تھا کہ میں رو نہیں سکا۔ کلیجہ کانپ کر رہ گیا۔

● **آپ نے کن اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کی؟**

☆ گورنمنٹ گرلس ہائی اسکول کھڑکیشور، نیو مڈل اسکول بھڑکل، چیلی پورہ ہائی اسکول راجہ بازار، مولانا آزاد کالج روضہ باغ اور مراٹھواڑا یونیورسٹی اورنگ آباد۔

● **آپ نے ڈاڑھی کب رکھی؟ کوئی خاص واقعہ اس کا سبب ہوا؟**

☆ یہ تو یاد نہیں۔ سنت ہے اس لیے رکھی۔

● کیا آپ کی کفایت شعاری نے آپ سے کہا تھا کہ شیو کرنے میں خرچ زیادہ ہوتا ہے؟

☆ نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ بعض وقت تو میں دو مرتبہ شیو کرتا۔ پارٹی وغیرہ میں جانا ہوتا تو رات میں پھر سے شیو کر کے جاتا۔

● آپ کو بیٹی نہیں ہے اس میں آپ کے ارادے اور کوشش کو بھی دخل ہے؟

☆ اللہ کی مرضی کے آگے نہ ارادہ نہ کوشش کچھ نہیں چلتا۔

● آپ ایک ٹیچر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے پھر یہ کروڑوں کی جائیداد کے مالک کیسے بنے؟

☆ پارٹ ٹائم بزنس اور مسلسل محنت وجد وجہد سے۔

● فرحانہ بھابھی سے آپ کا رشتہ کس نے طے کیا؟

☆ اپنی زندگی کا ہر کام اور فیصلہ میں نے خود کیا ہے۔

● فرحانہ بھابھی نے کس ذریعہ تعلیم سے اور کہاں تعلیم حاصل کی ہے؟

☆ اردو میڈیم سے۔ جماعت نہم تک حیدرآباد میں اور میٹرک اورنگ آباد سے۔

● آپ نے انھیں آگے کیوں نہیں پڑھنے دیا؟

☆ میں نوکری نہیں کروانا چاہتا تھا۔ میرے پیش نظر بچوں کی تعلیم وتربیت تھی۔

● کیا آپ اپنی ازدواجی زندگی سے ہر طرح مطمئن ہیں؟

☆ ہاں، ہر طرح

● آپ دونوں میں کبھی جھگڑا بھی ہوتا ہوگا۔ اختلاف رائے یا کسی وجہ سے، تب آپ کیا کرتے ہیں؟

☆ اکثر ہوتا ہے، ہم میاں بیوی کی طرح رہتے ہیں۔ کبھی میری اور کبھی اس کی محبت خاموش ہو جاتی ہے۔

● آپ کے فرزندان میں سے ہر ایک کی کوئی خاص بات؟

جواب (۱) مصطفیٰ: مذہبی اصولوں کے معاملے میں بہت سخت اور دنیا داری سے کسی حد تک بے نیاز

(۲) مجتبیٰ: ہمدرد، اصول پسند، ذہین اور محنتی

(۳) مرتضیٰ: زندہ دل، جملے باز اور بزنس مائنڈیڈ

● آپ شاعر، افسانہ نگار، خاکہ نگار کے علاوہ ایک بہترین افسانچہ نگار بھی ہیں۔ مراٹھواڑا اور ہندوستان

میں افسانچہ کا مستقبل آپ کی نظر میں کیا ہے؟

☆ روشن ہے۔ مگر اندازے غلط بھی ہو جاتے ہیں۔

● آج کل افسانچہ/منی کہانی کے علاوہ دوسرے کی ...... سے افسانچہ تخلیق پا رہا ہے۔ پوپ کہانی آپ کی نظر میں کیا ہے؟

☆ منی کہانی کی بگڑی ہوئی شکل۔ بے ربط جملوں کا مجموعہ۔ دیوانے کی بڑ۔

● شاعری، افسانہ نگاری، خاکہ نگاری کے علاوہ اب آپ پر ایک اور ذمہ داری آگئی ہے ''عالمگیر ادب'' کی ادارت کی ذمہ داری۔ آپ عالمگیر ادب کے مدیر کی حیثیت سے کیا محسوس کرتے ہیں؟

☆ مجھے زبان وادب کو سیکھنے اور سمجھنے کا ایک موقع اور ملا ہے۔ میں خوش ہوں۔

● آپ کی تاجرانہ ذہنیت سے سبھی واقف ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ عالمگیر ادب جیسا وقیع وضخیم رسالہ تاجرانہ ذہنیت سے پاک ہے۔ میرا اشارہ اس میں اشتہارات کے نہ ہونے کی طرف ہے۔

☆ میں شاہ حسین نہری کو ناراض کر کے کچھ نہیں کرنا چاہتا وہ بغیر اشتہار کے پرچے کے حق میں ہیں، اگرچہ کچھ اشتہارات مل رہے تھے میں ہی انجان ہو گیا۔

● آپ کے اندر ایک ناقد بھی موجود ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ابھی تک وہ کھل کر ہمارے سامنے نہیں آیا۔ بتلائیے کہ کب باہر آئے گا؟

☆ میں زبان وادب سے ایماندار رہنا چاہتا ہوں۔ میرے کچھ تبصرے پڑھ کر حسنین نے کہا تھا کہ اور کتنوں کو دشمن بناؤ گے۔ اس لیے میں کھل کر سامنے نہیں آنا چاہتا۔ ناقد کو اندر ہی رہنے دیجئے۔ یہ کام حسنین کر رہے ہیں میرے لیے کافی ہے۔

● آپ کے افسانوں پر عریانیت کا الزام ہے آپ اسے عریانیت مانتے ہیں یا تخلیقی ضرورت۔ ذرا کھل کر بتائیے۔

☆ عریانیت کا الزام اس پر لگایا جا سکتا ہے جس کو پڑھ کر قاری تلذذ محسوس کرے، جس کو پڑھ کر کردار سے ہمدردی ہو جائے، اس کو عریانیت کے زمرے میں کیسے رکھا جا سکتا ہے۔ جہاں تک الزام لگانے کا تعلق ہے کوئی کسی پر بھی کچھ بھی الزام لگا سکتا ہے۔ الزام لگانے پر پابندی ہے؟ میرے بارے میں محمود ہاشمی نے جو لکھا ہے پڑھے تو میں باعزت بری ہو جاؤں گا۔

● عارف صاحب اگرچہ آپ بہت خوبصورت زبان لکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود آپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ کی زبان افسانے کی زبان نہیں ہے۔اس سلسلے میں آپ کیا کہیں گے؟

☆ ''قافلے والو سچ کہنا'' میں ''سچ کہنے والے افسانے'' کے عنوان سے سلیم شہزاد نے لکھا ہے ''عارف خورشید کا تعلق ایک اہم تاریخی اور عصری اردو مرکز اورنگ آباد سے ہے جس کا پھل انھیں اس صورت میں مل رہا ہے کہ اُن کے افسانوں کی زبان بعض مقامات پر غیر ضروری شعریت سے مملو ہونے کے باوجود افسانوی زبان ہوتی ہے۔'' آپ سلیم شہزاد کی بات سے ضرور اتفاق کریں گے۔

● عارف خورشید صاحب آپ پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ آپ عورت کا صرف ایک ہی روپ پیش کرتے ہیں جہاں وہ یا تو محبوبہ ہے یا بیوی جبکہ عورت کے دوسرے روپ بھی ہیں وہ آپ کے افسانوں کا محور کیوں نہیں؟ یہ آپ کا شعوری عمل ہے یا اسے ہم محض اتفاق ہی سمجھ لیں؟

☆ آپ یہ دیکھیے کہ عورت کا جو روپ پیش کیا گیا وہ کیسا ہے اور میں کس حد تک کامیاب ہوں۔ یہ الزام غلط ہے۔ میرے افسانوں میں ماں، بہن، بیٹی، بیوی، محبوبہ اور دوسری عورت بھی موجود ہیں۔ جناب عالی نورالحسنین نے لکھا ہے کہ ''عارف خورشید کے افسانوں میں دوسری عورت پاورفل ہے۔'' پر نہ اتفاق ہے نہ شعوری کوشش یہ فن ہے۔ کیا ایک فنکار کو آپ یہ اجازت نہیں دیں گے کہ وہ اپنی مرضی سے لکھے اور ویسے بھی میں کہ کمرشیل رائٹنگ کا قائل نہیں۔

● جاوید ناصر مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ آپ کے افسانوں میں معاشرے کی چہل پہل اور درون زندگی کی عکاسی نہیں ملتی بلکہ ایک مخصوص انداز کا بیان ہوتا ہے۔ آپ ان کے اس قول سے اتفاق کرتے ہیں؟ اور اگر انکار تو پھر حقیقت کیا ہے؟

☆ میں ان کے کسی قول سے اتفاق نہیں کرتا۔ میں راست اپنی بات کہتا ہوں۔ مجھے جزئیات ماحول سازی وغیرہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جاوید ناصر اور اُن کے زمانے کے لوگ جزئیات کی بیساکھی سے چلنے والوں کو دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے، اس لئے وہ چاہتے تھے کہ اچھا خاصا آدمی بھی بیساکھی سے چلے۔ جب میں نے ''مکبر الصوت'' لکھا تھا اور جاوید ناصر نے کہا تھا کہ یہ افسانہ نہیں ہے، تب حسنین نے ان کے منہ پر کہا تھا کہ ''شاعروں کو افسانہ سمجھ میں نہیں آتا'' اس کا حوالہ میں نے ڈاکٹر حمید سہروردی کے خاکے ''ایک افسانہ طراز'' میں دیا ہے۔

● آپ بہت اچھے افسانچہ نگار ہیں اور ان کے پارکھ بھی، لیکن کیا آپ کو کبھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ آپ نے محض تن آسانی کے لیے ایک اچھے موضوع کو افسانچے میں برت کر ایک اچھے افسانے کا خون کر دیا؟

☆ خیال اپنی صنف ساتھ لاتا ہے۔ میں افسانہ نگار ہوں، افسانے کا قاتل کیسے ہو سکتا ہوں۔

● آپ تنقید و تبصرے بھی کرتے ہیں، لیکن آپ کے بارے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ آپ کسی بھی افسانے کے موضوع، معیار، اسلوب اور تکنیک پر گفتگو کرنے کے بجائے صرف زبان کی غلطیوں پر گرفت کرتے ہیں؟

☆ اظہار کا سب سے اہم اور پہلا ذریعہ زبان ہے، جب اسے زبان ہی نہ آئے تو وہ آگے کیا کرے گا۔ گنتی کے بعد آپ جمع تفریق سکھائیں گے نا، ہر مضمون میں اس کی بنیادی باتیں پہلے دیکھی جاتی ہیں۔ اردو پر اتنا برا وقت کیسے آ گیا کہ زبان کی اہمیت ہی ختم ہو گئی۔ میں صرف زبان پر ہی گفتگو نہیں کرتا، یہ الزام بھی غلط ہے۔ میں موضوع، معیار، اسلوب وغیرہ پر بھی گفتگو کرتا ہوں۔ آپ میرے تبصرے پڑھئے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ میں اولیت زبان کو دیتا ہوں۔

● شاعری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کچھ مضامین اور کچھ لہجے ہیں جو مختلف ناموں سے بار بار ہمارے سامنے آتے ہیں تو کیا آپ پر بھی محسوس کرتے ہیں کہ بہت سارے افسانے ایسے بھی ہیں جو تکنیک اور اسلوب کی معمولی سی تبدیلیوں کے ساتھ بار بار ہمیں پڑھنے کو ملتے ہیں؟

☆ ہاں ہیں اور حوالے دوں تو ایک لمبی فہرست تیار ہو جائے گی۔

● آپ شاعر بھی ہیں اور آج کل رسائل میں آپ کی شاعری کی دھوم بھی ہے پھر بھی بذاتِ خود آپ اپنی شاعری سے کہاں تک مطمئن ہیں؟

☆ میں بنیادی طور سے افسانہ نگار ہوں لیکن یہ بھی ہے کہ میں اپنی ہر تخلیق سے مطمئن ہوں۔

● آج خصوصاً نئی نسل افسانہ نگاری کی طرف زیادہ مائل ہے اور آپ نے اکثر افسانچہ نگاروں کی کتابوں پر یا تو پیش لفظ لکھے ہیں یا فلیپ۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ محض افسانہ نگاری انھیں ادب میں مقام عطا کر دے گی؟

☆ محمد علی جوہرؔ اپنے ایک شعر پر زندہ ہیں۔

"قتلِ حسین اصل میں مرگِ یدیز ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد"

بات میں دم ہو تو ایک مصرع پر بھی شاعر زندہ رہتا ہے۔

● ابتداء میں جس تیزی سے آپ کی کتابیں شائع ہو رہی تھیں اب ان کی رفتار مدھم سی ہو گئی ہے تو کیا آپ کا تخلیقی ذہن تھک گیا ہے یا پھر اب احتیاط برت رہے ہیں؟

☆ ندی جب پہاڑوں سے نکلتی ہے تو بہت شور مچاتے ہوئے نکلتی ہے۔ جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے اس کی رفتار میں کمی آجاتی ہے۔ رفتار تھمتی نہیں قدرے کم ہوتی ہے۔ "سوچ کے جزیرے" اور "وقت کے چاک پر" اس کی مثال ہے اور "اور کیا ہے نیا کہانی میں" اور "چیخ کی میعاد" زیر طبع ہیں۔ تخلیقی ذہن ابھی کہاں تھکا ہے۔

● آپ نے اپنے افسانوں میں فلیش بیک کی تکنیک کا خوب استعمال کیا ہے لیکن وہیں کہیں کہیں خود کلامی کی کیفیت گراں گذرتی ہے جو افسانے کو بوجھل بناتی ہے۔ مثلاً "قافلے والو سچ کہنا" میں راوی کا کردار بہت زیادہ خود کلامی کرتا ہے۔

☆ راوی تو واقعہ بیان کرتا ہے۔ وہ خود کلامی کیسے کرے گا۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں میری سمجھ میں نہیں آیا۔ "قافلے والو سچ کہنا" ایک مرتبہ اور پوری توجہ سے پڑھئے اگر راوی خود کلامی سے ماجرا بیان کر رہا ہے تو افسانے کی تکنیک شروع سے تبدیل ہو جائے گی۔ انشاء اللہ راوی کی خود کلامی سے ایک افسانہ لکھنے کی کوشش کروں گا۔

● آپ نے بہت عمدہ خاکے تحریر کیے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے آپ نے ان خاکوں میں فن اور شخصیت سے زیادہ صاحبِ خاکہ کی ذاتی و نجی زندگی کو محور بنایا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

☆ خاکہ اصل میں صاحبِ خاکہ کی پوری زندگی ہوتا ہے۔ کیا ذاتی اور نجی باتوں کو زندگی سے خارج کر کے دیکھنا چاہیے۔ کسی کی ناک خراب ہے تو کیا مصور اچھی ناک بنائے گا؟ اس طرح وہ تصویر اس کے کیسے کہلائے گی۔ آپ کم قد ہیں آپ کا قد خاکہ میں چھ فٹ لکھ دوں تو......

● آپ نے افسانوں، افسانچوں اور خاکوں کے ساتھ تبصرے بھی کیے ہیں لیکن اکثر آپ نے ان تبصروں میں تخلیق کار کے محاسن کم اور مصائب پر زیادہ نقد و نظر کی ہے۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ اس طرح

آپ نے نئی نسل کے لکھنے والوں کی حوصلہ شکنی کی ہے؟

☆ میں نے اپنے تبصروں میں محاسن اور معائب دونوں کا ذکر کیا ہے اگر معائب زیادہ ہوں تو اپنی طرف سے محاسن میں اضافہ تو نہیں کر سکتا۔ آپ کیا چاہتے ہیں کہ محاسن کی بار بار وضاحت کر کے دونوں کو Balance کروں۔ کمزور پہلوؤں سے صرفِ نظر کرنا مثبت کیسے ہوا؟ جیسے آپ کی رائے ہے اگر ویسے تبصرہ کرتا تو شاید خراب تبصرے ہوتے۔ میں نے بہت اچھے بہت ہی اچھے تبصرے کیے ہیں۔ میں نہ حوصلہ افزائی کا قائل ہوں، ان معنی میں جس معنی میں آپ کہہ رہے ہیں اور نہ حوصلہ شکنی کا۔ جو ہے جیسا ہے ایمانداری سے وہ ویسا ہی بیان کیا ہے۔ آج بہت سے سینئر لکھنے والوں کو زبان نہیں آتی، جملے بنانا نہیں آتے۔ ان کا املا وانشاء درست نہیں۔ افسانہ، مضمون، انشائیہ، روداد وغیرہ کا فرق معلوم نہیں۔ افسانہ تمہید سے شروع کرتے ہیں پھر انشائیہ شروع ہو جاتا ہے۔ کلائمکس کے بعد بھی ان کا افسانہ جاری رہتا ہے۔ قاری کو احمق سمجھ کر وضاحت کرتے چلے جاتے ہیں توجہ دلانے پر کہتے ہیں یہ میرا اسٹائل ہے۔ پتلون کے اوپر کوئی جانگیہ پہن لے اور کہے کہ یہ تو میرا اسٹائیل ہے تو اس کو کس طرح سمجھایا جا سکتا ہے کہ اسٹائیل کیا ہوتا ہے۔ وہ افسانے کے فریم سے واقف نہیں۔ اس وقت کوئی مبصر یا نقاد دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے دکھاتا تو آج ہمیں ان لوگوں کو بھگتنا نہیں پڑتا اور نہ زبان کو نقصان پہنچتا اور نہ اردو بدنام ہوتی۔ آپ کرتے رہیے حوصلہ افزائی اور بھرتے رہیے ڈسٹ بن۔ میں تو اردو کے گلدان میں خوبصورت پھول سجانے کا خواہش مند ہوں۔

● آپ کو ادھر فکشن کی روایت ورثہ میں ملی ہے اور اس روایت کو آپ نے اپنے ہمعصروں کے ساتھ مزید مستحکم کیا۔ اسی روایت کو اس تسلسل کے ساتھ آنے والی نسل میں جاری نہیں رکھ سکے، اس کے لیے آپ خود کو کتنا ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ اگر نہیں تو کیوں۔ جواز پیش کیجیے۔

☆ مجھے فکشن کی روایت ورثہ میں نہیں ملی۔ میرے خاندان میں کوئی افسانہ نگار نہیں تھا۔ میں نسلاً پٹھان ہوں، اگر آپ کی مراد پیش رو افسانہ نگاروں سے ہے تو آپ کو یہ سمجھانے کی ضرورت پڑ رہی ہے کہ فنکار پیدا ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں ہم نے جب لکھنا شروع کیا تو ہمارے ساتھ لکھنے والے پچیس تیس شوقین ساتھ تھے۔ اب وہ کہاں ہیں؟ اس کے باوجود آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں ذمے دار ہوں کہ ہمارے بعد آنے والی نسل میں میں نے افسانہ نگار نہیں تیار کیے تو آپ مجھ سے زیادہ ذمے دار ہیں۔

● مراٹھواڑہ میں اردو ادب کی ترقی و ترویج و اشاعت کے لیے مستقبل قریب میں آپ کے کیا منصوبے ہیں تا کہ دکن کی اس روایت کو نئی نسل میں آگے بڑھانے کا یہ اہم کام اس طرح جاری رہ سکے؟

☆ منصوبہ تو کوئی نہیں ہے۔ ہمیں اردو کی ترویج اور اشاعت کے لیے اردو میڈیم اسکول کے اساتذہ پڑھائیں اس طرف توجہ دینی چاہئے۔ سوسائٹی ان کے تقرر رشوت لے کر نہ کرے۔ ٹیچر کے لیے قابل امیدوار کا انتخاب کیا جائے۔ مختصر یہ کہ اساتذہ کے تقرر میں کسی طرح کا سمجھوتہ نہ کیا جائے۔

● آپ کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا یا افسانہ نگاری سے۔ پہلی تخلیق اگر یاد ہو تو عنایت فرمائیں۔

☆ جماعت ہشتم کا طالب علم تھا جب ایک غزل کہی تھی جس کا ایک شعر مجھے آج بھی یاد ہے:

"بات نئی پر آج نہیں۔ پردہ ہے پر لاج نہیں"

ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔

● آپ کا پہلا افسانہ کس رسالے یا اخبار کے ادبی صفحہ میں کب شائع ہوا؟

☆ "اسپیشل مزار" ۱۹۷۲ء میں مولانا آزاد کالج میگزین میں شائع ہوا تھا۔

● شاعری، افسانہ نگاری، افسانچہ نگاری اور اس کے بعد خاکہ نگاری۔ ان تمام اصناف میں آپ کی پسندیدہ صنف کون سی ہے؟

☆ افسانہ نگاری

● شاعری، افسانہ نگاری میں کیا آپ نے کسی سینئر سے اصلاح لی، مشورۂ سخن کیا ہے اگر کیا ہے تو وہ کون کون تھے؟

☆ قمر اقبال، محمود شکیل اور شاہ حسین نہری

● جدیدیت کے زیر اثر جو افسانے لکھے گئے تھے ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

☆ خراب افسانے زیادہ اور اچھے افسانے کم لکھے گئے۔

● آپ کا پسندیدہ افسانہ نگار کون ہے آپ کی پسند کی وجوہات بتائیے۔

☆ سعادت حسن منٹو: کیونکہ میری سوچ اور فکر سے میل کھاتا ہے۔ جوگندر پال، ان کی تحریروں میں زبان کا مزا آتا ہے۔

● آپ نے بے شمار افسانے لکھے ہیں ان افسانوں میں آپ کو اپنا سب سے زیادہ کون سا افسانہ پسند ہے اور کیوں؟

☆ ''آکاش بیل'' اس لیے کہ اس میں ایک عورت کی مجبوری اور بے بسی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

● آپ پر الزام ہے کہ آپ سعادت حسن منٹو کی نقالی کرتے ہیں اس الزام کو آپ کس طرح رد کریں گے؟

☆ عورتوں کے مسائل پر لکھنا منٹو کی نقالی کہلاتی ہے تو میں اس الزام کو رد نہیں کروں گا۔

● آزادئ نسواں کی تحریک اور اس کے زیر اثر پیدا ہونے والے تانیثی ادب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

☆ نام نہاد آزادئ نسواں کا میں مخالف ہوں۔ قرآن وحدیث نے عورت کو جو آزادی دی ہے وہ ہی صحیح ہے۔ عورت مرد کے کسی اعتبار سے مساوی نہیں ہوسکتی۔ کہیں وہ زیادہ بھی ہے۔ مساوی ہونے کا راگ الاپ کر وہ اپنے آپ کو کم کرتی ہے۔ ماں کے روپ میں وہ کتنی آگے ہے کہ خدا نے اپنی محبت کی مثال اسے بنایا ہے۔

● افسانہ نگاری، شاعری، خاکہ نگاری کے بعد کیا آپ فکشن کی تنقید میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں؟

☆ کوئی خاص نہیں۔ اصرار پر تبصرے لکھ دیتا ہوں۔ تنقید وتحقیق میرا میدان نہیں۔

● آپ نے اردو کے علاوہ دیگر علاقائی زبانوں کا تراجم شدہ فکشن ضرور پڑھا ہوگا تو یہ بتائیے کہ اردو فکشن دیگر علاقائی زبانوں کے مقابلے میں کس درجہ پر کھڑا ہے؟

☆ میں تراجم نہیں پڑھتا۔ میں ادب کو اس کی زبان میں پڑھنے کا قائل ہوں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اردو فکشن دیگر علاقائی زبانوں کے شانہ بہ شانہ کھڑا ہے۔ علاقائی زبانوں کی شاعری کے مقابلے اردو شاعری میں تو غزل کے سبھی عاشق ہیں۔

● کیا آپ اردو فکشن کی موجودہ صورت حال سے مطمئن ہیں؟

☆ نہیں

● آج اردو کی خواتین افسانہ نگاروں میں سے آپ کس کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور کیوں؟

☆ رخشندہ روحی۔ بات کہنے کا اپنا منفرد اسلوب ہے۔

قمر جمالی: کہانی پر گرفت مضبوط ہے۔

نواب صادقہ سحر: افسانے کے فن سے واقف ہے۔

● داستان کے بعد ناول پھر افسانہ، افسانے کے بعد افسانچہ اب یک سطری کہانیاں، اس کے بعد کیا، صرف اشارہ؟

☆ اس کے بعد یک لفظی کہانی۔ اس کے بعد صرف اشارہ۔ اس نوبت کے آنے تک خدا زندہ نہ رکھے۔

● کیا اردو ادب کے قاری کا حلقہ سمٹتا جا رہا ہے۔ اگر آپ کا جواب موافقت میں ہے تو آپ اس صورتِ حال کو کس طرح تبدیل کر سکتے ہیں، آپ کے پاس کون سا مثبت لائحہ عمل ہے؟

☆ ہاں، اردو اسکولوں کی صورتِ حال سدھارنے کی اور اردو میڈیم کے اساتذہ کو پڑھانے ان میں پڑھنے کا شوق پیدا کرنے اور اپنے پیشہ وقوم سے مخلص ہونے کی ضرورت ہے۔

● عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اردو دنیا کی مقبول ترین زبان ہے اس کے باوجود کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں اس کا مستقبل غیر یقینی ہے؟

☆ نہیں ہے۔ اس کا ثبوت اردو کے اخبارات اور رسائل ہیں۔

● آپ ایک ہائی اسکول میں مدرس کے پیشے سے وابستہ رہے، اردو ادب کو بہترین تخلیقات دیں۔ یہ بتائیے آپ نے ایسے کتنے شاگرد پیدا کیے جو آپ کی اس روایت کو آگے بڑھانے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

☆ میں نے اچھے قاری پیدا کیے۔ یہ بھی بڑا کام ہے۔ تخلیق کار پیدا کرنا اللہ کا کام ہے۔ ویسے میرے شاگردوں میں ڈاکٹر، انجینئر، تاجر وغیرہ کے علاوہ صحافی شعیب خسرو ایڈیٹر اورنگ آباد ٹائمز، شکیب خسرو منیجنگ ایڈیٹر اورنگ آباد، ابوبکر رہبر، ڈاکٹر قاضی نوید احمد صدیقی لیکچرر مولانا آزاد کالج اور ایک پڑھا لکھا اسلامی دانشور و مقرر ضیاء الدین صدیقی بھی ہے۔ جاوید قریشی کارپوریٹر، میر ہدایت علی اپوزیشن لیڈر اور کئی شاگردوں کے نام یاد نہیں آ رہے ہیں۔

● آپ نے اپنے مکان کا نام ''بیت العنکبوت'' رکھا۔ اس کی نفسیاتی وجہ کیا ہے؟

☆ انسان کی زندگی میں گھر کی حیثیت ایک مکڑی کے جالے کی سی ہے، یہ بات میرے ذہن میں تھی اس لیے میں نے اپنے مکان کا نام ''بیت العنکبوت'' رکھا۔

● یہ کہا جاتا ہے کہ ناول اور افسانے کے ناقد کو اپنے عہد کے ثقافتی، تہذیبی، تمدنی، مذہبی اور سیاسی تناظر سے جب تک گہری واقفیت نہیں ہوتی وہ فکشن کا اچھا ناقد نہیں ہو سکتا۔ آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں یا نہیں؟

☆ میں صد فیصد اتفاق کرتا ہوں۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ اس کو زبان و ادب سے بھی گہری واقفیت ہونی چاہئے۔

● آج اردو فکشن کے اہم نقاد کون ہیں، کیا آپ ان کی تنقید سے مطمئن ہیں؟

☆ شمس الرحمان فاروقی، فضیل جعفری، نظام الدین صدیقی اور وارث علوی میں ان حضرات کی تنقید سے مطمئن ہوں۔

● افسانچے خوب لکھے جا رہے ہیں خوب چھپ بھی رہے ہیں اس کے باوجود ادب اور خصوص فکشن کے نقاد اور سنجیدہ قاری اسے شوقِ فضول سمجھ رہے ہیں اور اس کو گھانس نہیں ڈال رہے ہیں اس صورت حال کو آپ کیا نام دیں گے؟

☆ ''ابتدائے عشق'' کا نام دوں گا۔

● اپنے ہمعصر فکشن نگاروں میں اپنے علاوہ آپ کس کس کو پسند کرتے ہیں۔ اس پسندیدگی کی کیا وجوہات ہیں؟

☆ میں اپنے سینئر افسانہ نگاروں میں الیاس فرحت، رفعت نواز، رشید انور اور محمود شکیل کی عزت کرتا ہوں، نور الحسنین کو پسند کرتا ہوں، عظیم راہی کو چاہتا ہوں، سلیم احمد سے محبت ہے، وجاہت قریشی سے توقع ہے، محمود شکیل، نور الحسنین اور سلیم احمد اچھے لگتے ہیں۔

● اورنگ آباد میں افسانہ نگاری کی موجودہ صورتِ حال اطمینان بخش ہے یا نہیں، آپ اسے اطمینان بخش بنانے میں کون سا کردار ادا کر رہے ہیں؟

☆ اطمینان بخش تو نہیں ہے لیکن کوشش ہی کی جا سکتی ہے اور میں کر رہا ہوں۔

● کامیاب، دلپذیر اور موثر افسانچہ کس طرح لکھا جا سکتا ہے؟ اپنے تجربے کی روشنی میں بتایئے؟

☆ آمد کے لمحے کو مقید کر لینے کے بعد کرافٹ کی ابتداء ہوتی ہے۔ افسانچہ میں الفاظ کم سے کم کرتے وقت ایک لفظ کے معنی و مفہوم کے تاثر کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اس عمل کے دوران یہ یاد رکھنا

ضروری ہے کہ افسانچے کا قاری ذہین ہے۔

● آپ کو جب کوئی رسالہ دستیاب ہوتا ہے تو آپ سب سے پہلے کیا پڑھتے ہیں۔ شاعری یا افسانہ؟

☆ افسانہ پڑھتا ہوں۔

● سب کو خوش رکھنا یا سب کو ساتھ لے کر چلنا آپ کا وصفِ خاص ہے۔ ایسا کرنے میں آپ کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

☆ بار بار قوتِ برداشت کو آزمانا پڑتا ہے۔

● آپ کسی کے بھی خلاف بلاتکلف لکھ دیتے ہیں۔ اپنے اظہار خیال پر آپ کو قابو نہیں ہے۔ اس کے باوجود لوگ آپ کے مخالف نہیں ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

☆ اس لیے کہ مجھ میں ill feeling نہیں ہے۔ سچ بولنے سے وقتی طور پر سامنے والا ناراض ہو جاتا ہے مگر جب وہ realise کرتا ہے تو قائل ہو جاتا ہے۔ لوگ سچ سننا اور برداشت کرنا چاہتے ہیں۔ سچ کی طاقت ہی لوگوں کو مخالف نہیں ہونے دیتی۔

● شخصی خاکے تحریر کرتے وقت صاحبِ خاکہ کی خوبیوں کے ساتھ اس کی خامیوں کو اجاگر کرنا آپ کیوں ضروری سمجھتے ہیں؟

☆ اس لیے کہ صرف خوبیوں سے شخصیت مکمل نہیں ہوتی یک طرفہ ہو جاتی ہے۔

● آپ روایتی شاعری کے مخالف کیوں ہیں جبکہ آپ کی نثر روایت سے جڑی ہوئی ہے؟

☆ میری نثر روایت سے جڑی ہوئی ہے تو میں روایتی شاعری کا مخالف کیسے ہوا؟ میں تو روایتی موضوعات کا مخالف ہوں کہ ''آخر کب تک میرے مولیٰ''

● آج کی نثر اکھڑی یا اوبڑ کھابڑ ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

☆ آپ بجا فرما رہے ہیں۔ زبان کو غیر اہم سمجھنے کا یہ نتیجہ ہے۔

● آپ خوش پوش ضرور ہیں لیکن کیا جینس اور جرسی (T.shirt) پہننا آپ کی موجودہ عمر کو زیب دیتا ہے؟

☆ پہننے اوڑھنے کا عمر سے کیا تعلق جو لباس آپ پر جچتا ہو آپ پہن سکتے ہیں۔

● آپ میں فنکاروں کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں اور آپ شاعرانہ ذہن بھی رکھتے ہیں جبکہ تجارت کا فن سے کوئی تعلق نہیں ہے؟

☆ پورا بچپن ماموں جان کی جوتے ٹوپی کی دکان پر گذرا اور میں بی۔کام بھی ہوں۔

● آپ نسلاً پٹھان، پیشے سے مدرس، اداؤں سے ایکٹر، حرکت و عمل سے تاجر ہیں، آپ نے بکریاں پالیں، بھینسیں پالیں، فیکٹری (ڈھکن کی) چلائی، زیننات کا دھندہ کیا، آپ خود کو کس طرح اتنے خانوں میں بانٹ لیتے ہیں؟

☆ میں خود بھی بعض وقت سوچتا ہوں کہ میں اتنے ٹکڑوں میں کس طرح بٹ گیا۔ کچھ ادھر لٹ گیا کچھ ادھر لٹ گیا۔ دل کے ٹکڑے ہوئے اور جگر لٹ گیا اور اس بات پر پروردگارِ عالم کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے اتنی صلاحیت اور ہمت دی۔

● آپ نے زندگی میں کسی سے نفرت کی؟

☆ مستقل کسی سے نہیں اور عارضی سب سے۔

● اپنی خوبیوں کا تو سبھی ذکر کرتے ہیں آپ اپنی خامیوں پر روشنی ڈالیے۔

☆ غصہ زیادہ آنا، منہ پھٹ، صاف گوئی کے چکر میں سامنے والے کا دل دکھانا۔

● اردو کے رسم الخط کے بارے میں آپ اپنے خیالات سے نوازیں۔

☆ اگر بدل گیا تو زبان ختم ہو جائے گی۔ ہر زبان اس کے رسم الخط کی وجہ سے زندہ ہے۔

● وؔلی اورنگ آبادی کی مزار کی تحقیق کس حد تک ضروری ہے؟

☆ غیر ضروری ہے۔ وؔلی کی شاعری، اس کے فن پر تحقیق ضروری ہے۔ جس کو کچھ نہیں آتا مگر شہرت و نام و نمود کا بھوکا ہے وہ اس طرح بلیاں ہانکنے کا کام کرتا ہے، یہ ایسے لوگ ہیں جنھیں اپنے باپ دادا کی مزار یاد نہیں۔

● آپ مستند اور کامیاب افسانہ نگار ہیں، آپ نے افسانچے بھی لکھے، کیا آپ اپنے افسانچوں سے مطمئن ہیں؟

☆ ہاں، بڑی حد تک۔ اس لحاظ سے کہ میں سمجھتا ہوں کہ افسانچے کے نام سے جو کچھ میں نے لکھا وہ

واقعی ''افسانچہ'' ہے کچھ اور نہیں۔ افسانچہ ایک نشست میں مکمل ہو جاتا ہے، اگر نہیں ہوا تو پھر کبھی نہیں ہوتا۔ ہاں ایک نشست میں پورا کا پورا کاغذ پر اتار لینے کے بعد پھر کئی نشستوں میں اسے سجانا سنوارنا پڑتا ہے۔

● افسانہ تخلیق کرتے وقت آپ پر جو کیفیت گذرتی ہے اس کا مختصر حال سنائیے۔

☆ میں خود ایک کردار بن جاتا ہوں اور سب کچھ اپنے آپ پر ہوتا ہوا دیکھتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں۔

● نئی نسل کے افسانہ نگاروں کو آپ کیا پیغام دیں گے؟

☆ پڑھو زیادہ لکھو کم۔ سوچ سمجھ کر لکھو۔ قاری کو احمق سمجھ کر مت لکھو اور زبان و بیان کا خاص خیال رکھو۔

● بحیثیت مدرس ملازمت کے دوران کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ہو تو اس کی بابت بتایے۔

☆ ایسے بہت سے واقعات ہیں جنھیں میں یاد رکھنا نہیں چاہتا اور نہ بیان کر کے زخم تازہ کرنا چاہتا ہوں۔

● آپ کا شمار کس دہائی کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے؟

☆ ۱۹۸۰ء کے بعد کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔

● آپ نے اب تک کن کن موضوعات کو اپنے فن کا حصہ بنایا ہے؟

☆ زندگی کا ہر موضوع میرے قلم کی زد میں آیا ہے۔

● آپ کے افسانوں کے محرکات؟

☆ دل میں غم ہے تو فن سلامت ہے۔

● کیا آپ نے اپنے افسانوں میں تکنیکی تجربات کیے ہیں؟ افسانوں کی نشاندہی کیجیے۔

☆ ہاں کیے ہیں۔ میری کتابیں پڑھیے۔ کنارے سے طوفان کا اندازہ نہیں ہوتا۔

● کیا نیا افسانہ پریم چند کے افسانوں کی بازگشت بنتا جارہا ہے؟

☆ بالکل نہیں۔ زمانے کا فرق ہے۔

● آپ کا فن اور زندگی کے بارے میں کیا نقطۂ نظر ہے؟

☆ زندگی فن ہے اور فن زندگی۔

● آپ اپنے افسانوں میں تجرید، علامت، پیکر سازی اور فلسفانہ طرز بیان سے کام لیتے ہیں تو کیا

آپ Intellectuals کے لیے ہی لکھتے ہیں؟

☆ میں Intellectuals کے لیے ہی لکھتا ہوں۔ میں یہ سوچ سمجھ کر لکھتا ہوں کہ میرا قاری پڑھا لکھا اور ذہین ہے۔ جب عام قاری یہ شکایت کرتا ہے کہ افسانہ یا افسانچہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔

● آپ فن پارہ میں زبان واسلوب کو ہمیشہ اہمیت دیتے ہیں یا مواد وموضوع کو؟

☆ زبان واسلوب کو اولیت دیتا ہوں۔

● آپ کے افسانوی فن کے بارے میں نقادوں کی رائے؟

☆ مثبت ہے۔

● آپ نے نثر بھی لکھی، شاعری بھی کی، ناول بھی لکھا، خاکے اور تبصرے بھی لکھے۔ ڈفرنٹ طرح کی رائٹنگ کی، آپ کس کس کے ساتھ انصاف کر سکتے ہیں؟

☆ انصاف یا ناانصافی کی بات نہیں ہے۔ پہلے جو خیال ہونٹ کرتا ہے لکھ لیتا ہوں، اس کے بعد دیکھتا ہوں کہ یہ ثلاثی ہوئی یا افسانچہ۔ اس کا افسانہ ہو سکتا ہے۔ ثلاثی میں بات نہیں بنی اس خیال کو غزل کے شعر میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ کسی دوست یا فنکار کی زندگی کے حالات یاد آنے لگتے ہیں، اس کی شخصیت سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے تب قلم سے خاکہ نکل آتا ہے۔ کسی کی کوئی تخلیق اچھی لگتی ہے یا بہت بری لگتی ہے تو تبصرہ ہو جاتا ہے۔ میں تو نثر کو بھی شاعری کی طرح الہامی مانتا ہوں، یہ بات ایمانداری سے کہہ رہا ہوں۔

● آپ کی تحریروں میں جدیدیت کا رنگ نمایاں ہے اس کی کیا خاص وجہ ہے؟

☆ میرے افسانوں وغیرہ میں اگر آپ کو کوئی خاص رنگ دکھائی دیتا ہے تو یہ مسئلہ آپ کا مسئلہ ہے۔ بھائی ہر فنکار اپنے زمانے سے اس وقت کی تحریکوں سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ آج کا آرٹسٹ لازمی ہے جدید فن مصوری کا اثر قبول کرے گا وہ لیونارڈو ڈاونسی کی نقل تو نہیں کرے گا۔ اگر وہ فنکار ہے تو اس کا اپنا رنگ بھی ہوگا۔ ایک بات غور سے سنیے ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں کہ اورنگ آباد دکن کا کوئی فنکار کسی تحریک سے اس طرح متاثر نہیں ہوا کہ فیشن زدہ نقالی کرنے لگے۔ اورنگ آباد دکن کی شناخت اس کا اپنا دبستان ہے۔ آپ دیکھ لیجیے قاضی سلیم، بشر نواز، شاہ حسین نہری، میر ہاشم، قمر اقبال، جاوید ناصر،

سحر سعیدی، فاروق شمیم، قاضی رئیس اور خان شمیم افسانہ نگاروں میں محمود شکیل، رشید انور، الیاس فرحت، رفعت نواز، نور الحسنین، عظیم راہی، یہ کسی تحریک کے حاشیہ بردار نہ تھے نہ ہیں۔ انھیں کسی ادبی تحریک سے جوڑنا بے معنی ہے۔ جدیدیت کوئی تحریک نہیں تھی زمانے کا رجحان تھا۔

● کیا آپ نے شاعری میں اظہار خیال کی تنگی داماں کے سبب افسانوں کو اختیار کیا؟

☆ میں اس بات کا قائل نہیں کہ کسی بھی صنف کا دامن تنگ ہے۔ فنکار اپنی کمزوری کا الزام صنف کے سر باندھ دیتا ہے۔ میرے پاس تو تخلیق اپنی مکمل شکل وصورت، ہئیت اور اس صنف کے تمام تقاضوں کے ساتھ آتی ہے۔ مجھے بڑا عجیب لگتا ہے جب حمایت علی شاعر یہ کہتے ہیں کہ رباعی میں ایک مصرع زائد ہوتا ہے اس لیے ثلاثی لکھتا ہوں۔ جب آپ اس صنف کو برت نہیں سکتے جب آپ اس صنف کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتے یا آپ میں وہ صلاحیت نہیں تو آپ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ رباعی میں ایک مصرعہ زائد ہے تو حمایت علی شاعر کی کتنی سہ مصرعی نظمیں ہیں (جن کو وہ ثلاثی کہتے ہیں) میں ایک مصرع زبردستی کا ہوتا ہے تو یہ آپ بھی جانتے ہیں کہ کئی اشعار تو ایسے ہوتے ہیں کہ بات ایک مصرع میں مکمل ہو جاتی ہے، مصرع ثانی بھرتی کا ہوتا ہے۔ آج کل بعض لکھنے والے کچھ عجیب وغریب قسم کی مضحکہ خیز باتیں کرنے لگے ہیں اور ہر آدمی کسی نہ کسی صنف کا موجد بننے کے چکر میں جو کچھ لکھ رہا ہے اکثر وہ خود نہیں جانتا۔ آج کل تو اصناف کی درجہ بندی کا بھی فیشن چل رہا ہے اور یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ فلاں صنف کو ادب نے قبول کیا، فلاں کو نہیں کیا۔ یہ ایجاب وقبول کی مسخرگی بھی خوب ہے۔ اس طرح کے شوشے چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ یا تو انھیں کوئی کام نہیں آتا یا ان کی صلاحیتیں کم ہوگئی ہیں اور یہ اپنی بقا کے چکر میں خلابازیاں کھا رہے ہیں۔ ''ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا'' والا معاملہ ہے۔ میں نیت باندھ کر یا وضو کر کے نہیں لکھتا۔ کیا کوئی عورت سوچ سمجھ کر یا طے کر کے بچہ پیدا کرتی ہے کہ اسے لڑکا پیدا کرنا ہے اور اس طرح پیدا کرنا ہے وہ تو پیدا ہونے کے بعد دیکھتی ہے کہ یہ لڑکا ہوا یا لڑکی۔ پھر اس کا نام رکھا جاتا ہے۔ میرا حال بھی اسی ماں کی طرح ہے۔ بعض وقت افسانچہ لکھنے بیٹھتا ہوں افسانہ ہو گیا۔ قلم سے ثلاثی ٹپک پڑی، کبھی خاکہ ہو گیا تو کبھی کچھ نہیں ہوا۔ کبھی رات بھر لکھے، سارے کاغذات ردی کی ٹوکری میں پناہ لے لیتے ہیں۔ بچہ ماں کی گود میں جگہ بناتا ہے۔ آپ کی یہ بات ہضم نہیں ہوئی کہ تنگی داماں کے سبب افسانوں کو اختیار کیا۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ افسانہ میرا زیادہ پسندیدہ میدان ہے اور میں

اپنے ہمعصروں کی فہرست میں اپنا نام بھی دیکھ رہا ہوں۔ نمبر تو بتا نہیں سکتا مگر کم سے کم اپنے علاقے میں سرفہرست ہوں۔ فن جتنا ودیعت ہوتا ہے آدمی اتنا ہی کر پاتا ہے خیال اپنی ہیئت خود لے کر آتا ہے۔

یہ سوال بھی کہ آپ اتنا کیسے لکھ لیتے ہیں یا زیادہ لکھنے کی وجہ سے معیار برقرار نہیں رہتا۔ کیسا سوال ہے؟ میں تو اپنی شخصیت کے اظہار کے لیے لکھتا ہوں۔ کم لکھنے والوں کے معیار کے بارے میں کیا خیال ہے۔ کتنے ایسے ہیں جنھوں نے بہت کم لکھا ہے اور بہت برا لکھا ہے۔ کم لکھنے کے باوجود اچھا لکھنے والے بھی ہیں، بہت لکھ کر برا لکھنے والے بھی ہیں اور کتنے ایسے ہیں کہ بہت لکھا ہے اور بہت اچھا لکھا ہے۔

● آپ کی تحریروں پر ابہام کا الزام لگایا جاسکتا ہے۔ آپ کی لفظیات بھی کہیں کہیں ادق ہوتی ہیں؟

☆ میری ایک ثلاثی سنئے۔

کیا ہے ابہام کیا علامت ہے
ایسی باتوں سے مجھ کو کیا لینا
دل میں غم ہے تو فن سلامت ہے

مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ میں گنجلک کے الزام سے تو بچ گیا، کون سا لفظ کہاں استعمال کرنا ہے اس بات کا خیال رکھ کر لکھا جائے، خوبصورت لفظیات کو برتا جائے تو یہ ادق کے زمرے میں آتا ہے؟ مثال کے طور پر معجزہ، کرامت، کرشمہ جملے میں کون سا لفظ کہاں استعمال کرنا ہے پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں تو انکشاف و اکتشاف دونوں کے محل کا خیال رکھتا ہوں۔ افسانہ اور کہانی، منی کہانی اور افسانچہ میں بھی فرق کرتا ہوں۔ آپ مجھ پر لگاتے رہیے الزامات اور چھوڑ دیجیے ان کو جو چھپنے کے شوق میں کچھ بھی لکھ رہے ہیں۔ بعض لوگ شہرت کے شوق میں کسی کی کتاب کی رسم اجراء چار لوگوں کی موجودگی میں ربن کاٹ کر اور کمپیوٹر کے ذریعہ بنائی تصویر کے ساتھ لمبی چوڑی رپورٹ لکھ کر بھجوا دیتے ہیں اور مدیر انھیں نمایاں جگہ پر چھاپ دیتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ کمشنر ہے ریٹائرڈ کلکٹر ہے یا رسالے کا مدیر ہے۔

● آپ کی جو پذیرائی ہوئی کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

☆ ہاں، بالکل۔ ادب تو شرکتوں کو بنائے رکھنے کا فن ہے۔ میری طرح سوچنے اور محسوس کرنے والوں نے میری تعریف کی اتنا ہی کافی ہے اور اس سے زیادہ کی توقع فضول ہے۔ صحیح اور سچی بات کم لوگوں کے

سمجھ میں آتی ہے۔ کثرت تو ہمیشہ بے وقوفوں کی ہوتی ہے۔ بے شمار ایسے لوگ ہیں جن کی کبھی بہت پذیرائی ہوئی تھی۔ ان کے تو نام بھی اب لوگوں کو یاد نہیں۔

● اپنے ہم عصروں میں آپ اپنی تخلیقات کو کہاں الگ پاتے ہیں؟

☆ آپ ہی نے تو کہا میرے پاس ''ابہام'' ہے۔ میری لفظیات ''ادق'' ہیں کیا یہ بات مجھے اپنے ہمعصروں سے الگ نہیں کرتی۔

دوسرے بری زبان لکھ رہے ہیں۔ فلمی انداز کی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ بعض لوگ کہانی کے نام پر آدھا مضمون آدھی روداد، فلمی انداز کا کلائمکس، قارئین کو خوش کرنے کے لیے لکھ رہے ہیں۔ اس طرح میں تو ان سے مختلف ہوں نا۔ ایسی شاعری بھی ہو رہی ہے جو مشاعروں کے سامعین کو خوش کرنے کے لیے لکھی جاتی ہے۔

● شاعری میں آپ کا کون استاد رہا ہے اور افسانے میں کسے ماڈل سمجھتے ہیں؟

☆ شاعری میں قمر اقبال، افسانے میں محمود شکیل۔ رہی بات ماڈل کی تو میرا ماڈل میں خود ہوں۔ میرا کوئی ماڈل نہیں۔ ہاں ادب و شعر کے جو فنی تقاضے ہیں، مطالبے ہیں، فنی شعور کے مختلف زاویے ہیں اس سلسلے میں میں شاہ حسین نہری کی سوچ سے متاثر ہوں، ان کی سوچ اچھی لگتی ہے مگر وہاں بھی اختلاف کی گنجائش رہتی ہے۔

● ناول لکھنا نہایت ہی مشکل صبر آزما اور محنت طلب کام ہے اس کے برعکس افسانہ ایک نشست میں لکھا جاسکتا ہے اس لیے افسانے زیادہ لکھے گئے اور ناول کم۔

☆ شاید یہی بات ہو۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ناول پڑھتے پڑھتے آپ اکتا بھی سکتے ہیں لیکن افسانہ پہلے وار میں گھائل کر دیتا ہے۔ طوالت ناول کی برائی نہیں لیکن اختصار افسانے کی عظمت کی۔

● آپ کی کون سی تخلیقات مقبول ہوئیں، کیا آپ کی تخلیقات کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ ہوا؟

☆ میرے خاکے بہت مقبول ہوئے۔ میں نے خاکہ نویسی میں تجربے بھی کیے۔ میری خاکوں کی کتابیں ''تنظیم کثیر رنگی'' ''رنگ امتزاج'' اور ''وقت کے چاک پر'' آپ نے پڑھی ہیں۔ افسانوں میں ''قضائے عمری'' ''آکاش بیل'' ''الساس'' ''اڑائی ہوئی گلی'' ''تیر نیم کش'' وغیرہ کو خاص شہرت ملی۔ میرا ناولٹ ''لہو لہو آرزو'' کا قاضی رئیس نے مراٹھی میں ترجمہ کیا۔ فن افسانچہ نگاری پر عظیم راہی کی

پہلی کتاب ''اردو میں افسانچہ کی روایت'' میں انھوں نے مجھے اہم افسانچہ نگار ثابت کیا۔

● اپنی شاعری اور افسانہ نگاری کے متعلق آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

☆ کوئی میرے اندر چھپا بیٹھا ہے وہی مجھ سے یہ سب کرواتا ہے۔ اس سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ فی الحال میرے یہ اشعار سنیے:

''اک لمحۂ نایافت کی لو اب بھی ہے لرزاں
رہتا ہے کوئی شخص غزل جاں مرے اندر

ملتا ہی نہیں وہ کہ سبب پوچھ لوں اک دن
رہتا ہے جو انگشتِ بدنداں مرے اندر

☆☆☆

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے

(صاحب کتاب پر اہل قلم کے مضامین)

عارف خورشید کے خاکوں پر مضامین

عارف خورشید کا نثری وشعری ادب

ڈاکٹر محمد ابوالکلام

نثر ونظم دو مختلف الانواع اصناف سخن ہیں جن کے معیار بھی مختلف ہیں۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ شعرا کا نثر نگاری کی طرف رجحان کم ہی ہوتا ہے جبکہ بعض نثر نگار صنف شاعری میں دخل ہی نہیں رکھتے بلکہ اس فن میں بھی طاق ہوتے ہیں۔ میری دانست میں اس کی کئی وجوہات ہیں۔ جنھیں اوزان کا ربط ہوجاتا ہے وہ آسانی سے شعر کہہ لیتے ہیں اور اچھوتے مفاہیم پر داد وتحسین بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس وسیلے سے انھیں کبھی کبھار غیر متوقع مقبولیت بھی مل جاتی ہے جبکہ اچھی اور معیاری نثر لکھنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ شعر کہہ لینا ہے۔ اس میں فن کار کا بھرم کھل جاتا ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ علاوہ ازیں جو خود اعتمادی نثر نگار کو میسر ہے وہ شاعر کو نثر کے معاملے میں نہیں، بلکہ وہ کبھی کبھی عدم اعتماد کا شکار بھی ہوجاتے ہیں۔ نثر نگار کی یہی خود اعتمادی جہاں اسے اچھے نثّار ہونے میں معاون ہوتی ہے وہیں شاعری کی جانب اس کی طبع کو مبذول کرتی ہے۔ ایسے کم ہی ہوتے ہیں جنھیں دونوں اصناف پر دسترس حاصل ہو۔ ایسی ہی کمیاب شخصیات میں اورنگ آباد کے اہل قلم 'عارف خورشید' کا شمار ہوتا ہے جن کی شعری اور نثری تخلیقات منصہ شہود پر آکر داد وتحسین حاصل کر رہی ہیں۔ ایک مقام پر انھوں نے افسانہ نگاری اور شاعری سے متعلق تحریر کیا کہ:

> ''افسانہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔ اکثر افسانہ نگاروں کے اس زعم سے میں پوچھتا ہوں۔ عورت کے لیے لڑکا پیدا کرنا مشکل اور لڑکی پیدا کرنا آسان کیسے ہوسکتا ہے؟''

میں عرض کروں کہ لڑکے کا سر بڑا ہوتا ہے اور لڑکی کا چھوٹا۔ بس یہی نثر نگاری اور شاعری کا فرق ہے۔

عارف خورشید کی دو تصانیف فی الحال میرے زیر مطالعہ ہیں، جن میں نثری تخلیقات کا مجموعہ موسومہ ''وقت کے چاک پر'' اور غزلوں اور ثلاثیوں کا مجموعہ ''سوچ کے جزیرے'' شامل ہیں۔ ان

تصانیف کی بنیاد پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انھیں بیک وقت دونوں اصناف نثر و نظم پر ملکہ حاصل ہے۔ میں انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

افسانہ، خاکہ اور تبصرہ نگاری: 'وقت کے چاک پر' میں چار افسانے، ایک تبصرہ، چار خاکے اور ایک سو نو افسانچے شامل ہیں۔ ان میں سے تین افسانوں میں انھوں نے ازدواجی زندگی اور مرد کی بے وفائی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے جبکہ چوتھے افسانہ میں ہمارے اداروں کا المیہ پیش کیا ہے۔

افسانہ ''شجر ممنوعہ'' میں غازی جب اپنی شریک حیات ملکہ کے قریب جاتا ہے تو وہ اپنی لڑکپن کی محبوبہ شبینہ کے خیالوں میں گم ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ ملکہ سے وہ انصاف نہیں کر سکتا جس کی کہ وہ متقاضی تھی۔ اس میں شبینہ کا اعلیٰ کردار پیش کیا جو اُسے ہر وقت شجر ممنوعہ کی طرح اپنے قریب ہونے سے روکتی رہی۔ یہ ایک باوقار خاتون کی زندگی کا سرمایہ ہے۔ مرد کو بھی اسی طرح دیانت دار ہونا چاہیے۔ افسانہ ''سات چاند'' ایک ایسے صدر مدرس کی کہانی پر مشتمل ہے جو اپنی اسکول کی معلمات کے خیالوں میں اتنا کھو جاتا ہے کہ اسے اس کی بیوی حقیر لگنے لگتی ہے۔ بمصداق جسے ہوٹل کا کھانا راس آجاتا ہے اسے گھر کا کھانا بے مزہ لگتا ہے۔ افسانہ نگار نے جس جملہ پر اختتام کیا ہے وہ اس افسانہ کا نچوڑ ہے۔ ''دوسری عورت کی جو چیز آپ انجوائے کرتے ہیں وہ آپ کی بیوی میں کم ہو جاتی ہے۔'' تیسرا افسانہ ''داستان مرکب ہے'' میں ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو بقول افسانہ نگار ''نہم اور دہم تک پہنچتے پہنچتے ریاضی کا یہ کمزور طالب علم لڑکیوں کے حاصل کرنے کا حساب سیکھ گیا۔'' لیکن عمر کے آخری حصہ میں جب وہ اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرنے لگا تو سوائے افسوس کے کچھ حاصل نہیں تھا۔

عارف خورشید کے افسانے عام افسانوں کی روش سے انحراف کرتے ہوئے ضرور نظر آتے ہیں لیکن یہی افسانے ان نوجوانوں کے لیے سبق آموز اور مشعل راہ ہیں جو عنفوان شباب کی دہلیز پر قدم رکھ چکے ہیں اور جانے انجانے میں غلط روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ افسانہ نگار نے بڑی مرصع اور فصیح زبان استعمال کی ہے جو ایسے افسانوں کے لیے موزوں ہوتی ہے۔ اگر ان افسانوں کے لیے سلیس اور عام فہم زبان کا استعمال کیا جاتا تھا شاید یہ معیار قائم نہیں رہ پاتا۔

تبصرہ نگاری: اس کتاب میں ایک تبصرہ شامل ہے جو سلیم احمد کی افسانوی تصنیف ''اندھے سفر کا مسافر'' پر کیا گیا ہے۔ عارف خورشید نے اس میں منفی طرز تحریر کو اپنایا ہے۔ میں اسے تنقیص نہیں کہتا بلکہ اصلاحی

گردانتا ہوں۔ انھوں نے صنائع لفظی کی ان اغلاط کی نشان دہی کی ہے جو عام طور پر بولے یا لکھے جاتے ہیں۔ میری دانست میں یہ تبصرہ سلیم احمد کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا۔

خاکہ نگاری: تبصرہ اور خاکہ میں فرق ہے۔ تبصرہ تصنیف پر کیا جاتا ہے اور خاکہ شخصیات کے منجملہ اوصاف کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کتاب میں چار افراد پر مختلف عنوانات کے تحت خاکے قلم بند کیے گئے ہیں۔ ''وقت کے چاک پر'' قاضی سلیم کی حسن طبع، شاعری اور انشا پردازی پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ قاضی سلیم کو سیاسی اور ادبی حلقوں میں کون نہیں جانتا۔ انھوں نے عام طور پر نظموں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی بعض نظمیں بے حد مقبول ہوئیں۔ دیگر خاکوں میں حمید سہروردی پر ''ایک افسانہ طراز''، رشید انور پر ''جتنے اس پیڑ کے پھل تھے'' کے عنوانات سے ان کی شخصیات کو ان کے افسانہ نگاری اور جاوید ناصر پر ''پرانا غم کہانی بن گیا'' ان کی شعری کاوشات کے تناظر میں ان کی شخصیت کا تعارف کرایا ہے۔ عارف خورشید کا انداز تحریر عام روش سے ہٹ کر ہے۔ انھوں نے ان خاکوں میں نہ صرف ادبی، شعری محاسن کا احاطہ کیا ہے بلکہ ان کی ذاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی بیان کر دیا ہے۔ کہیں کہیں حد سے تجاوز کر کے ایسی باتوں کا بھی ذکر کر دیا ہے جو نہ کرتے تو بہتر تھا۔ اللہ ستارالعیوب ہے ہمیں بھی اس کا پاس رکھنا چاہیے۔

افسانچہ نگاری: ادب میں اختصار نے افسانچوں کو جنم دیا ہے۔ جن میں کم سے کم الفاظ میں وہی باتیں کہی جاتی ہیں، جو ایک افسانے میں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ غزل کے شعر کی طرح افسانچوں کا بھی تقاضا یہی ہے کہ ان میں مفہوم کی تکمیل کا خیال ضرور رکھا جائے۔ عارف خورشید نے ذاتی مشاہدات اور سماج میں ہونے والی غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے افسانچوں کو وسیلہ بنایا ہے۔ جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

عام طور پر یہ مشہور ہے کہ حج کے بعد انسان کے تمام گناہ دھل جاتے ہیں۔ کسی حد تک صحیح بھی ہے لیکن اس کی کچھ شرائط بھی ہیں۔ انسان اس امید پر گناہ کرتا جائے کہ وہ حج کر کے سب کچھ معاف کروالے گا درست نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے افسانچے ''حج'' میں اسی طرف اشارہ دیا ہے۔

اسلام نے تجارت میں دیانتداری کی شرط رکھی ہے۔ اگر کسی مال میں نقص ہو تو اسے ظاہر کر دینا ضروری ہے۔ آدھا بتا کر آدھا چھپا لینا بددیانتی ہے۔ انھوں نے افسانچہ ''ضابطہ کی تکمیل'' میں اس کو پیش کیا ہے۔ مثلاً:

''کپڑے کی تھان میں سوراخ تھے۔ حاجی صاحب نے تھان کو تھوڑا سا
کھول کر ایک سوراخ دکھایا اور مطمئن ہو گئے۔''

اصولاً انسان جو اپنے لیے پسند کرتا ہے وہ دوسروں کے لیے بھی پسند کرے لیکن آج کے خود غرض زمانے میں یہ قدریں اٹھتی جا رہی ہیں۔ افسانچہ ''اپنے لیے'' میں اسی بات کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے:

''امیر جماعت نے کہا۔ آپ کا بیٹا جماعت سے جڑا ہے، صالح
خوبصورت اور باصلاحیت نوجوان ہے۔
اپنی بیٹی کا ہاتھ......
قطع کلام کرتے ہوئے میں نے کہا میرے بیٹے کو مرگی ہے۔ تو فوراً
بولے۔ میرے ایک دوست کی بہت بیٹیاں ہیں، میں ان سے آپ کے
بیٹے کے رشتے کی بات کرتا ہوں۔''

آج ہر کام ریا کاری کی نذر ہو گیا ہے، نماز جیسے فریضے میں بھی ریا کاری کا عنصر غالب ہوتا جا رہا ہے۔ جسے افسانچہ ''مالک'' میں واضح کیا گیا ہے۔

''سیٹھ نماز پڑھ رہے ہیں اور نوکر پنکھا جھل رہا ہے سیٹھ بہت ہی
خشوع وخضوع سے نماز پڑھنے لگے کہ نوکر دیکھ رہا ہے۔''

اسی طرح افسانچہ ''نمازی'' میں نوجوانوں کی نماز پر ضرب لگائی ہے کہ کالج کے احاطے میں جمعے کی نماز ہوتی ہے اور اکثر نوجوان جمعے کی نماز کے لیے یہیں آتے ہیں۔

بزرگوں سے سنا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب لوگ گناہ کو گناہ نہیں فیشن سمجھ کر کریں گے اور یہ دنیا کی تباہی کا پیش خیمہ ہوگا۔ آج غنیمت ہے لوگ گناہ کو گناہ سمجھ رہے ہیں، جسے خدا توفیق دے تو وہ تائب بھی ہو سکتا ہے۔ ''ہنوز ساتواں آسماں دوراست'' میں اسی خیال کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کے افسانچوں میں حالات کی عکاسی، سماج کا کرب اور دعوت فکر کے عناصر موجود ہیں۔

فن شاعری

۱) ثلاثیاں: اردو شاعری میں ثلاثیاں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ ان کا اسلوب وہی ہے جو غزل میں چھوٹی

بحروں کا ہے۔غزل کے ہر شعر میں دو مصرعے ہوتے ہیں جب کہ ثلاثیاں تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ان تین مصرعوں میں شاعر اپنی جودت طبع کا نچوڑ پیش کرتا ہے اور مفہوم کی تکمیل کا پورا حق ادا کرتا ہے۔عارف خورشید کی تصنیف ''سوچ کے جزیرے'' میں کل ایک سونو (۱۰۹) ثلاثیاں ہیں جن میں سے چند کا انتخاب پیش کرتا ہوں۔تخلیق کار کا اپنا میلان طبع ہوتا ہے جو چاہے نظم ہو یا نثر،غزل ہو یا ثلاثی یا کوئی اور تخلیق کیوں نہ ہو، ہر جگہ اس کی جھلک ملتی ہے۔عارف خورشید نے سماج کی نبض پر انگلیاں رکھ کر جو کچھ محسوس کیا ہے، وہ ان کی تخلیقات سے نمایاں ہے۔یہی حال ان کی ثلاثیوں کا ہے۔

نیک کام اور نصائح خلوص پر مبنی ہو تو انسان اجر کا مستحق ہوتا ہے لیکن یہ باتیں ریاکاری کی نذر ہوگئی ہیں۔وہ کہتے ہیں:

یہ نصیحت بھی اب نمائش ہے
ہم گنہگار ہی سہی یارو
پارسائی بھی اب نمائش ہے

عیادت کا مقصد مریض کی دل جوئی ہے جس سے مریض چند لمحوں کے لیے اپنے غم بھلا دیتا ہے۔اس لیے یہ کار ثواب میں داخل ہے۔اسی خیال کو اس انداز میں پیش کیا ہے:

یاد اس طرح تیری آتی ہے
اس پیالے میں ذہن کے جیسے
شہد کی بوند ٹپکی جاتی ہے

مثل مشہور ہے کہ تلوار کا زخم تو مندمل ہو سکتا ہے لیکن قلم کا زخم نہیں بھرتا۔اس رجحان کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے:

لفظ کو وار سے نہ کم سمجھو
میرے ہاتھوں میں ہے قلم دیکھو
اس کو تلوار سے نہ کم سمجھو

شمع کو زندگی سے استعارہ کیا جاتا ہے۔بقول شخصے:

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

عارف خورشید کہتے ہیں:

شمع جل کر پگھل ہی جائے گی
جاوداں ہوگا وصل کا لمحہ
یہ جوانی بھی ڈھل ہی جائے گی

انسان مادی ترقی کے ساتھ اخلاقی پستی کا بھی شکار ہوتا جارہا ہے۔ سماج میں اخلاص کا فقدان ہوتا جارہا ہے اوراس کی جگہ خودغرضی عام ہوتی جارہی ہے۔ آج کے ماحول میں اگر کوئی زیادہ مہربان ہوتا نظر آتا ہے تو اس میں اس کی غرض کا شائبہ ضرور ہوگا۔ اس مفہوم کو ادا کرتے ہوئے عارف خورشید یوں رقم طراز ہیں:

وہ شرافت کی بات کرتا ہے
اس میں شاید غرض ہے پوشیدہ
کیوں محبت کی بات کرتا ہے

اچھے انسان کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہر حال میں دوسروں کے کام آتا ہے۔ انھوں نے پیڑ کی مثال دے کراس طرح سمجھایا ہے:

کب وہ احسان کسی کا لیتا ہے
پیڑ جلتا ہے سوکھ جانے پر
سبز جب تک ہے چھاؤں دیتا ہے

ہر انسان کے اندر کوئی نہ کوئی اچھائی ضرور ہوتی ہے لیکن وہ اس سے نا آشنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خودکو پہچان لے تو بے جا جستجو میں اپنا وقت برباد نہ کرے۔ اس خیال کو عارف خورشید نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

ہے عجب اپنے آپ سے دوری
جستجو میں ہیں ہم ہرن کی طرح
اپنے اندر ہے اپنی کستوری

۲) غزلیات: عارف خورشید کی غزلوں میں مفاہیم کی کمی نہیں ہے۔ اچھے اور اچھوتے مفاہیم اور دور

حاضر کا کرب ان کے اشعار کے عنوانات ہیں۔علاوہ ازیں انھوں نے مختصر اور طویل دونوں بحروں میں طبع آزمائی کی ہے۔

خدا ترسی، ذاتِ الوہیت سے قلبی لگاؤ اور خود سپردگی ان کے اشعار سے عیاں ہے۔ وہ کہتے ہیں:

میں تو عارف خدا کا بندہ ہوں
زندگی میری سیدھی سادی ہے

ایک مقام پر یوں گویا ہیں:

درمیان راستے ہیں ، رشتے ہیں
میں خدا کی طرف رواں بھی ہوں

مومن خاں مومنؔ کا مشہور زمانہ شعر:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اسی ندرتِ خیال کو عارف خورشید نے یوں ادا کیا ہے:

اے خدا تجھ سے بات کرتا ہوں
گھر میں جب تیسرا نہیں ہوتا

خدا دور رہ کر بھی شہ رگ سے قریب ہے۔ ہر پل خلوت یا جلوت میں اس سے دعا کی جاسکتی ہے۔میں دعا گوں ہوں خدا انھیں تہجد کی توفیق عطا فرمائے۔

زبیر رضوی نے کہا ہے کہ:

دن ستم گر ہے رازوں کو اگل دیتا ہے
رات معصوم ہے گناہوں کو چھپا لیتی ہے

روشنی اچھے برے کی تمیز کرتی ہے جب کہ رات کے اندھیرے میں گناہ پنپتے ہیں۔ اسی مفہوم کو عارف خورشید نے اس انداز میں پیش کیا ہے:

روشنی اختلاف کرتی ہے
ان اندھیروں میں کیا نہیں ہوتا

جس کا دل روشن ہو جائے یعنی ہدایت حاصل کر لے تو تاریکی اور ضلالت اس سے دور ہو جاتی ہے اور وہ حق ناحق میں تمیز کرنے لگتا ہے۔ عارف خورشید کہتے ہیں:

چراغ دل جلایا ہے کبھی تو

اندھیرا سر پٹک کر رہ گیا ہے

شعر میں منظر نگاری بھی ایک فن ہے۔ شاعر نے شام کے منظر کو یوں ادا کیا ہے:

شام کے سرمئی اشاروں سے

شہر کتنا حسین ہوتا ہے

علامہ اقبال نے کہا ہے کہ:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم

جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اسی طرح عارف عزم مستحکم کا درس دیتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

جب عزم سلامت ہے تو ہے اس کا یقیں بھی

منزل مرے قدموں سے بہت دور نہیں ہے

آج کے دور میں جس طرح انسانوں سے انسانیت رخصت ہو رہی ہے اس کا شکوہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

سنتے ہیں کل کے دور میں انسان تھے بہت

تاریخ ہے اداس کہ انسان اب کہاں

آج کے پر آشوب دور میں ہر شخص اپنے زاویہ نظر سے سوچنے لگا ہے۔ خلوص کی قدریں پامال ہو رہی ہیں اور مفاد پرستی اس کی جگہ لے رہی ہے۔ کوئی کتنے خلوص سے پیش آئے لوگ اس میں اپنا مفاد تلاش ہی لیتے ہیں۔ عارف خورشید کہتے ہیں:

ہم اعتماد تو سونپ آئے تھے انھیں اپنا

مگر وہ لوگ دکانیں سجا کے بیٹھ گئے

عاشق اپنے معشوق کے خیال میں گم ہو جائے تو اسے اپنی بھی خبر نہیں رہتی۔ بعینہ جو اپنے

آپ کوفنافی اللہ کرلیتا ہے اسے دنیا کی خبرنہیں ہوتی۔عارف خورشید کہتے ہیں:

یہ بھی خبر نہ ہوسکی تیرے خیال میں

آکر قریب کون کدھر سے گزر گیا

چھوٹی بحروں میں بھی ان کی غزلیں ملتی ہیں۔اپنی ساری زندگی کا نچوڑ بیان کرتے ہوئے یوں گویا ہیں:

سلسلہ حیات کا

موت کے پیام تک

خدا ہر شے پر قادر ہے۔سزا و جزا پر بھی قادر ہے۔یاس کو آس میں بدل سکتا ہے۔بروں کو نیک توفیق دینے پر بھی قادر ہے اور عفوودرگزر پر بھی۔نہ جانے شاعر نے کس زعم میں یہ شعر کہہ ڈالا:

تجھ سے کرتا ہے سوال اب کیسے

دل کو چپ چاپ سزا دے یارب

میں اس شعر سے قطعی متفق نہیں ہوں۔خدا سے اس کے رحم وکرم کی بھیک مانگنا چاہیے نہ کہ سزا۔انسان کیا اس کی ادنیٰ سی سزا کو برداشت کرنے کے لائق ہے۔ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہوگا تو پھر سزا کا مطالبہ کیا معنی۔

میری نظر میں عارف خورشید ایک بے باک اور راست گوفن کار ہیں،جن کی نثری وشعری تخلیقات قاری کو دعوت فکر دیتی ہیں۔میں ان کی مساعی جمیلہ پر انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ مستقبل میں بھی صحت مند ادب پیش کرکے اردو ادب میں اضافہ کی روایت کو قائم رکھیں گے۔جو لوگ اس راہ میں دامے درمے قدمے سخنے کوشاں ہیں ان کے لیے میں یہ کہوں کہ وہ اپنے خون جگر سے چمن اردو ادب کی آبیاری کررہے ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔عارف خورشید کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔

☆☆☆

ایک اسلوب ساز تخلیق کار

احسن امام احسن

سرزمین ولی و سراج ادب کے لیے کافی زرخیز ہے۔اورنگ آباد دکن کی اپنی ایک تاریخ ہے جو اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں۔اسی اورنگ آباد کی دھرتی پر عارف خورشید ادب کی کھیتی کرتے آئے ہیں اور علمی و ادبی اناج سے دنیائے ادب کے بھوکوں کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔انھوں نے کئی کتابیں برائے مطالعہ بھیجی ہیں، جن میں ''وقت کے چاک پر''، ''سوچ کے جزیرے'' اور ''رنگِ امتزاج'' ہیں۔سبھی کتابوں کے مطالعے کے بعد ایک ملا جلا تاثر قائم ہوتا ہے اور شاعر، افسانہ نگار، خاکہ نگار، تبصرہ نگار یعنی مکمل ادبی شخصیت کا چہرہ ابھرتا ہے۔''رنگِ امتزاج'' کے مطالعے کے بعد سچ پوچھیے تو میں بے حد متاثر ہوا۔تبصرے اور مضامین بہت پڑھے ہیں اور اب تک پڑھتا آرہا ہوں، مگر عارف خورشید کی تحریر نے اپنے تاثرات کاغذ پر اتارنے کے لئے مجبور کیا۔حالانکہ کوئی نئی بات موصوف نے نہیں کی ہے، مگر بات کہنے کا انداز نیا ہے جو دوسروں سے مختلف ہے۔انھوں نے ایک الگ ڈھنگ سے راہ نکالی ہے۔نئے طریقے سے اظہار خیال کیا ہے جس پر پرانی باتوں میں بھی نیا پن جھلکتا ہے۔اپنی باتوں کو لطیف پیرائے میں ڈھال کر قلم کار کی ادبی حیثیت کو اجاگر کیا ہے اور عیب کو بھی دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔بڑی عرق ریزی سے شعرا و ادباء کے خاص گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔انھوں نے اتنی کام کی باتیں اتنے اچھے انداز میں لکھ دی ہیں کہ اسے حوالے کے طور پر مضامین میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

'رنگ امتزاج' میں عارف خورشید کا رنگ دیکھنے اور غور و فکر کرنے کی چیز ہے۔بہت ہی بولڈ تبصرے لکھتے ہیں اور کثرت سے لکھتے ہیں۔خاکہ نگاری میں تو جواب نہیں۔انھیں مہاراشٹر کا اپنی طرح کا پہلا خاکہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ان کی خاکہ نگاری اور تبصرے کے آگے میرے یہ چند جملے چھوٹے معلوم پڑتے ہیں۔بہت سے ایسے قلم کار ہیں جو بہت لکھتے ہیں اور خوب چھپتے ہیں۔ان میں چند ہی معیاری ہوتے ہیں مگر عارف خورشید معیار پر پورے اترتے ہیں۔

عارف خورشید پوری ایمانداری سے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے کام

کررہے ہیں۔ یہ خوش آئندہ بات ہے۔ موصوف کی خوبی یہ ہے کہ بعض جگہ اتنی اچھی بات کہہ جاتے ہیں کہ رشک کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کئی جگہ ذہن رقص کرتا نظر آتا ہے۔ ان کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ ایمانداری سے افسانے، غزلیں لکھتے ہیں اور دوسروں کے فن کا ایمانداری سے جائزہ لیتے ہیں۔ دیکھیے میر ہاشم کا 'مسلک شاعری' کیا انداز ہے:

''تخلیق کے پرندے کو زبردستی قید کرنا شاعری کے زمرے میں نہیں آتا اور نہ ہر پابندی سے آزاد ہوکر پر کٹے پرندے اڑانے کی کوشش کرنا ادب ہے۔''

عارف خورشید کی تحریروں میں دنیائے ادب کی تصویر کشی کا جو انداز ہے وہ منفرد ہے اور موصوف اس کو نئے انداز کا لباس عطا کرنے کا فن جانتے ہیں، جو ان میں بدرجہ اُتم موجود ہے۔ ان کا یہ انداز انھیں منفرد انداز والوں کی صف میں کھڑا کرتا ہے۔ ان کا اندازِ بیان اتنا دلکش ہوتا ہے کہ پڑھنے والا لطف وسرور میں ڈوب جاتا ہے۔ ڈاکٹر عظیم راہی لکھتے ہیں:

''وہ شخصیت کا احاطہ اس دل فریب انداز میں کرتے ہیں کہ پڑھنے والا تحریر کے سحر میں ڈوب جاتا ہے۔ ساتھ ہی اس کے فن کی خوبیوں کو بھی اور وہ اپنی قوت متخیلہ سے یوں نمایاں کرتے ہیں کہ فن کے مختلف رنگ قوس وقزح کی طرح روشن ہو جاتے ہیں۔''

ان کی شاعری کے متعلق میری ذاتی رائے ہے کہ ان کی شاعری میں مکمل پختگی ہے۔ ان کا انداز اور لفظوں کی جادوگری قابل تعریف ہے۔ دو شعر دیکھیے:

ملے تھے کب کہاں بچھڑے تھے یاد آتا نہیں کچھ بھی
کہیں تو کچھ نہ کچھ کھویا ہے یہ احساس باقی ہے

کئی روحیں کنارے سے ابھی تک بات کرتی ہیں
سمندر کے علاوہ کیا ہمارے پاس باقی ہے

یوں تو سب کے شعر کہنے کا انداز مختلف ہوتا ہے لیکن عارف خورشید کا دلکش انداز قاری کو اپیل کرتا ہے۔ ان کی تحریر میں نئے ادراک وآگہی اور وجدان وشعور کی نئی شمعیں روشن نظر آتی ہیں۔ ان کی

ایک اسلوب ساز تخلیق کار

احسن امام احسن

سرزمین ولی وسراج ادب کے لیے کافی زرخیز ہے۔اورنگ آباد دکن کی اپنی ایک تاریخ ہے جواہلِ علم سے پوشیدہ نہیں۔اسی اورنگ آباد کی دھرتی پر عارف خورشید ادب کی کھیتی کرتے آئے ہیں اور علمی وادبی اناج سے دنیائے ادب کے بھوکوں کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔انھوں نے کئی کتابیں برائے مطالعہ بھیجی ہیں، جن میں ''وقت کے چاک پر''، ''سوچ کے جزیرے'' اور ''رنگِ امتزاج'' ہیں۔ سبھی کتابوں کے مطالعے کے بعد ایک ملا جلا تاثر قائم ہوتا ہے اور شاعر، افسانہ نگار، خاکہ نگار، تبصرہ نگار یعنی مکمل ادبی شخصیت کا چہرہ ابھرتا ہے۔ ''رنگِ امتزاج'' کے مطالعے کے بعد سچ پوچھیے تو میں بے حد متاثر ہوا۔تبصرے اور مضامین بہت پڑھے ہیں اور اب تک پڑھتا آرہا ہوں، مگر عارف خورشید کی تحریر نے اپنے تاثرات کاغذ پر اتارنے کے لئے مجبور کیا۔ حالانکہ کوئی نئی بات موصوف نے نہیں کی ہے، مگر بات کہنے کا انداز نیا ہے جو دوسروں سے مختلف ہے۔انھوں نے ایک الگ ڈھنگ سے راہ نکالی ہے۔ نئے طریقے سے اظہار خیال کیا ہے جس پر پرانی باتوں میں بھی نیا پن جھلکتا ہے۔اپنی باتوں کو لطیف پیرائے میں ڈھال کر قلم کار کی ادبی حیثیت کو اجاگر کیا ہے اور عیب کو بھی دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ بڑی عرق ریزی سے شعرا و ادباء کے خاص گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔انھوں نے اتنی کام کی باتیں اتنے اچھے انداز میں لکھ دی ہیں کہ اسے حوالے کے طور پر مضامین میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

'رنگ امتزاج' میں عارف خورشید کا رنگ دیکھنے اور غور وفکر کرنے کی چیز ہے۔ بہت ہی بولڈ تبصرے لکھتے ہیں اور کثرت سے لکھتے ہیں۔ خاکہ نگاری میں تو جواب نہیں۔انھیں مہاراشٹر کا اپنی طرح کا پہلا خاکہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ان کی خاکہ نگاری اور تبصرے کے آگے میرے یہ چند جملے چھوٹے معلوم پڑتے ہیں۔ بہت سے ایسے قلم کار ہیں جو بہت لکھتے ہیں اور خوب چھپتے ہیں۔ان میں چند ہی معیاری ہوتے ہیں مگر عارف خورشید معیار پر پورے اترتے ہیں۔

عارف خورشید پوری ایمانداری سے اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لئے کام

کرر ہے ہیں۔ یہ خوش آئندہ بات ہے۔ موصوف کی خوبی یہ ہے کہ بعض جگہ اتنی اچھی بات کہہ جاتے ہیں کہ رشک کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کئی جگہ ذہن رقص کرتا نظر آتا ہے۔ ان کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ ایمانداری سے افسانے، غزلیں لکھتے ہیں اور دوسروں کے فن کا ایمانداری سے جائزہ لیتے ہیں۔ دیکھیے میر ہاشم کا 'مسلک شاعری' کیا انداز ہے:

> ''تخلیق کے پرندے کو زبردستی قید کرنا شاعری کے زمرے میں نہیں آتا اور نہ ہر پابندی سے آزاد ہو کر پر کٹے پرندے اڑانے کی کوشش کرنا ادب ہے۔''

عارف خورشید کی تحریروں میں دنیائے ادب کی تصویر کشی کا جو انداز ہے وہ منفرد ہے اور موصوف اس کو نئے انداز کا لباس عطا کرنے کا فن جانتے ہیں، جو ان میں بدرجہ اُتم موجود ہے۔ ان کا یہ انداز انھیں منفرد انداز والوں کی صف میں کھڑا کرتا ہے۔ ان کا اندازِ بیان اتنا دلکش ہوتا ہے کہ پڑھنے والا لطف و سرور میں ڈوب جاتا ہے۔ ڈاکٹر عظیم راہی لکھتے ہیں:

> ''وہ شخصیت کا احاطہ اس دل فریب انداز میں کرتے ہیں کہ پڑھنے والا تحریر کے سحر میں ڈوب جاتا ہے۔ ساتھ ہی اس کے فن کی خوبیوں کو بھی اور وہ اپنی قوت متخیلہ سے یوں نمایاں کرتے ہیں کہ فن کے مختلف رنگ قوس وقزح کی طرح روشن ہو جاتے ہیں۔''

ان کی شاعری کے متعلق میری ذاتی رائے ہے کہ ان کی شاعری میں مکمل پختگی ہے۔ ان کا انداز اور لفظوں کی جادوگری قابل تعریف ہے۔ دو شعر دیکھیے:

ملے تھے کب کہاں بچھڑے تھے یاد آتا نہیں کچھ بھی
کہیں تو کچھ نہ کچھ کھویا ہے یہ احساس باقی ہے

کئی روحیں کنارے سے ابھی تک بات کرتی ہیں
سمندر کے علاوہ کیا ہمارے پاس باقی ہے

یوں تو سب کے شعر کہنے کا انداز مختلف ہوتا ہے لیکن عارف خورشید کا دلکش انداز قاری کو اپیل کرتا ہے۔ ان کی تحریر میں نئے ادراک و آگہی اور وجدان و شعور کی نئی شمعیں روشن نظر آتی ہیں۔ ان کی

شاعری میں انفرادیت کے نشانات جگہ جگہ آپ کو مل جائیں گے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مرے پہلو میں جو روشن دیا ہے
وہ میرے آنسوؤں سے جل رہا ہے

وہ جو لہجے سے پتھر کاٹتا تھا
وہ شیشہ ہاتھ سے کیسے چھٹتا ہے

مجھ سے الفاظ روٹھ جاتے ہیں
کس روانی کا منتظر ہوں میں

شام تک گھر کا آسمان بھی ہوں
رات ہوتے ہی بے مکان بھی ہوں

تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی تحریر روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔ وہ جس عرق ریزی سے ادبی فضا کو معطر کر رہے ہیں۔ یہ ان ہی کا حصہ ہے موصوف کا بڑا ہی دلچسپ اور شگفتہ انداز تحریر ہے۔ انھیں زبان پر عبور حاصل ہے۔ شعوری طور پر ان کا اظہار قابل تحسین ہوتا ہے۔ آج کے ماحول اور معاشرے کی تصویر کشی ان کی شاعری میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ چند اشعار اور دیکھیں:

جس کی آواز کی تلاش میں ہوں
اس کا لہجہ سنائی دیتا ہے

کیوں روز بھٹکتے ہیں سمندر کے قبیلے
کیوں نیند کے زخموں کو مسیحا نہیں ملتا

کرنوں کی دعائیں رہیں پانی میں پگھلتی
سورج کو گناہوں کا علاقہ نہیں ملتا

پتی پتی گلاب بکھرے ہیں
اس کی یادوں کے خواب بکھرے ہیں

عارف خورشید چاہے شاعری کریں یا نثر لکھیں یا پھر خاکہ نگاری میں اپنے جوہر دکھائیں اس کا جواب نہیں۔ کیونکہ عارف خورشید نے تخلیقی کرب کو جھیلا ہے جد و جہد کی ہے ان کی شاعری میں نغمگی اور شگفتگی آئی ہے۔ ان کی ثلاثیاں بھی دل کو موہ لینے والی ہیں۔ بڑے پتے کی بات تین مصرعوں میں کہہ کر نکل گئے ہیں۔ واقعی عارف خورشید ایک اسلوب ساز تخلیق کار ہیں۔

☆☆☆

یوں دیکھیں عارف خورشید کو

اسلم مرزا

Possessed of agility and passion,
Energy (out of town fashion)
Attack every obstacle
And height; make the sun your pedestal
Geoffery Hill in 'Metamorphosis'

گیارہ اپریل ۱۹۹۱ء بہت مصروف دن تھا۔ ماہ رمضان کا آخری عشرہ، کورٹ میں کئی مقدمات کی پیشیاں طے تھیں اور اسی دن صبح دس بجے آکاشوانی اورنگ آباد میں پروگرام ''سب رنگ'' کے لیے کلام شاعر کی ریکارڈنگ، سو آکاش وانی پہنچا۔ ریکارڈنگ کے بعد نور الحسنین کے ساتھ ان کے دفتر میں بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ اسی وقت درمیانی قد، فربہ جسم، طباق چہرے پر خشخشی ڈاڑھی، سر پر سخت گھنے بال، آنکھوں پر ہلکے سرمئی گلاس کی عینک اور لبوں پر شریر مسکراہٹ کے ساتھ ایک شخص کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔

''کیا میں اندر آسکتا ہوں'' آواز ابھری۔ میری سماعت کے لیے یہ آواز اجنبی تھی اور وہ شخص بھی۔

''آیئے آیئے، عارف صاحب، تشریف لایئے۔ نور الحسنین نے لہک کر پرتپاک اور مخلصانہ لہجے میں دعوت دی۔

اچھا، یہ عارف ہیں۔ کون ہیں۔ چہرے مہرے سے مجھے ایک تاجر پیشہ شخص لگا۔ عارف آئے اور میری بغل والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو متجسس نظروں سے دیکھا۔ اپنی مصروفیات کا خیال آیا تو میں اٹھنے لگا۔ نور الحسنین نے کہا: ''مرزا صاحب بیٹھیے، ان سے ملیے یہ ہیں عارف خورشید......

عارف خورشید۔ یاد آیا کہ انھیں تو پڑھتا رہتا ہوں۔ اورنگ آباد کی ادبی فضا پر ایک ابر پارے

کی طرح ڈول رہے ہیں۔

''عارف، یہ ہیں اسلم مرزا'' نورالحسنین کے تعارفی کلمات۔

ایک ہاتھ میری طرف بڑھا۔ میں نے تھام لیا۔ مصافحہ ہوا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پھر دیکھا، تکلفاً مسکرائے۔ ''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر'' میں بدبدایا۔ ادھر بھی یہی حالات تھے۔ غور سے سر کی طرف دیکھا گھنے سیاہ بال قدرتی نہیں وگ پہنی ہوئی ہے؟

عارف خورشید نے ایک بڑے لفافے میں سے ایک کتاب نکالی، چند ورق پلٹے، جیب سے بال پین نکالا، ایک صفحے پر کچھ لکھا پھر کھڑے ہو کر نہایت مؤدبانہ انداز میں وہ کتاب مجھے پیش کی اور کہا ''یہ میرا ناولٹ ہے۔ ضرور پڑھیے اور اپنی رائے دیجیے۔''

میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ ناولٹ لیا۔ دیکھا، سرورق پر نیلے رنگ میں طاؤس کا پر، سیاہ اور سرخ حاشیوں پر امپوز کیا ہوا۔ ناولٹ کا نام ''لہولہو آرزو'' بڑا Catchy ٹائٹل اور عنوان۔ پسند آیا۔ کھول کر دیکھا۔ شروع کے ایک کورے صفحے کی اوپری بائیں طرف لکھا تھا: ''برادرم اسلم مرزا صاحب کے لیے خلوص کے ساتھ۔'' نیچے دستخط اور تاریخ۔ میں نے پڑھا۔ مسرت سے شرابور ہوا۔

میں نے نورالحسنین اور عارف خورشید سے رخصت چاہی۔ نورالحسنین نے چائے کی دعوت دی۔ میں نے کہا: ''میرا روزہ ہے اجازت دیجیے۔ انشاء اللہ پھر کبھی فرصت میں حاضر ہو جاؤں گا۔'' دونوں سے مصافحہ کیا اور نکل آیا۔

واقعہ پرانا ہے، لیکن اپنی تمام جزئیات کے ساتھ آج بھی ذہن میں منور ہے۔ وہ یوں کہ پہلی ملاقات ہمیشہ تروتازہ رہتی ہے۔

اورنگ آباد کے ایک اور باشعور تخلیقی ہنرمند سے آج ملاقات ہوئی۔ آکاش وانی سے عدالت پہنچتے پہنچتے ناولٹ کو ادھر ادھر سے دیکھا۔ کتاب کے آخری صفحات پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ عارف خورشید کی سات، آٹھ کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں۔ رشک آیا۔ افسانوں کا ایک اور مجموعہ ''احساس کا زخمی مجسمہ'' زیر طبع ہے۔ یہ شخص تو بڑا لکھاری نکلا۔ شعری مجموعہ ''ٹوٹا ہوا آئینہ'' کا دوسرا ایڈیشن بھی آنے والا ہے۔

اسی رات تراویح سے فراغت کے بعد ''لہولہو آرزو'' میں ڈوب گیا۔ صرف پینتیس ڈیمائی

صفحات پر محیط یہ ایک طویل کہانی ہے۔ اسے ناولٹ کا نام کیوں دیا گیا؟ خیر ''ناولٹ'' پڑھا۔ محظوظ ہوا۔ اسلوب کی سحر کاری، فلسفیانہ موشگافیاں، علامت سازی اور بیانیہ کا ہنر۔ نثر میں شعری تکلفات کے بیشمار جگنو ٹمٹماتے ہوئے ایک پراسرار منظر نامہ۔ دھند میں ڈوبتے ابھرتے ہیولے۔ پیش منظر کبھی پس منظر میں اور پس منظر کبھی پیش منظر میں کھوئے ہوئے۔ محسوس ہوا جیسے میں خود بھی اس کہانی کا ایک کردار ہوں۔ اس میں کہیں موجود۔ یہی کامیابی ہے کہانی کار کی۔ قاری کو شروع سے آخر تک باندھے رکھنے میں کامیاب۔ ناولٹ پسند آیا۔

ادبی محفلوں میں عارف سے کبھی کبھی ملاقاتیں ہونے لگیں لیکن وہ کم گو نکلے۔ شاید اجنبیوں سے اور نئے ملاقاتیوں سے فوراً گھل مل جانا، اُن کی سرشت میں نہیں ہے۔ تفصیلی اور طویل ملاقات اور گفتگو ان کے ساتھ ایک عرصے تک نہیں ہوئی۔ روزنامہ ''اورنگ آباد ٹائمز'' کے ہفتہ واری صفحے ''رفتارِ ادب'' میں کبھی ان کے افسانے، افسانچے، غزلیں اور ثلاثیاں پڑھتا رہا۔

ایک دن اچانک مغرب کے بعد خان شمیم کے ساتھ میرے دفتر میں وارد ہوئے۔ ٹی شرٹ پہنے ہوئے، مسکرائے اور کرسی سنبھال لی۔ ہاتھوں میں جو کتابوں کا بنڈل تھا، اسے میرے ٹیبل پر رکھا، پھر آہستہ سے میری طرف کھسکاتے ہوئے گویا ہوئے۔ ''پڑھیے یہ سب میری کتابیں ہیں۔'' حوصلہ مندی اور اعتماد سے بھرپور آواز کے ساتھ وہ میری سماعت تک پہنچے۔ میں نے کتابیں لیں الٹ پلٹ کر انھیں دیکھا۔ دو شعری مجموعے ''ٹوٹا ہوا آئینہ'' اور ''دھول کی شال'' کے ساتھ چار افسانوں کے مجموعے ''سنہری رُت کا فریب'' ''یادوں کا سائباں'' ''آتشیں لمحوں میں'' اور ''احساس کا زخمی مجسمہ'' یہ ادبی کائنات میرے ہاتھ لگی اور میرے نشاطِ مطالعہ کا سامان بن گئیں۔

عارف نے کہا ''میں لکھتا ہوں۔ اپنے خرچ سے کتابیں چھپواتا ہوں اور دوستوں میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ ادب خرید کر پڑھنے وڑھنے والے اب کہاں ہیں۔''

دروغ اور چاپلوسی کے جراثیم سے پاک وصاف بات۔ حقیقت یہی ہے کہ صاف گوئی، دل میں جو بات ہے اس کا برملا اظہار عارف کا خاص وصف ہے۔ ناراضگی اور دل شکنی کی سرحدوں کو چھوتا ہوا دبنگ لہجہ۔ نہیں معلوم اس انداز اور ادا نے کس کس کی ناراضگی اور دشمنی مول لی ہوگی۔ ''بھائی پٹھان ہوں، خطابی خان نہیں ہوں۔'' یہ جملہ اکثر کہتے رہتے ہیں۔

ذہین ہیں اور راست گو ہیں اس لیے کارخانہ داری سے ہاتھ اٹھالیا اور پیشۂ درس و تدریس میں اپنی جان کا زیاں کرتے ہوئے اپنی عارفیت کو صیقل کرتے رہے۔

یہ کتابیں جو مجھے عطا کی گئیں ہیں وہ عارف کی فربہی کے مقابلے میں نہایت لاغر اور دبلی پتلی ہیں۔ حجم کم، مواد میں قوی الجثہ۔ یہ بھی ایک ادا ہے۔

عارف کی شاعری عمدہ ہے۔ جی خوش ہوا۔ نئی آگہی اور حسیت کے آبدار موتی قدم قدم پر بکھرے ہوئے۔ رومانیت میں اعتدال اور ہمواری۔ نرمی، حلاوت اور شگفتگی کا ذائقہ موجود ہے لیکن انھیں اپنی شاعری کے بارے میں نہ کوئی زعم ہے نہ وہ اپنے منفرد اور اہم شاعر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

تمام افسانے پڑھے۔ عارف ان افسانوں میں لجلجی رومانیت سے یکسر اپنا دامن بچاتے ہوئے گزر گئے ہیں۔ سماج میں دور تک پھیلی ہوئی برائیوں کو، ارباب اقتدار کی بے حسی، بے عملی، دوغلا پن اور مکاری کو ان افسانوں میں آئینہ کردیا ہے۔ قوم اور ملت کے وہ لوگ جن کے کردار اور فعل و عمل کو دوسروں کے لیے مشعل راہ ہونا چاہیے جب وہ لوگ اپنی دال روٹی کے لیے اپنے فرائض سے روگردانی کرتے ہیں، بدفعلیوں میں مبتلا ہوتے ہیں تو عارف انھیں اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ اظہار و بیان کی تازگی، نئی فکر اور ان کے متجسس اور مضطرب ذہن سے خلق ہوتے یہ افسانے اردو ادب میں گراں بہا اضافہ ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ عارف کو اپنے عہد کا بھرپور ادراک ہے۔ وہ انسانی اقدار کی پامالی کو اپنے انفرادی جذبے، ذاتی تجربے اور مشاہدے کی میزان پر تولتے ہیں۔ مادہ پرستی کا شدید رجحان جو خطرناک حد تک جنسی بے راہ روی کو ہوا دے رہا ہے، عارف کو بے چین رکھتا ہے۔ عارف، معاشرے کے افراد میں مروج خود غرضی، دغابازی اور قول و فعل کے تضادات کی سمت اشارہ کرتے ہوئے بتادیتے ہیں کہ یہ منفی رجحانات کس طرح انسانی رشتوں میں زہر گھول رہے ہیں اور اس کا کیا علاج ہے۔

شاید ۱۹۹۳ء میں خاکوں کا مجموعہ ''تنظیم کثیر رنگی'' شائع ہوا تو ادبی دنیا نے اسے سرآنکھوں پر رکھا۔ جاندار اور شاندار خاکے۔ کمال کردیا۔ اسی درمیان ''قافلے والو سچ کہنا'' شائع ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۹۶ء میں میری فرمائش پر زبیر رضوی نے اپنے رسالے ''ذہن جدید'' کی بہترین کہانیاں کی

ایک جلد بھجوائی تھی۔ ''ذہن جدید'' جیسے اردو کے موقر اور معتبر رسالے میں ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۵ء تک کے پانچ برسوں کے اٹھارہ شماروں میں سے انتالیس کہانیوں کا کڑا اور سخت انتخاب زبیر رضوی نے کیا تھا۔ یہ کتاب جب آئی اور شرکاء کہانی کاروں کی فہرست پر نظر ڈالی تو اس میں عارف خورشید کی کہانی ''السااس'' کی شمولیت نے مجھے خوش کر دیا۔ اس مجموعے میں سے سب سے پہلے ''السااس'' ہی پڑھی اور عارف خورشید کو مبارکباد دی کہ اردو کے افسانوی ادب میں اورنگ آباد کی شمولیت ایک بڑا اعزاز ہے۔ ''السااس'' آپ ضرور پڑھیے۔

ایک طویل عرصے تک خاموش رہنے کے بعد ۲۰۰۰ء میں عارف ''اور کچھ بھی نہیں کہانی میں'' لے کر ادبی منظر نامے پر لوٹے تو ایک نئے عارف سے ملاقات ہوئی۔ یہ افسانچے فکر اور سوچ کے نئے دروازے کھولتے ہیں۔ معاف کیجیے میں ان سب کتابوں پر اب یہاں کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ آپ خود پڑھیے اور جانیے کہ ادب کس طرح تخلیق ہوتا ہے۔

اپریل ۲۰۰۳ء کی ایک روشن صبح گھر سے اسکول جاتے ہوئے عارف خورشید میرے دفتر پر آئے۔ خاموشی سے اپنی تازہ کتاب ''رنگِ امتزاج'' کی ایک جلد اپنے روایتی پر خلوص اور محبت بھرے انداز سے مجھے پیش کی۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے: کہا خاکوں کا مجموعہ ہے پڑھیے اور اپنی تحریری تاثرات دیجیے۔ حسب سابق یہ بھی ایک دبلی پتلی کتاب تھی۔ ان دنوں میں اپنی چھوٹی بیٹی سارہ عرشی کے عقد نکاح کی تیاریوں میں مصروف تھا، اس کے باوجود خاکے پڑھتا رہا اور لطف اندوز ہوتا رہا۔ ایک دن اس کتاب کے صفحہ ۱۲۹ پر پہنچا یہاں رفعت سعید قریشی پر خاکہ شامل ہے۔ پڑھتے پڑھتے ایک جملے نے چونکا دیا۔ عارف نے لکھا: ''ولی اورنگ آبادی نے اپنے شعر میں جس 'جولاہا نگری' کا ذکر کیا ہے غالباً وہ نواب پورے کی وہ بستی ہے جہاں ہمرو مشروع کے صنعت کار رہا کرتے تھے۔ اب وہ محلہ صناعوں سے تقریباً خالی ہو چکا ہے۔''

ولؔی اورنگ آبادی کے بارے میں یہ جملے پڑھ کر شدید تعجب ہوا۔ یہ نئی دریافت اور تحقیق کب اور کیسے جلوہ گر ہوئی۔ عارف میدانِ تحقیق کے آدمی نہیں ہیں۔ سوچا ان سے ابھی پوچھ لوں۔ گھڑی کی طرف دیکھا تو رات کافی بیت چکی تھی مناسب یہی سمجھا کہ صبح پوچھ لوں گا۔

دوسرے دن اپنے موبائیل سے عارف کا نمبر ملایا۔ اس وقت اتفاقاً وہ کلاس سے باہر تھے۔

میں نے دریافت کیا کہ عارف صاحب آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وَلی اورنگ آبادی نے اپنے ایک شعر میں جولاہانگری کا ذکر کیا ہے اور وہ نواب پورے کی بستی ہے۔ عارف نے فوراً جواب دیا: ''آغا مرزا بیگ کی کتاب وَلی اورنگ آبادی ۱۰۷۹ھ تا ۱۴۲۱ھ سے مجھے علم ہوا'' یہ سن کر مجھے ہنسی آئی۔ میں نے کہا: ''ٹھیک ہے۔ دیکھتے ہیں۔ ملاقات ہو تو اس موضوع پر بات کریں گے۔''

سارہ عرشی کی شادی کی گہما گہمی کے بعد بیگ صاحب کی وَلی اورنگ آبادی کی جلد اول اور جلد دوم اپنے چند دوستوں کی سعی بسیار سے حاصل ہوئی۔ دونوں کتابوں کو بغور پڑھا۔ بیگ صاحب نے تحقیق کے نام پر جو افسانہ طرازی کی تھی اس کا مناسب اور مدلل جواب لکھنے کی ٹھانی۔ عارف کو یہ بات بتائی تو خوش ہوئے۔ حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ کتاب کے فلیپ پر وہ اپنے تاثرات ضرور لکھنا چاہیں گے۔ یوں مختلف عنوانات کے تحت پندرہ، سولہ مضامین لکھے۔ حلقہ ارباب سے گفتگو ہوئی تو طے ہوا کہ فی الحال صرف بارہ مضامین کی اشاعت کتابی صورت میں کی جائے۔ یہ بارہ مضامین ''آئینہ معنی نما۔ وَلی اورنگ آبادی بعض حقائق'' میں شامل ہیں۔ کمپوزنگ کا کام ختم ہوا تو ایک دن عارف آئے اور اپنی ایک تحریر میرے ہاتھوں میں تھما دی کہ اسے سرورق کے اندرونی فلیپ پر شامل کیجیے۔ وہ تحریر یہ ہے:

> باوقار لہجے میں ہواؤں نے سلیقے سے میرے کان میں کہا: ''تمھیں کیسے معلوم ہوا، وَلی اورنگ آبادی نے اپنے شعر میں جس ''جوالانگری'' کا ذکر کیا ہے وہ نواب پورے کی بستی ہے؟''
>
> میں نے کہا: ''آغا مرزا بیگ کی کتاب وَلی اورنگ آبادی ۱۰۷۹ء تا ۱۴۲۱ھ سے علم ہوا''
>
> شناسا ہنسی، میرے سنبھلنے سے قبل، اسلم مرزا کے موبائیل میں لوٹ چکی تھی اور شعر پر غور کیے بغیر لکھنے کا میرا اعتراف سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ مضحکہ خیز تحقیق کا راز افشا کرنے کے لیے اسلم مرزا کے اندر کا ادیب تلملا اٹھا۔ انھوں نے اپنے میز سے روزگار اور دورانیہ روزمرہ کے تلخ و شیریں پیالے سرکائے اور یہ سوچ کر قلم اٹھا لیا کہ آغا مرزا بیگ کا شیخ چاند کی

لائبریری خریدنا ''بندر کے ہاتھ استرا'' لگ جانے کے مترادف ہے۔ سبھی
دیکھ رہے تھے کہ موصوف کے قدم غلط تو صبح کے ساتھ فکر فراد کے بغیر آگے
بڑھ رہے ہیں۔ اسلم مرزا نے سوچا ماضی تو اٹل ہے مگر مستقبل آنے والی
نسلوں کا امین ہے۔ ان کے اس لاحق اندیشے نے میری لاپرواہی کی
خشت پر ایک ایسی عمارت تعمیر کروادی جو ہمیشہ قائم رہے گی۔
مجھے خوشی ہے کہ میری غلطی بھی غیر معمولی ثابت ہوئی اور ولی اورنگ آبادی
کے بارے میں اعلیٰ درجے کی تحقیقی دستاویز کا سبب بنی۔''

عارف کی یہ تحریر یہاں من وعن اس لیے نقل کی کہ ان کی شریر اور سنجیدہ تحریر کا لطف حاصل ہو اور میں آگے جو تحریر کرنے والا ہوں اس کے سیاق وسباق کا اندازہ ہوجائے۔

مندرجہ بالا تحریر پڑھنے کے بعد میں نے عارف سے کہا کہ جناب اس تحریر میں سے چند الفاظ حذف کرنا بہتر ہوگا۔ پوچھا کون سے الفاظ؟ میں نے کہا جناب ''بندر کے ہاتھ میں استرا لگ جانے کے مترادف'' بڑا سخت جملہ ہے۔ عارف کچھ دیر سوچتے رہے۔ اپنی تحریر پر نظر ثانی کی اور ببانگ دہل اعلان کردیا ''بالکل نہیں کوئی لفظ اس میں سے کم نہیں ہوگا۔ یہ تحریر جوں کی توں مکمل بغیر قطع وبرید کے شامل رہے گی۔ اگر آپ کو اعتراض ہے تو میں اسے واپس لیتا ہوں۔''

میں چپ ہورہا۔ عارف چلے گئے۔ بہت دیر تک سوچتا رہا کیا کیا جائے، اپنے دیگر دوستوں سے مشورہ کیا۔ سب نے کہا رہنے دو۔

اس طرح ''آئینہ معنی نما'' کے سرورق کے اندرونی صفحے پر عارف خورشید کی یہ تحریر شامل ہوئی۔ ''آئینہ معنی نما'' اردو دنیا میں سب سے زیادہ مقبول اور مشہور ہوئی۔ اس کتاب کی مقبولیت کا سہرا عارف خورشید کے سر باندھنے میں کیا حرج ہے۔

یوں ہماری دوستی کا سلسلہ روز وشب کے سرد وگرم کے ساتھ ساتھ جاری ہے۔

عارف خورشید کے ساتھ سفر کرنے میں لطف آتا ہے۔ سفر میں اخراجات کے معاملے میں وہ ''سولجر سسٹم'' کے قائل ہیں اور اس پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ یہاں یاد آرہا ہے حیدرآباد، گلبرگہ کا وہ یادگار سفر، میرے کرم فرما (مرحوم) مغنی تبسم نے مجھے اطلاع دی کہ وہ قاضی سلیم (مرحوم) کے شعری مجموعے

''رستگاری'' کی تقریب رسم اجراء حیدرآباد میں منعقد کرنے جارہے ہیں۔ میں نے یہ سن کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ اس سے پہلے ''شعر وحکمت'' کے ایک شمارے میں گوشۂ قاضی سلیم کے لیے میں نے قاضی سلیم کی متعدد تصاویر روانہ کی تھیں۔ مغنی تبسم صاحب نے ایک دن فون پر کہا کہ اس تقریب اجراء میں آپ تو مہمان خصوصی رہیں گے، دو ایک ادیبوں اور شاعروں کو بھی ساتھ لائیے کہ وہ قاضی سلیم پر اپنے مضامین پڑھیں۔ کتاب کا اجراء ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے ہاتھوں سے ہونے والا تھا۔ قاضی سلیم کے بچپن کے ہم جماعت پروفیسر تقی علی مرزا اور افسانہ نگار عبدالصمد بھی موجود رہیں گے۔ پروگرام کے دعوت نامے شائع کرنے ہیں اس لیے اس پروگرام میں کون کون شریک رہیں گے ان کے نام دینا ہے۔

خیر۔ اب سوچتا رہا کہ قاضی سلیم پر کون لکھے گا اور کیا لکھے گا اور کون میرے ساتھ حیدرآباد چلے گا۔ شاہ حسین نہری، ڈاکٹر سحر سعیدی اور عارف خورشید سے بات کی تو وہ تینوں رسم اجراء میں شرکت کے لیے تیار ہو گئے۔ اب مضامین لکھنے کی بات آئی۔ ڈاکٹر سحر سعیدی نے انکار کر دیا۔ عارف نے کہا وہ قاضی سلیم پر خاکہ لکھیں گے۔ شاہ حسین نہری نے کہا نثر سے میرا کوئی واسطہ نہیں میں کچھ نہیں لکھوں گا۔ صورتحال بے قابو۔ کسی نہ کسی طرح شاہ حسین نہری راضی ہوئے اور قاضی سلیم پر ایک بہت ہی جاندار اور شاندار مضمون بعنوان ''قاضی سلیم ایک فطرت یار شاعر'' لکھا۔

ہم چاروں پہنچے حیدرآباد۔ مغنی تبسم نے اردو ہال حمایت نگر میں ہماری رہائش کا بندوبست کیا تھا۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کے ''ایوان اردو'' میں ''رستگاری'' کی رسم اجراء مقرر تھی۔ دعوت نامے تقسیم ہو چکے تھے۔ حیدرآباد کے مقامی اخباروں میں جلسے کی خبر شائع ہوئی تھی۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ رسم اجراء عمل میں آئی۔ اس کے بعد شاہ حسین نہری نے اپنا پر مغز مضمون ''قاضی سلیم ایک فطرت یار شاعر'' پڑھا، جس میں قاضی سلیم کو ایک بالکل انوکھے زاویے سے پیش کیا گیا۔ یہ مضمون بہت پسند کیا گیا۔ اس کے بعد عارف خورشید نے قاضی سلیم پر لکھا اپنا معرکۃ الآراء خاکہ ''وقت کے چاک پر'' سنا کر داد وتحسین کے ڈونگرے بٹورے۔ حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں نے سب کو مبارکباد پیش کی۔

گلبرگہ کے دوست احباب کو جب ہم چاروں کے حیدرآباد میں ہونے کی خبریں پہنچیں تو اصرار ہوا کہ ہم ایک رات کے لیے گلبرگہ ضرور پہنچیں۔ عارف خورشید کے ایک برادر نسبتی نے نہ صرف یہ کہ ہمارے لیے ایک کار کا بندوبست کیا بلکہ خود ڈرائیور کی ذمے داری سنبھالی۔ سفر کے دوران عارف خورشید

اور ان کے برادر نسبتی کے درمیان حیدر آبادی لب ولہجہ میں جو نوک جھونک ہوتی رہی اس نے سفر کی صعوبتوں کو ہم سے دور رکھا۔ گلبر گہ کا سفر کامیاب رہا۔ وہاں ڈاکٹر حمید سہروردی کی مہمان نوازی سے شرف یاب ہوئے۔ رات میں مشاعرہ پڑھا اور دوسرے دن گلبر گہ کی چند تاریخی یادگاروں کو دیکھ کر حیدر آباد لوٹے۔ اس سفر کے دوران عارف خورشید نے ہم تینوں کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھا۔ چٹکلے بازی اور لطیفہ گوئی کا اچھا موقع عارف کے ہاتھ لگا۔

عارف کو تاریخ اور تاریخی مقامات سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ اس کے باوجود ایک پروگرام بنا کہ تاریخی شہر احمد نگر جائیں اور وہاں کی تاریخی عمارات اور قلعہ کی سیر کی جائے۔ عارف نے خود ہی اپنی کار ڈرائیو کی، یہ بھی ایک یادگار سفر رہا۔

چند برسوں سے ڈاکٹر سحر سعیدی نے ہمیں یعنی شاہ حسین نہری، عارف خورشید اور خاکسار کو پابند کیا کہ وقفے وقفے سے شہر سے باہر کسی پر فضا مقام پر دن گزارا جائے۔ اس طرح ہم چاروں یار مہینے، دو مہینے میں اتوار یا کسی اور مناسب دن، صبح صبح اپنے اپنے گھروں سے اپنے اپنے ٹفن لے کر نکل پڑتے ہیں، کبھی عارف خورشید کی کار کبھی مجھ خاکسار کی کار۔ یوں دن بھر تفریح رہتی ہے۔ عارف خورشید زندگی سے لطف و انبساط کشید کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ اس لیے زندہ دلی ان کی رگ رگ میں موجزن رہتی ہے۔ وجیٹیرین اور نان وجیٹیرین دونوں قسم کے لطیفے سناتے ہیں تو پورے بدن سے۔ یعنی ہاتھ، آنکھیں، چہرہ، لب، سب ایک ساتھ اس لطیفہ گوئی میں ان کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کے چہرے اور آنکھوں کی چمک دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

عارف خورشید ایک وہبی فنکار ہیں۔ نہایت اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ ایک دو ادبی انجمنیں بھی تیار رکھی ہیں۔ ہر اتوار کو ان کے مکان پر ادب نواز دوستوں کی محفل برپا ہوتی ہے اس محفل میں انہوں نے عالمگیر ادب کی داغ بیل رکھی۔ یہ بھی دلچسپ ہے۔ ہوا یوں کہ نورالحسنین کے صاحبزادے کی دعوت ولیمہ میں ہم لوگ مدعو تھے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد شاہ حسین نہری، عارف خورشید، سحر سعیدی، قاضی رئیس، ڈاکٹر عظیم راہی، ساحر کلیم اور خاکسار ایک ہوٹل میں چائے نوشی کے لیے پہنچے۔

عارف نے کہا کہ یہ رسالے والے گوشے نکال رہے ہیں اور ڈھیر سارا روپیہ طلب کرتے ہیں، اس کے باوجود قلمکار کا بھر پور تعارف نہیں ہوتا۔ عارف خورشید نے تجویز رکھی کہ کیوں نہ ہم بھی

ایک رسالہ شروع کریں تاکہ اورنگ آباد اور مراٹھواڑہ کے شاعروں اور ادیبوں پر گوشے شائع ہوں۔ اس کے بعد اس تجویز پر طویل گفتگو ہوئی۔ عارف کی تجویز قبول ہوئی۔ لائحہ عمل ترتیب دیا گیا۔ طے ہوا کہ ہم ایک کتابی سلسلہ شروع کریں گے جو کسی ایک شاعر، ادیب یا افسانہ نگار کی شخصیت اور فن پر محیط ہوگا۔ بسیار بحث و مباحثہ کے بعد کتابی سلسلے کا نام اتفاق رائے سے ''عالمگیر ادب'' پسند کیا گیا اور عالمگیر ادب کی پہلی کتاب خاکسار پر اور دوسری کتاب ڈاکٹر سحر سعیدی کے فن اور شخصیت پر آئی۔ ادبی دنیا نے ان دونوں کتابوں کی پذیرائی کی۔

عارف خورشید بے تکلف دوستوں کی مخصوص محفلوں میں بڑی والہانہ گفتگو کرتے ہیں۔ کبھی کبھی بازاری الفاظ، فقرہ اور لب و لہجہ ان کی شخصیت کے کچھ اور زاویے پیش کرتا ہے۔ اس وقت میں سوچتا ہوں کہ کیا یہ وہی شخص ہے جس کے افسانے، افسانچے اور شاعری فکری پختگی اور عصری آگہی کے ادراک اور فلسفیانہ موشگافیوں سے بھرپور قاری کو سوچ و فکر میں مبتلا کرتی رہتی ہیں۔ عارف کا مشاہدہ گہرا ہے، تجربات وسیع ہیں۔ اردو کے کلاسیکی ادب کا مطالعہ جاری ہے۔ جدید حسیت اور اظہار ذات کے نت نئے تجربوں سے سرشار ہیں۔ ان کے افسانے پڑھیے، خاکے پڑھیے، آپ کو ان کے کئی روپ اور رنگ نظر آئیں گے۔ ان کا اپنا ایک اسلوب ہے جو ہزاروں میں پہچانا جا سکتا ہے۔

دماغ میں تنوع پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی۔ جمعے کو شیروانی زیب تن کرتے ہیں۔ بیشمار ڈیزائنوں اور رنگوں کی ٹوپیاں ہیں۔ کچھ شرٹ پتلون، کبھی جینز اور ٹی شرٹ، کبھی کرتا پاجامہ۔ ایک مضطرب روح ہے۔ داخلی کشمکش سے لبریز، ایک کارخانہ چلایا، اس کے بعد بکریوں کا فارم شروع کیا پھر زمینات خریدیں اور پلاٹنگ کا کاروبار شروع کیا۔ ایک مدت تک قمر اقبال اور جاوید ناصر کے ہم پیالہ رہے، پھر تائب ہوگئے۔ ایک حقہ خریدا۔ مختلف اقسام کی خوشبو بھری تمباکو خریدی، یار دوستوں کے ساتھ حقہ نوشی کرتے رہے۔ شاہ حسین نہری نے اعتراض کیا تو یہ بند ہوا۔ گٹکے کا شوق پالا اب چھوڑ دیا۔ کبھی کبھی پان نوش جاں کرتے ہیں۔ بیوی اور بیٹوں اور پوتوں پوتیوں سے بے انتہا محبتیں کرتے ہیں۔ تصنع سے چاہے وہ زندگی کے کسی بھی شعبے میں اور کسی بھی مرد، عورت میں ہو بالکل پسند نہیں کرتے۔ عصری ماحول کی زہرناکی کے باوجود وہ انسان اور اس کے درخشاں مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔

شخصیت کی کئی تہیں ہیں۔ گہرائیاں اور گیرائیاں ہیں۔ انھیں ایک ایک کرکے اتارنا ہے۔ اس میں دیر لگے گی۔ فی الحال آج کی اس صحبت کے لیے یہ ٹوٹی پھوٹی تحریر مجھے بھلی لگ رہی ہے۔ ☆

جسم نگر کا افسانہ گر

اشتیاق سعید

۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا اور اس آزادی نے ہندوستان کو سوغات کی صورت تقسیم کا زخم دیا۔ اِس طرف کے لوگ اُس طرف جانے لگے اور اُس طرف کے لوگ اِس طرف آنے لگے۔ لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت گری اور آبروریزی کا بازار گرم ہوگیا۔ فضا میں ہر ہر مہادیو اور نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کی گونج تھی۔ باپ بیٹوں کو پکار رہے تھے، مائیں بیٹیوں کو آوازیں دے رہی تھیں اور بھائی گمشدہ بہنوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ غرض کہ لہو لہو کو پکار رہا تھا اور فسطائی طاقتیں مذہب و ملت کے نام پر خون کی ہولی کھیلنے میں مصروفِ عمل تھیں۔ ایسے ہی پُر آشوب ماحول میں ریاست مہاراشٹر کے تاریخی شہر اورنگ آباد کے ایک پٹھان خانوادے میں مصطفیٰ علی خان کے یہاں یکم دسمبر ۱۹۵۰ء کو عارف علی خان کی ولادت ہوئی۔ عارف جوں جوں ہوشمندی کی جانب قدم بڑھاتے گئے دادی اور نانی اماں کی آغوشوں نے انھیں عصری کہانیوں سے محظوظ کرانا شروع کر دیا۔ کہانیاں ان کے ذہن کی کوری تختی پر یوں نقش ہوتی گئیں جیسے اجنتا اور ایلورہ کی گپھاؤں میں مورتیاں نقش ہیں۔ بہرکیف! اورنگ آباد کی کچی پکی سڑکوں، گلیوں اور محلوں میں گرتے پڑتے، کھیلتے کودتے ابتدائی تعلیم سے گزر کر ثانوی تعلیم کی جانب پیشقدمی کرتے ہوئے حیرت انگیز طور پر عارف، بچپن میں سنی کہانیوں کے تانے بانے میں الجھنے لگے۔ یہ الجھنیں ایسی تھیں جو سلجھائے نہ سلجھتی تھیں، حتیٰ کہ دور دور تک اِن الجھنوں کا کوئی مداوا دکھائی نہ پڑتا تھا۔ تاہم وہ اس خلجان کو اپنے بطون میں دبائے بڑی ہی مستعدی سے اپنے تعلیمی سفر پر گامزن رہے۔ بعد ازاں اردو سے ایم اے کیا پھر بی پی ایڈ کیا۔ ۱۹۷۲ء میں بحیثیت مدرس ملازمت سے وابستہ ہوئے۔ ملازمت نے انھیں ذہنی آسودگی فراہم کی۔ رفتہ رفتہ حسِ مشترک متحرک ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے قلم سے ایک افسانہ ''اسپیشل مزار'' سرزد ہوگیا جو اسی سال کے کالج میگزین میں بڑے ہی اہتمام کے ساتھ عارف علی خان کی بجائے عارف خورشید کے نام سے شائع ہوا۔ افسانہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ اربابِ علم و ادب نے بھی پذیرائی کی۔ اسی کے ساتھ عارف کو ذہنی میلان اور طبیعت

کی جولانی میں خاطر خواہ ٹھیراؤ محسوس ہوا، نیز الجھنیں ایسے سلجھنے لگیں جیسے کبھی الجھی ہی نہ تھیں۔

اردو ادب میں ۱۹۷۰ء کی دہائی ترقی پسند اور جدیدیت دونوں کے عروج و زوال کی دہائی مانی جاتی ہے۔ جہاں ایک طرف ترقی پسند ادب مارکسی رجحان کی پیروی کرتے کرتے اوب چکا تھا تو دوسری طرف جدیدیت مبہم اور چیستانی ادب کی تشہیر میں سرگرداں ادیبوں اور شاعروں کے فکر وفن پر شب خون مار رہا تھا اور یہی وہ زمانہ ہے جب ادب سے قاری آہستہ آہستہ دور ہونے لگا تھا۔ ادبی اور تہذیبی قدریں انحطاط کی طرف بڑھنے لگی تھیں۔ عارف نے اِن رجحانات کا کتنا اثر قبول کیا اس کا مجھے قطعی علم نہیں اور انھوں نے دوسرا افسانہ کب تحریر کیا اس سے بھی میں لاعلم ہوں، البتہ یہ ضرور جانتا ہوں کہ اِن کا پہلا شعری مجموعہ ''ٹوٹا ہوا آئینہ'' ۱۹۸۵ء میں منصۂ شہود پر آیا اور جہانِ ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ غالباً اس اعتبار سے انھیں سن ستر نہیں بلکہ سن اسّی کے قلمکاروں کی فہرست میں گردانا جاتا ہے۔

کہتے ہیں ہر قلمکار کی ابتدا شاعری ہی سے ہوتی ہے۔ قلمکار پہلے پہل یوں ہی سال دو سال ٹوٹے پھوٹے خارج البحر شعر کہتا ہے یا تک بندی کرتا ہے پھر بحور اور اوزان سے نجات پانے کی خاطر خاموشی سے نثر کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے اور افسانہ، ناول، ڈرامہ یا مضامین کی تخلیق میں پناہ لیتا ہے لیکن اس کے برخلاف عارف خورشید نے ابتدا تو افسانہ نویسی سے کی لیکن پناہ شاعری میں لی۔ ان کے اب تک دو شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں ایک تو اول الذکر اور دوسرا ''دھول کی شال'' ہے۔ باوجود اس کے ادبی دنیا میں بحیثیت افسانہ نگار کے شناخت قائم و دوائم ہے۔

عارف خورشید کے اب تک کل نصف درجن افسانوں کے مجموعے منظر عام پر آکر داد و تحسین پا چکے ہیں۔ جن کے عنوانات ذیل ہیں۔

(۱) سنہری رُت کا فریب (۲) یادوں کا سائبان (۳) آتشیں لمحوں میں (۴) احساس کا زخمی مجسمہ (۵) قافلے والو سچ کہنا (۶) وقت کے چاک پر، علاوہ ازیں ''لہولہو آرزو'' ناولٹ ''اور کچھ بھی نہیں کہانی میں'' افسانچے ''تنظیم کثیر رنگی'' خاکے ''رنگِ امتزاج'' تبصرے اور خاکے ''سوچ کے جزیرے'' ثلاثیاں اور غزلیں، اس طرح کل تیرہ کتابوں کے خالق ہیں۔

عارف خورشید سے میری پہلی ملاقات بیسویں صدی کے اواخر میں معروف افسانہ نگار صحافی م۔ناگ کے توسط سے مکتبہ جامعہ ممبئی میں ہوئی تھی۔ اگرچہ میری ان سے شخصی طور پر پہلی ملاقات تھی

لیکن ان کی تحریروں کے توسط سے میری آشنائی پانچ سات سال قبل ہی سے تھی۔غرض کہ ان سے ملنے کے بعد میری خوشی دوچند ہوگئی اور میں تادیر اِن کی شباہت ، اِن کی گفتار اور کیری کچر میں اُن کرداروں کو تلاش کرتا رہا تھا جنھیں انھوں نے اپنے افسانوں میں تخلیق کیا ہے۔ پھر مکتبہ جامعہ کے قریب ہی واقع کیف الماس میں بیٹھ کر میں اورم ناگ چائے کی چسکیوں کے دوران اِن کی پر کیف اور پر مغز باتوں سے محظوظ ہوتے رہے تھے۔وہ غالباً گھنٹہ بھر ہم لوگوں کے ساتھ رہے تھے۔اس ایک گھنٹہ میں مجھ سے اس قدر گھل مل گئے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ دوسری ملاقات ابھی کوئی سال بھر پہلے اورنگ آباد میں اِن ہی کے دولت کدے پر ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ میں رمضان علی سحؔر کے ہمراہ اُن کے کسی کام سے ممبئی سے اورنگ آباد گیا تھا،اورنگ آباد میں عارف خورشید کے علاوہ نورالحسنین اور عظیم راہی سے بھی میرے گہرے مراسم تھے لیکن موبائیل نمبر صرف عظیم راہی کا تھا وہ بھی اس لیے کہ وہ پانچ چھ ماہ قبل ممبئی آئے تھے اور اتفاقاً مجھ سے ملاقات ہوگئی تھی۔ بہرحال میں نے عظیم راہی کو فون کیا اور بتایا کہ میں روشن گیٹ پر موجود ہوں، عظیم راہی سن کر بہت خوش ہوئے اور دس منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ میں نے عظیم بھائی سے عارف خورشید اور نورالحسنین صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ عظیم راہی نے کہا میں نے عارف بھائی کو تمھارے آنے کی اطلاع دے دی ہے، ہم عارف بھائی کے یہاں چلیں گے وہاں سبھی لوگوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ واقعی جب ہم عارف خورشید کے دولت کدے پر پہنچے تو وہاں شاہ حسین نہری صاحب کے علاوہ دو بزرگ شعرائے کرام موجود تھے جن کے اسمائے گرامی میرے ذہن میں محفوظ نہیں رہے۔ ہم ابھی حال احوال اور ایک دوسرے سے متعارف ہو ہی رہے تھے کہ نورالحسنین صاحب بھی آگئے۔ پھر چائے ناشتہ کے دوران ہمارے اعزاز میں اچھی خاصی نشست منعقد ہوگئی۔

شگفتہ مزاج، نرم گفتار، نیک طینت، انانیت اور تکبر سے کوسوں دور اپنے چھوٹوں سے شفقت اور محبت سے پیش آنے والے عارف خورشید حالات کی مٹی کو آرزوؤں کے پانی میں گوندھ کر پہلے تو لونڈا بناتے ہیں پھر اسے وقت کے چاک پر چڑھا کر حسب منشا افسانے، خاکے یا غزلوں کے پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔ نقادانِ علم وادب کا عارف خورشید پر سنگین الزام ہے کہ وہ جنس زدگی کے شکار ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں کا تانا بانا جنسیت کے کرگھے پر بنا گیا ہے۔ سچ ہے یہ! اور پھر کیوں نہ ہو؟ جب خدائے برتر و بالا نے اس کائنات کو سب سے حسین اور تلذذ آمیز شئے ''مادہ'' یعنی عورت ودیعت کی

ہے اور ''نر'' یعنی مرد شہواتِ نفسانی کی سوغات سے نوازا ہے۔ کیونکہ خالق کائنات کو دنیا کا یہ کارخانہ بھی تو چلانا ہے۔ عارف خورشید نے اپنے افسانوں میں اس بات کی وضاحت بڑی خوش اسلوبی سے کی ہے۔

> ''تم کو معلوم ہے اس دنیا میں سب سے خوبصورت چیز کیا ہے، مرد کے لیے عورت اور عورت کے لیے مرد کا جسم'' (داستان مرکب ہے)

> ''تم خوبصورت ہو۔ مرد خوبصورت ہوتا ہے۔ مرد اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے عورت کو رجھاتا ہے۔ عورت کی بھی اپنی خواہش ہوتی ہے۔ یہ نظام قدرت ہے ورنہ افزائش نسل کا سلسلہ کس طرح چل پاتا۔'' (بے آواز شہادت)

یہی سبب ہے جو جنسیت سے محظوظ ہونے والے قاری افسانے اور شاعری کے علاوہ مذہبی صحیفوں میں بھی جنسیت کی پناہ گاہیں تلاش کرنے سے باز نہیں آتے۔ ایسے قارئین کی جنسی تسکین کا سامان اگر عارف خورشید اپنے افسانوں میں فراہم کرتے ہیں تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کے افسانوں میں جنسیت شہوت انگیز یا جذبات کو برانگیختہ نہیں کرتی بلکہ نفسانی سربستہ راز کو مرد و زن پر منکشف کرتی ہے۔ یہی سبب ہے جو میں عارف خورشید کو جسم نگر کا افسانہ گر تصور کرتا ہوں اور ان کی افسانہ گری سے گاہے گاہے خود بھی استفادہ کرتا رہتا ہوں۔

☆☆☆

اردو ادب کا ایک معتبر نام

افسر علی

بابائے افسانہ منشی پریم چند، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، مسیح الحسن رضوی، رام لال، بشیشر پردیپ وغیرہ کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کی عظمت، وسعت اور وقار میں اپنے فکر وفن اور احساسات اور جذبات سے جو قابل قدر اضافہ کیا ان میں ایک معتبر نام عارف خورشید کا بھی ہے۔

نوائے دکن پبلیکیشنز کے روح رواں عارف خورشید جن کا مسکن ''بیت العنکبوت'' مجنوں ہلز، رشید پورہ، اورنگ آباد دکن ہے، کے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے ہوا۔ ۱۹۸۵ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''ٹوٹا ہوا آئینہ'' منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد ''دھول کی شال''، ''سوچ کے جزیرے'' اور ''لمحوں کی صلیب'' شائع ہوئے جو عارف خورشید کی شعری صلاحیتوں کا لوہا منواتے رہے اور داد و تحسین حاصل کرتے رہے۔ جہاں ایک طرف عارف خورشید غزل کے گیسو سنوارتے ہوئے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف اپنی نثری کاوشوں کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے مختلف نثری اصنافِ ادب میں طبع آزمائی کی افسانے، ناول، خاکے اور افسانچوں کو اپنا مرکز و محور بنا کر قارئین کے سامنے پیش کیا۔ ان کے افسانوی مجموعے ''سنہری رُت کا فریب''، ''یادوں کا سائباں''، ''آتشیں لمحوں میں''، ''احساس کا زخمی مجسمہ''، ''قافلے والو سچ کہنا''، ''اور کچھ بھی نہیں کہانی میں'' اور ''وقت کے چاک پر'' وغیرہ کو بہت مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔ ''لہو لہو آرزو'' جیسا ناولٹ لکھ کر ناول نگاری کو عروج بخشا۔ ''تنظیم کثیر رنگی'' اور ''رنگ امتزاج'' وغیرہ خاکوں کے مجموعے ہیں جو بے حد پسند کیے گئے۔

اردو افسانہ نگاری میں عارف خورشید کی شخصیت نہایت منفرد اور ممتاز نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی کے درد و کرب کی بے پناہ وسعتیں نمایاں کرنے کی کامیاب ترین

کوشش کی ہے۔انسانی احساسات کی منظرکشی جس انداز میں آپ کے یہاں ملتی ہے وہ یہ اشارہ کرتی ہے کہ عارف خورشید داخلی احساسات اور جذبات کے فطری تقاضوں کو پورا کرتے ہیں ''وقت کے چاک پر'' کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں:

''گزشتہ چند برسوں میں قلم کی آنکھ میں جو آنسو آئے وہ قرطاس کی مژگاں پر کب تک رکے رہتے۔ضبط کا دامن چھُوٹا تو صحیفے کی صورت گری ہوئی اور وقت کے چاک پر گردش کرتے لمحے قید ہوگئے۔''

عارف خورشید کے افسانوں میں کردار نگاری کا اعلیٰ میعار بھی انفرادیت کی دلیل ہے۔ کردارنگاری افسانے کے عناصر ترکیبی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔پلاٹ واقعات سے ترتیب پاتا ہے اور واقعات کرداروں کی بدولت ہی دلپذیر ہوتے ہیں۔بہرحال کردار افسانے میں بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔عارف خورشید کے افسانوں میں سارے کردار انسان کی فطری صفات کے حامل ہیں۔انھوں نے کردار کے خصائل، جذبات واحساسات وسکنات اور اعمال وافعال کو بالکل فطری انداز میں پیش کیا ہے۔''سات چاند'' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''شادی کو ایک ماہ کا عرصہ بھی نہیں ہوا تھا۔ابھی تو ذہن پر عورت ہی سوار تھی۔اسے عورت کے سراپا میں سات چاند نظر آتے۔ جیسے چاند دوپٹہ اوڑھے افق سے طلوع ہورہا ہو۔ چہرے پر دو چاند چمک رہے ہوں۔ چوٹی میں پروئے ہوئے دو چاند دمک رہے ہوں۔ سینے میں دو چاند استادہ ہوں۔چوٹی کا سرا دو چاند پر ٹکا ہوا ہو۔چال جیسے پاؤں میں چاند آرہے ہوں۔اس لیے سنبھل سنبھل کر ہر قدم رکھ رہی ہو۔''

عارف خورشید کی انفرادیت کا راز اس بات میں بھی پوشیدہ ہے کہ انھوں نے اردو افسانے کو ایک نئی جہت دی۔ اسلوب اور ہیئت میں نئے تجربے کیے۔ ان کے افسانوں میں سماجی، سیاسی، معاشرتی مسائل اور حیات وکائنات کے درد وداغ اور جستجو وآرزو کو بڑے خلوص، سادگی اور سچائی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ان کے افسانے موضوعات اور عنوانات کے اعتبار سے نادر اور جدید ہیں۔ افسانہ ''بے آواز شہادت'' میں محبت کے احساسات اور جذبات کا حسین امتزاج ہے جو افسانہ کی فکر وفن

کی بلندی پر نظر آتا ہے۔ ابتدا سے انتہا تک قاری پوری طرح اس میں Envolve ہو جاتا ہے۔

''بے آواز شہادت'' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اس نے بہت دکھ بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا صدیوں کی محبت میں برسوں کا فراق اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر رشتے آسمان پر طے ہوتے ہیں تو یہ بے جوڑ کیسے ہو جاتے ہیں۔ اور جوڑی تو دو کو کہتے ہیں۔ پھر ایک کے ساتھ ایک سے زیادہ ہوں تو جوڑی کیسے ہوگی کچھ بھی ہو۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ جس دن آدمؑ نے حواؑ کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا اسی دن محبت کی ابتدا ہوئی تھی۔ وہیں سے محبت کے نور کا دریا پھوٹا تھا۔ جو ازل کی وادیوں سے نکل کر ابد کی راہوں میں بہہ رہا ہے۔''

حلقۂ عارف خورشید کا احاطہ کرنا یوں تو بہت مشکل ہے مگر ان کے مخلص معاصرین میں قاضی سلیم، نورالحسنین، جاوید ناصر، بشر نواز، شاہ حسین نہری، وجاہت قریشی، فاروق شمیم، حمید سہروردی، قمر اقبال اور رشید انور کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

الفاظ کی مٹی سے زندہ رہنے والے کردار تخلیق کرنے والے عارف خورشید نے اپنی فنی کاوشوں سے جو عکس قارئین کے ذہن و دل پر نقش کیا ہے وہ بہت پُر اثر ہے۔ ان کے کئی افسانے ایسے ہیں جو مدتوں عارف خورشید کو چمکنے کا موقع عطا کرتے رہیں گے۔

☆☆☆

عارف خورشید۔فن اور شخصیت

الیاس فرحت

عارف خورشید بحیثیت ایک ادیب کے کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں ۔ وہ ایک اچھے افسانہ نگار تو ہیں ہی ساتھ ہی ، ساتھ ایک اچھے شاعر ، ناول نگار ، افسانوں اور افسانچوں کے مرتب ، خاکہ نگار اور مبصر بھی ہیں ۔ان کی کئی کتابیں نظم اور نثر پر شائع ہو چکی ہیں اور قارئین سے داد بھی حاصل کر چکی ہیں ، پھر بھی میں سمجھتا ہوں وہ ادبی دنیا میں ملک گیر پیمانے پر وہ مقام حاصل نہیں کر سکے جس کے وہ واقعی حق دار ہیں اور ان کا نام کسی مقالے یا تنقید میں میری نظر سے نہیں گزرا۔اس کی وجہ میں سمجھتا ہوں یا تو وہ ادبی گروہ بندی کے شکار ہو گئے یا ہمارے نقاد جان بوجھ کر ان کی قابلیتوں کو نظر انداز کر رہے ہیں ، جیسا کہ اکثر ادیبوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔مقامی طور پر اور ریاستی سطح پر وہ کافی مشہور اور مقبول ہیں۔ ریاست سے ہٹ کر ان کے افسانے ''ایوان اردو'' میں پڑھنے کو ملے اور بھی کہیں شائع ہوئے ہوں تو وہ میری نظر سے نہیں گزرے۔

ان کے افسانے پڑھنے کے لائق ہوتے ہیں ۔ان کے افسانوں میں ان کا رجحان زیادہ تر جنس کی طرف ہوتا ہے وہ اپنے اطراف کے ماحول سے اپنے افسانوں کے لیے کافی اچھا مواد حاصل کر لیتے ہیں ، اور یہ ایک بڑی خوبی کی بات ہے۔ شاعری کے تعلق سے چونکہ مجھے اس کے عروض سے چنداں واقفیت نہیں ہے اس لیے اس تعلق سے میں کچھ نہیں لکھ سکتا البتہ جہاں تک ان کی نثر نگاری کا تعلق ہے یہ ضرور کہوں گا کہ ان کا شمار بہتر اور قابل قدر قلم کاروں میں کیا جانا چاہیے۔انھوں نے اردو ادب کو کئی کتابیں دی ہیں جن میں ان کی صلاحیتوں کی پذیرائی بھی کی گئی ہے ۔ ان کا قاری افسانہ ''دل ہوا ہے چراغ'' اشاعت ''ایوان اردو'' دہلی مارچ ۲۰۱۱ء ایک نئی تکنیک پر مبنی ہے اور مختصر مختصر جملوں میں علیحدہ علیحدہ طور پر بڑی خوبصورت اور دل کو چھو دینے والی باتیں تخیل کا سہارا لے کر کہی گئی ہیں ، جن سے ان کا افسانوں کے فن پر دسترس کا احساس ہوتا ہے۔ان کو خاکہ نگاری میں کمال بھی حاصل

ہے۔ اب تک انھوں نے جتنے بھی خاکے لکھے ہیں خاص طور سے مرحوم قاضی سلیم پر، حمید سہروردی پر، رشید انور پر اور مرحوم جاوید ناصر پر بہت خوب ہیں لیکن یہاں مجھے ایک بات بار بار کھٹک رہی ہے کہ جاوید ناصر کے خاکے میں انھوں نے ان کی اہلیہ کا نام جس بے تکلفی سے لیا ہے وہ قابلِ تعریف نہیں۔ وہ ان کی اہلیہ کو ڈاکٹر (اور اگر وہ اس وقت ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہیں حاصل کرسکیں تھیں) تو بیگم جاوید ناصر لکھ سکتے تھے۔ خیر یہ میری اپنی سوچ کا نتیجہ ہے۔ ان کے افسانے قابل تحسین ہیں۔ اس فن میں ان کو مہارت حاصل ہے اور وہ آج کے بہت اچھے افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاسکتے ہیں_____ شخصیت ان کی بہت پیاری ہے اگر چہ کہ میری ان سے چند ہی ملاقاتیں ہوئی ہیں مگر میں نے پایا کہ وہ ایک مخلص انسان ہیں اور ایک درد بھرا دل رکھتے ہیں، جس کی جھلکیاں ان کے افسانوں میں مل جاتی ہیں۔ اپنے ہم خیالوں کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں۔ ان کے اطراف ان کے مداحوں کا ہمیشہ گھیرا رہتا ہے۔ وہ ایک صاف گو انسان ہیں اور لاگ لپیٹ کی باتوں سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ میں ان کی قدر کرتا ہوں نا صرف ایک ادیب ہونے کے ناطے بلکہ ایک ان کے خلوص کی خاطر بھی۔ میری دعا ہے کہ وہ اردو ادب میں خوب نام کمائیں اور شہرت کی ان بلندیوں کو چھوئیں جن کو یا جن سے اورنگ آباد دکن کا نام اردو ادب کی دنیا میں رہتی دنیا تک قائم رہے گا، روشن رہے گا۔

☆☆☆

عارف خورشید اور فن افسانچہ نگاری

ایم مبین

عارف خورشید ایک ہمہ جہت قلم کار ہیں۔ وہ نثر اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں، منی افسانے یا افسانچہ بھی لکھے ہیں، خاکے بھی، شاعری بھی کی ہے۔ ان کے افسانوں، منی افسانوں اور شعری تخلیقات کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

عارف خورشید کا تعلق درس و تدریس سے رہا ہے اس لیے وہ زبان کے تمام رموز و نکات بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ زبان کی باریکیوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور کبھی کبھی بے خیالی میں شعرا و ادبا سے الفاظ کی سحر کاری میں جو غلطیاں ہو جاتی ہیں بھلے ہی وہ ماہر سے ماہر زبان داں نہ سمجھ سکے لیکن وہ عارف خورشید کی نظروں سے نہیں بچ سکتیں۔

زبان کی صحت کا خیال رکھنا ان کا پہلا اصول ہے۔ ان کی نظر نہ صرف عصری اردو ادب پر ہے بلکہ ہمارے کلاسیکی ادب کا بھی انھوں نے گہرا مطالعہ کیا ہے، جس کی وجہ سے ان کا ادبی ذوق ایک عام قلم کار کی ذہنی سطح سے بالاتر ہے۔ جس شخص میں اتنی صلاحیتیں ہوں اگر وہ ادب کی تخلیق کرے تو اس کے تخلیق کردہ فن پاروں کا کیا معیار ہو سکتا ہے، انھی باتوں سے ہر کوئی بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے۔

اس طرح ان کے نزدیک ادب نہ صرف ان کے احساسات و جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہے بلکہ ایک ریاض بھی ہے ان کے ادبی سرمایہ پر اگر ہم نظر ڈالیں تو ہمیں محسوس ہوگا یہ شخص ادب کے تئیں کتنا Committed ہے۔ اس لیے تو گزشتہ تین دہائیوں سے مضامین کے انبار لگا رہا ہے۔ اپنے احساسات کے اعتبار کے لیے عارف خورشید نے کبھی بھی خود کو ادب کی کسی ایک صنف میں مقید نہیں کیا ہے۔

ادب کی تمام اصناف پر ان کی دسترس ہے اور وہ ادب کی تمام اصناف کے رموز و نکات سے اچھی طرح واقف ہیں اس لیے وہ اپنے کسی احساس کا موثر ڈھنگ سے کسی بھی صنف کے ذریعے اظہار

کر سکتے ہیں۔ پھر وہ چاہے شاعری ہو، افسانہ ہو، منی افسانہ ہو یا پھر ناول ہو۔

جس صنف میں مؤثر ڈھنگ سے وہ اپنے احساسات، جذبات اور افکار کا اظہار کر سکتے ہیں اس صنف کا انتخاب کرنے کے بعد جب وہ کاغذ پر الفاظ کے موتی بکھیر تے ہیں تو جو فن پارہ وجود میں آتا ہے وہ عارف خورشید کی ادبی علمی اہمیت کا نہ صرف احساس دلاتا ہے بلکہ قارئین کو نہ صرف چونکا دیتا ہے بلکہ بہت کچھ سوچنے پر بھی مجبور کرتا ہے۔

افسانچہ ایک ایسی صنف ہے جو دراصل کسی اچھے خیال کو پیش کرنے کا نہ صرف ایک مؤثر ذریعہ ہے بلکہ کبھی کبھی ایک چھوٹا افسانچہ، منی افسانہ بھی قارئین کے ذہن پر ایسے دیرپا نقوش چھوڑ جاتا ہے جو دس صفحات کا بہترین افسانہ بھی نہیں چھوڑ پاتا ہے۔

مرہٹواڑہ کی سرزمین افسانچہ نگاری کے لیے کافی زرخیز ہے۔ ماضی میں مرٹھواڑہ میں افسانچہ نگاری کی ایک مستحکم روایت رہی ہے جس کو استحکام دینے میں عارف خورشید کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔

ابتدا میں انھوں نے تواتر سے افسانچے لکھے اور ان کے منی افسانوں کے کئی مجموعے شائع بھی ہوئے جس کی وجہ سے اس صنف مین ان کی شناخت بن گئی ہے بلکہ منی افسانہ میں عارف خورشید نے جو خدمات انجام دی ہیں اس کے نتیجے میں اب صورت حال یہ ہے کہ جب بھی منی افسانے کا ذکر ہوگا ہر کسی کو صدق دل سے عارف خورشید کی افسانچہ کی خدمات کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

ان کی نئی کتاب ''وقت کے چاک پر'' میں بھی افسانچے شامل ہیں۔

ان افسانچوں کا تنقیدی نظر سے اگر مطالعہ کیا جائے تو ہمیں ان میں نہ صرف عارف خورشید کے فکری سرمایہ کے احساس کا لمس محسوس ہوتا ہے بلکہ افسانچہ کی تکنیک زبان و بیان کے نکات کی جھلکیاں بھی دیکھنے ملتی ہیں۔

عارف خورشید کے افسانچوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں افسانچہ نگار کا عمل ایک لاشعوری عمل ہے اور وہ جو بھی افسانچہ لکھتے ہیں ان میں شعور کا دخل کم اور لاشعور کا دخل زیادہ ہوتا ہے۔

جبکہ ہر کوئی جانتا ہے، بھلے ہی افسانہ لکھنا ایک لاشعوری فعل ہو سکتا ہے لیکن افسانچہ لکھنے میں شعور کا عمل دخل ضرور ہوتا ہے، کیوں کہ کسی خیال کو افسانہ میں بھی پیش کرنا ہوتا ہے اور افسانچے میں

بھی۔ افسانے میں اس خیال کو پیش کرنے کے لیے افسانہ نگار پر کسی قسم کی قید نہیں ہوتی ہے۔ وہ لاشعور کی رو میں افسانہ آٹھ دس صفحات یا اس سے زائد صفحات پر بھی تحریر کرسکتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس خیال کو کسی منی افسانے یا افسانچے میں پرونا چاہے تو یہاں اس کا عمل فطری طور پر شعوری ہو جاتا ہے کیونکہ یہاں اس کے اوپر سب سے پہلی قید یہ ہوتی ہے کہ افسانچہ ایک صفحہ سے زیادہ طویل نہ ہو۔ اس لیے وہ لاشعوری طور پر افسانچہ لکھنے کا عمل کر ہی نہیں سکتا۔ اس عمل میں شعور کا عمل دخل بڑھ جاتا ہے۔ اسے افسانچہ لکھنے کے لیے ایک منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے، کس طرح افسانچہ شروع کیا جائے۔ کس طرح آگے بڑھایا جائے، کس طرح اسے ختم کیا جائے۔ کن الفاظ اور جملوں کا استعمال کیا جائے۔ کن الفاظ کا استعمال کر کے افسانچہ کے خیال کو موثر ڈھنگ سے پیش کیا جاسکتا ہے یا اس میں کاٹ پیدا کی جاسکتی ہے۔ لیکن عارف خورشید کے بیشتر افسانچوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ان افسانچوں کو لکھنے میں کہیں بھی کوئی شعوری عمل یا منصوبہ بندی دکھائی نہیں دیتی ہے۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے یہ افسانچہ لاشعوری عمل کا نتیجہ ہے۔ کہیں کہیں عارف خورشید نے بڑی خوبی سے پانچ سات سطور میں اپنا خیال پیش کر دیا ہے تو کہیں کہیں ان کی طوالت ایک صفحہ کی ہوگئی ہے۔

جیسے کہیں کہیں انھوں نے صرف ایک شعر میں اپنا خیال پرو کر پیش کر دیا اور کہیں کہیں اس خیال کو موثر اور وقیع انداز میں پیش کرنے کے لیے انھیں یک مصرعی نظم کی ضرورت پیش آئی ہے اور اس کے ذریعے انھوں نے افسانچہ لکھا ہے۔

کہیں کہیں عارف خورشید نے بڑے سیدھے سادھے انداز میں اپنی بات پیش کر دی ہے تو کہیں کہیں انھوں نے نہ صرف شگفتہ زبان، الفاظ کی سحر کاری کا سہارا لیا ہے بلکہ تمثیلوں اور علامتوں کا بھی سہارا لیا ہے۔

کہیں کہیں تو یہ علامتیں قارئین کو واضح طور پر نظر آجاتی ہیں تو کہیں کافی غور وخوض کے بعد ان علامتوں اور تمثیلوں پر جمی دھول مٹی کی تہہ ہٹتی ہے تب قارئین ان کو سمجھ پاتے ہیں۔

عارف خورشید نے اپنے افسانچوں کے ذریعے اپنے دلی جذبات کو قارئین کے سامنے رکھا ہے۔ انھوں نے قارئین کو چونکانے کی قطعی کوشش نہیں کی ہے۔ انھوں نے قارئین کو چونکانے کے بجائے بار بار سوچنے کے لیے مجبور کیا ہے اور وہ اپنے اس عمل میں کامیاب رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے

افسانچوں کے لیے ہماری زندگی سے وابستہ اور ہمارے اطراف میں رونما ہونے والے واقعات کو موضوع بنایا ہے۔

کہیں کہیں واقعے کے رونما ہونے کے بعد ان پر جو کیفیت طاری ہوئی اس کیفیت کو انھوں نے افسانچے میں پیش کر دیا۔ انھوں نے کہیں بھی خود کو کوئی مصلح اور مبلغ بنانے کی کوشش نہیں کی ہے اور نہ اصلاح اور تبلیغ کی دو دھاری تلوار سے قارئین پر وار کر کے ان کو زخمی کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ انھوں نے ''جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے'' کا رول ادا کیا ہے اور اس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا ہے۔ عارف خورشید نے اپنے افسانچے 'چلہ' میں جو بات پیش کی ہے ان کے کئی افسانچوں کا یہ محبوب موضوع ہے۔ وہ آج کے انسانوں کے قول وفعل میں قرار، تضاد، ان کے ظاہر و باطن کا فرق اور خاص طور پر انھوں نے مذہب کا لبادہ اوڑھ کر مذہب کے بنائے اصولوں کے خلاف کام کرنے والوں کو بے نقاب کیا ہے۔

ان کا افسانچہ 'قائد ملت' زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ ہمارے دور کا المیہ ہے۔ دوا کا ایک ایسا کڑوا گھونٹ ہے جسے نہ چاہ کر بھی آج کا ہر انسان پینے پر مجبور ہے۔ ایک بھیانک سچائی ہے۔ تو حساس دل والے انسانوں پر ایک وار بھی ہے۔

'شاعر تمام' ہمارے آج کے شعرا کی زندگی کی ایک ہلکی سی جھلک ہے بھلے ہی یہ ایک عام سا تجربہ نہ ہو کوئی خاص ہی تجربہ ہوگا۔ لیکن پھر بھی عارف خورشید نے ایک تلخ سچائی کو پیش کیا ہے۔ ان کا ایک افسانچہ ہے 'میوٹ' دو سطروں میں مکمل ہونے والا ایک افسانچہ ہے یا اگر ہم اسے یک سطری کہانی بھی کہیں تو بے جا نہیں ہوگا۔ لیکن اس ایک یا دو سطری منی افسانہ، افسانچہ یا یک سطری کہانی میں اتنی گہری معنویت ہے کہ اگر ہم اس معنویت کے بارے میں لکھیں تو کئی صفحات درکار ہوں گے۔

ٹی وی کو ریموٹ سے کنٹرول کیا جاتا ہے اور اس میں ایک بٹن ہوتا ہے 'میوٹ' اس سے تو ہر کوئی واقف ہے۔ لیکن اس افسانچے میں اس لفظ 'میوٹ' کا عارف خورشید نے ایک علامت کی طور پر استعمال کیا ہے اور اس علامت کے ہر زاویہ اور ہر نظریہ سے ہم ایک الگ معنی نکال سکتے ہیں۔

میوٹ کا بٹن کبھی استحصال کی علامت محسوس ہوتا ہے تو کبھی یہ انسانی فطرت کی تاریکیوں کو عیاں کرنے والی علامت محسوس ہوتا ہے اور خاص طور پر عارف خورشید نے اس افسانچہ میں اذان کی

آواز پر میوٹ کا بٹن دبانے کی جو بات پیش کی ہے وہ ہماری زندگی کے ظاہر و باطن کو عیاں کرتا ہے اور ہماری سوچوں اور جذبات کو بے نقاب کر کے رکھ دیتا ہے۔

اسی طرح انھوں نے دوران حمل جنس کا پتہ لگانے کے بہت بڑے موضوع کو اپنے افسانچے میں صرف دو سطروں میں پیش کر دیا ہے اور ان دو سطروں میں انھوں نے کئی صدیوں کو سمیٹ لیا ہے۔ جاہل قومیں اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتی تھیں اور آج ہم اس کا پتہ لگا کر اس سے سبک بار ہو جاتے ہیں۔

عارف خورشید کے افسانچوں کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے افسانچہ کی تنگی دامن کا اچھی طرح خیال رکھتے ہوئے بہت بڑے بڑے موضوعات کو اپنے افسانچوں کا موضوع نہیں بنایا ہے۔ بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں اور ہماری عصری زندگی سے جڑی باتیں ہمارے اطراف میں پیش آنے والے واقعات، ہمارے معاشرے کا حصہ بن گئی رسوم وغیرہ کو اپنے افسانچوں کا موضوع بنایا ہے۔اس لیے ان افسانچوں کے پلاٹ، واقعات ہمیں اجنبی محسوس نہیں ہوتے ہیں۔

لیکن ان چھوٹے چھوٹے موضوعات کو بھی افسانچے میں پیش کرتے ہوئے عارف خورشید نے اپنے قلم کی کاٹ کا بھرپور استعمال کیا ہے اور ان موضوعات کو کچھ اس طرح افسانچوں میں ڈھالا ہے کہ قارئین کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ انھوں نے ہر موضوع کے لیے ضروری سطور کی منصوبہ بندی کر کے اس پلاٹ کو منصوبہ بند طریقے سے ان سطور کے دھاگے میں کچھ اس طرح پرو دیا ہے کہ ان کی کاٹ باقی رہتی ہے اور تاثر بھی۔ بلاوجہ طوالت دے کر انھوں نے افسانچہ کے تاثر کو معدوم کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

انھوں نے اپنے افسانچوں میں نہ تو تصوراتی اور افسانوی باتیں کی ہیں اور نہ ہی ان کے سہارے اپنے افسانچوں کے پلاٹ بنے ہیں۔ بلکہ زندگی کی تلخ حقیقتوں اور گھناونی سچائیوں کو اپنے افسانچوں کا موضوع بناتے ہوئے پیش کیا ہے تو ان میں ایک کاٹ کی کیفیت کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔

اس وجہ سے بھلے ہی عارف خورشید کے زیادہ تر افسانچوں کے موضوعات، پلاٹ، بڑے نہ ہوں لیکن ان کی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ فی الحال افسانچہ میں بڑا افسانہ یا شاہکار افسانہ کی

طرح کسی افسانچے کو ناپنے اور اسے اس میزان میں تولنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ جو افسانچہ قارئین کو متاثر کرے، اسے جھنجھوڑ کر رکھ دے، اس کے ذہن میں نقش ہو جائے، جو اسے سوچنے کے لیے مجبور کرے،، جس کو پڑھنے کے بعد قارئین کے دل سے ایک آواز اٹھے کہ 'سچ کہا' وغیرہ ایسے میزان ہیں جو افسانچہ کو بڑا افسانچہ قرار دیتے ہیں۔

اگر عارف خورشید کے افسانچوں کو اس میزان پر ناپا جائے تو ان کے کئی افسانچے اس میزان پر کھرے اترتے محسوس ہوں گے۔ اس لیے بلا شک وشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ عارف خورشید کے یہاں امکانات بہت ہیں اور کافی روشن ہیں۔ صرف اس بات کی دیر ہے کہ وہ افسانچہ تحریر کرتے ہوئے اس میں تھوڑی سی کرافٹنگ کے لیے محنت کریں۔ تو ان کے قلم سے کئی شاہکار افسانچے صنف افسانچہ کو مل سکتے ہیں۔

☆☆☆

شعور کی رَو کا افسانہ نگار

محمد بشیر مالیر کوٹلوی

ماہ نامہ شاعر ،بمبئی کا مئی ۲۰۱۱ء کا شمارہ میرے زیر مطالعہ تھا کہ ایک افسانچہ پڑھ کر میں واہ واہ کر اٹھا۔قبلہ رونق جمال کا گوشہ شائع ہوا تھا۔میں خود بھی افسانچہ نگاروں کی فہرست میں شامل تھا۔ شمارے میں افسانچوں کا ذخیرہ تھا۔ان میں سے ایک افسانچہ متاثر کر جائے تو بڑی بات تھی۔ بہر حال افسانچہ پڑھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔حسب عادت میں اپنی خوشی اور غم دوستوں میں ضرور بانٹتا ہوں۔ میرے ادبی اور انتہائی بے تکلف دوست رانچی کے محمد ابرار الحق جو بہت اچھے افسانچہ نگار ہیں، میں نے ان کو فون لگایا۔خیر و عافیت پوچھنے کے بعد شاعر مئی کے بارے میں معلوم کیا۔ پرچہ ان کے ہاتھوں تک پہنچ نہیں پایا تھا۔میں نے کہا لو میاں ایک دلچسپ افسانچہ سنو،عنوان ہے ’’محلے کے بچے‘‘

اس کے بچوں سے سارا محلہ پریشان تھا

اس نے تنگ آکر اپنے بچوں کو دینی مدرسے میں ڈال دیا

اب وہ فارغ ہوکر لوٹے تو سارا شہر پریشان ہے۔

افسانچہ سنا کر میں نے حق سے پوچھا ’’بتائیں افسانچہ نگار نے کیا کہنا چاہا ہے؟ حق نے اپنے مخصوص انداز میں کہا،’ہاں میں سمجھ گیا نا۔۔!مدرسے میں جا کر بچے دہشت گرد بن گئے اور شہر کو پریشان کرنے لگے۔میں نے کہا نہیں جناب یہاں افسانچہ نگار نے کہنا چاہا ہے کہ فارغ ہوکر بچے دین دار ہوگئے اور وہ شہر کے لوگوں کو روزہ نماز کی ہدایت دینے لگے اور شہر پریشان ہوگیا۔حق اپنی بات پر اڑ گئے ،دلیلیں دینے لگے اور میں ان کی کوئی دلیل ماننے کو تیار نہ ہوا۔ بحث لمبی ہونے لگی تو میں نے کہا ٹھہرو میں صاحب افسانچہ سے پوچھ لیتا ہوں۔رسالہ شاعر کی یہ بات اچھی ہے کہ وہ قلم کاروں کے موبائل نمبر ضرور دیتے ہیں۔میں نے فوراً جناب عارف خورشید کو فون کیا، اپنا نام بتایا اور مدعا بیان کیا اور ان کے اپنے خیال کے بارے میں جاننا چاہا انہوں نے بڑے پیار سے مجھے بتایا کہ جو کچھ میں سمجھ رہا ہوں وہی

ٹھیک ہے۔ بچے دینی مدرسے سے فارغ ہوکر لوگوں کو روزہ نماز کی پابندی کے لیے کہتے ہیں، ان کی تبلیغ سے شہر والے پریشان ہیں۔ مجھ سے بات کر کے ان کو اپنی اس خوبصورت تخلیق کی مقبولیت کا اندازہ ہوا وہ کافی خوش ہوئے۔ اس دور میں جہاں افسانچے کثیر تعداد میں لکھے جا رہے ہیں۔ جسے دیکھو وہی سینکڑوں افسانچے اپنے دامن میں لیے بیٹھا ہے۔ وہاں ایک افسانچے پر دو ادیبوں کا بحث کرنا اپنے آپ میں ایک بہت بڑی تعریف تھی۔ سو یہ تھا ہمارا پہلا صوتی تعارف بھائی عارف خورشید صاحب کے ساتھ اس دن کے بعد فون پر ہماری محبتوں کا آغاز ہوا۔ خدا کرے یہ سلسلہ جاری وساری رہے۔

اسی مہینے یعنی فروری ۲۰۱۲ء میں مجھے عارف بھائی کا خط ملا، جس میں انھوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں ان پر ایک مضمون لکھوں۔ میں نے غور سے دیکھا خط اگست ۲۰۱۱ء کا لکھا ہوا تھا۔ ڈاک خانے کی دھندلی سی مہر بھی بتا رہی تھی کہ اورنگ آباد سے یہ خط اگست میں چلا تھا۔ جس شمارے میں مضمون کا چھپنا تھا وہ چھ مہینے کیسے انتظار کر سکتا ہے میں نے یہ سمجھ کر کہ شاید وقت نکل چکا عارف بھائی سے فون پر بات کی۔ آواز آئی آپ اب بھی لکھ سکتے ہیں وہ حیران تھے کہ ڈاک محکمہ نے بڑی مستعدی سے کام لیا کہ خط پہنچا دیا ورنہ آرڈینیری خطوط کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ خوشی ہوئی کہ عارف بھائی نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میں ان کی شان میں مضمون لکھ سکتا ہوں۔ خوشی کے ساتھ ساتھ میرے حواس پر ایک خوف بھی سوار ہو گیا۔ دراصل محفل میں آدمی خاموش بیٹھا، باوقار نظر آتا ہے، منہ کھولتے ہی اس کی قلعی کھل جاتی ہے۔ پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ ایک تخلیق کار کا کام آسان ہے، ادب تخلیق کیا اور قارئین اور نقاد کے حوالے کر دیا۔ اس کا جو انجام ہونا ہے وہ انھیں کے ہاتھوں ہونا ہے۔ راقم الحروف ایک سیدھا سادھا افسانہ نگار ٹھہرا۔ کسی کے فن کو پرکھنا اور لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ تنقید بہت مشکل کام ہے۔ عام ادیب کے بس کی بات نہیں۔ کچھ ادیبوں کو شوق چڑھ جاتا ہے دوسروں پہ مضمون لکھنے کا۔ کتابوں کی گنتی بڑھانے کا یہاں میں ایک نئے نئے خود ساختہ نقاد کا ذکر ضرور کروں گا چاہے آپ بور ہی کیوں نہ ہوں۔ ایک اکثریت والے افسانہ نگار سے میرا نیا نیا تعلق بنا۔ انھوں نے مجھ سے کتابیں منگوائیں اور خواہش ظاہر کی کہ وہ مضمون لکھیں گے۔ کتابیں ان کے ہاتھوں میں گئیں مضمون میرے ہاتھوں میں آیا۔ مضمون پڑھا تو اچھا لگا مگر ایک پہلو مجھے پریشان کر گیا۔ صاحب مضمون نے میرے ایک افسانے کی غلطی نکالی تھی۔ جب کوئی مضمون لکھنے بیٹھتا ہے تو غلطی ضرور نکل آنی چاہیے، ورنہ مضمون نگار کا علمی رعب نہیں

پڑتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان صاحب نے تنقید برائے تنقید کا سہارا لیا جو مجھے تکلیف دے گیا۔ آپ بھی سنیں۔ ایک پنڈت بڑھیا جو مسلمانوں سے سخت نفرت کرتی ہے وہ امرناتھ کی یاترا پر جاتی ہے۔ اس کا بیٹا ایک گھوڑے والے کو معاوضے پہ لاتا ہے کہ اس پہ بیٹھ کر آرام سے سفر طے کرلے گی۔ بیٹا ماں کو کہتا ہے کہ ماں یہ ہے عبدل تو ماں عبدل مسلمان کو دیکھ کر بڑا برا منہ بنالیتی ہے۔ ایسے تاثر کو ہم افسانہ نگار جب پیش کرتے ہیں تو لکھ دیتے ہیں کہ اس نے اپنا منہ ایسے بنالیا جیسے اس کے منہ میں کڑواہٹ بھر گئی ہو یا جیسے اس کے میں کو کونین بھر گئی ہو یا وہ جیسے کونین چبارہی ہو۔ میں نے نئی بات کی کہ لکھ دیا اس نے ایسے منہ بنالیا جیسے نیم کے پتے چبارہی ہو۔ نیم کے پتے سچ مچ تو شاید ہی کوئی چباتا ہو، میں نے تو بات مثال کے طور پر لکھی تھی یا یوں کہیے محاورتاً کہی تھی مگر وہ خودساختہ نقاد صاحب نے لکھا کہ کشمیر میں بشیر نے بڑھیا سے نیم کے پتے چبوائے ہیں جب کہ کشمیر میں نیم کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے ان کو خط لکھا کہ بھائی وہ پنڈت بڑھیا کے چہرے کا تاثر ظاہر کرنے کے لیے میں نے تو مثال کے طور پر لکھا تھا۔ حقیقت میں وہ نیم کے پتے نہیں چبارہی تھی۔ انھوں نے یہاں بس نہیں کی بلکہ جب وہ مضمون کتاب میں شامل کیا تو باقاعدہ لکھا کہ بشیر نے خط کے ذریعے مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ نیم کشمیر میں ہوتا ہی نہیں۔ وہ اکثریتی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اس طبقہ کے گاڈفادران کی بہت مدد کرتے ہیں۔ ہم اقلیت والوں کے فادر تو ہیں جو گاڈفادر کبھی نہیں بنے، بلکہ اپنا الوسیدھا رکھتے ہیں۔ بہرکیف میرے کہنے کا مطلب یہ کہ کسی پر تنقید کرنا آسان نہیں قلم کار کی اوقات کا پتہ چل جاتا ہے اور عارف خورشید جیسے سنجیدہ اور منجھے ہوئے ادیب کے بارے میں کچھ لکھنا تو جان جوکھم کا کام ہے چلیے دیکھتے ہیں، کوشش کرتے ہیں۔

عارف خورشید کے بارے میں سچی بات تو یہ ہے کہ میں طے نہیں کرسکا کہ وہ اچھے شاعر ہیں، اچھے افسانہ نگار ہیں، افسانچہ نگار، خاکہ نگار، مضمون نگار یا ناول نگار ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ میرا مضمون صرف افسانے سے متعلق ہے تو بات افسانوں اور افسانچوں کی کرتے ہیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک اچھا افسانہ نگار اگر شاعری کی طرف مائل ہوتا ہے تو وہ دونوں اصناف سے انصاف نہیں کرپاتا۔ دوسری شادی کرنے کو تو لوگ کرلیتے ہیں مگر شرعی طور پر دونوں عورتوں سے ایک جیسی محبت ایک جیسی گرم جوشی ایک جیسا سلوک کرنا بہت بہت مشکل ہے۔ عورت کی بددعا جب دل سے نکلتی ہے تو برباد کردیتی

ہے۔کئی دوستوں کا حال ہمارے سامنے برا ہوا، او ہو یہ بسیار نویسی بھی ایک عیب ہی ہے۔اب بتائیے بات عارف کے فنون کی ہو رہی تھی، میں کہاں پہنچ گیا۔معاف کیجیے۔ہاں بات ایک سے زیادہ اصناف کو اپنانے کی ہو رہی تھی۔ادیب کی فکر دو جگہ بٹ جاتی ہے۔اکثر دیکھنے کو ملا ہے کہ قلم کار سے معیار روٹھ جاتا ہے۔دو کشتیوں کی سواری بہر حال مشکل ہے۔میرا عقیدہ تھا کہ ہر ادیب احمد ندیم قاسمی نہیں ہوسکتا کہ ایک ہی وقت میں بہترین افسانہ اور بہترین غزل تخلیق کرے۔عارف خورشید کو پڑھ کر میرا عقیدہ ڈگمگا گیا۔انھوں ہر وہ صنف جو اپنائی، اس سے انصاف کیا ہے۔افسانہ لکھا تو علامتی رنگ میں بھی تخلیق کیا اور بیانیہ میں بھی اور دونوں قسموں میں کامیاب رہے۔گو علامت کا دور جا چکا مگر انھوں نے اپنے مجموعہ ''قافلے والو سچ کہنا'' میں اپنے علامتی افسانوں کو بھی جگہ دی ہے۔عارف خورشید کی تخلیقات کے مطالعے کے بعد میں نے ان کو ایک سنجیدہ مہذب اور دردمند انسان پایا ہے۔بہت ہی حساس انسان بلکہ مسلمان دوست پایا ہے۔آپ کہیں گے کہ یہ کون سی نئی بات ہے ان جذبوں کے بغیر تو قلم کار کی تخلیق متاثر ہی نہیں کر سکتی، یہ جذبے تو قلم کار کا زیور ہیں۔آپ کی بات درست مگر عارف خورشید کے ہاں یہ جذبے ایکسٹرا آرڈنیری پائے جاتے ہیں۔اپنی قوم کی دردمندی جس قدر عارف میں دیکھنے کو ملی شاید اور کہیں ہو۔ہمیں اس بات سے قلم کار کی فطرت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ مصنف، یہ افسانہ نگار کس قسم کے موضوعات کو اٹھاتا ہے۔ان کا افسانچہ 'ڈائنا سور' میں نے پڑھا ہے اس سے زیادہ اور اپنی قوم کے لیے فکرمندی کیا ہوسکتی ہے۔میں سمجھتا ہوں 'ڈائنا سور' افسانچہ مستقبل کی فکر کی ایک مثال ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈائنا سور کی نسل کی طرح مسلمان کی نسل ناپید ہو جائے (خدا نہ کرے) کرپشن اور رشتوں کی بے راہ روی جیسے موضوعات کو بھی عارف نے چھوا ہے میں یہ خوبصورت الزام نہیں لگاؤں گا کہ عارف خورشید قوم پرستی کے ترانے ہی گاتے ہیں جگہ جگہ انھوں نے انسان دوستی کا ثبوت بھی دیا ہے۔افسانچہ 'آنٹی' قوم کے تئیں ان کی فکرمندی ہے۔'اللہ کا گھر'، دو لائنوں کا کتنا معنی خیز افسانچہ ہے۔''کتنا نیک آدمی ہے گھر کے ساتھ ساتھ مسجد بنا رہا ہے''۔دوسری سطر میں دیکھیے، ''مسجد کے ساتھ ساتھ گھر بنا رہا ہے''۔اس طرح کے بہت سے افسانچے ہیں جن میں انھوں نے اپنی قوم کو بیدار کرنے کی غرض سے کچوکے لگائے ہیں۔دیکھیے افسانچہ 'حج'، 'سکہ بند' اس دور کی بہت کڑوی سچائی ہے۔عارف خورشید کے افسانچے پڑھ کر دل مطمئن ہوا کہ افسانچوں کا زوال دور ہے ورنہ اس صنف سے مایوسی جھلکنے لگی تھی،

کیوں کہ اس دور میں کثیر تعداد میں افسانچے لکھے گئے اور بے معنی، اور بلا وجہ قاری اور مدیران افسانچوں سے اوب کر رہ گیا ہے۔ اکثر جرائد افسانچوں کی اشاعت سے پرہیز کرتے ہیں اور مقبول افسانہ نگار بھی افسانچوں کو اپنا ذریعۂ اظہار بنانے میں دلچسپی نہیں لیتے۔ افسانچہ 'نمازی' دیکھیے آج کے ماحول پر کاری تنقید ہے۔ افسانچہ 'ذمہ دار' اپنے اندر ایک بڑی حقیقت لیے ہوئے ہے اس پلاٹ کو بڑھا کر افسانہ کیا آپ ناول بھی تخلیق کر سکتے ہیں جو اچھے افسانے کا وصف ہے کہ آپ موضوع کو اتنا پھیلا سکتے ہیں کہ وہ ناول بھی ہو سکتا ہے اور ایک نقطہ پر سمیٹ کر افسانچہ 'مرشد' بھی سچائی کا سایہ ہے۔ 'سخت پردہ' ملاحظہ کریں۔ ''سوسائیٹی کے ممبران نے طے کیا کہ زنانہ اسکول کے لیے پردے کا سخت انتظام کیا جائے اور وہ روزانہ معائنے کے لیے جانے لگے''، جیسے 'نمازی' میں نوجوان لڑکے ویمین کالج میں جمعہ کی نماز پڑھنے چلے جاتے ہیں۔ 'بے گناہ' کو لیجیے، یہاں مجمع دوبارہ پتھر اٹھاتا اپنے گناہوں پر پردہ پوشی ہے۔ 'جذبہ نہاں' اپنے اندر عورت کی نفسیات لیے ہوئے ہے۔ آخری جملہ دیکھیے۔ ''خدا جوانی میں بیوہ ہو جانے والی ماں کے بیٹے سے بھی کسی کی شادی نہ کروائے''۔ ظاہر ہے وہ تشنہ ہے اور نفسیاتی طور پر وہ بہو کو کریٹی سائیز کرتی رہے گی۔ کس کس افسانچے کا ذکر کیا جائے اپنی جگہ بھی مناسب اور اچھے افسانچے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک اپنے مضمون میں میں نے افسانچوں کے بارے میں لکھا تھا کہ ایک کامیاب افسانہ نگار ہی اچھا افسانچہ تخلیق کر سکتا ہے کیوں کہ وہ افسانے کی تکنیک سے واقف ہوگا وہ کبھی سپاٹ اور بے معنی افسانچے نہیں تخلیق کرے گا۔ اس کے افسانچوں میں کوئی بات ہوگی۔ عارف خورشید کے افسانچوں سے مل کر مجھے احساس ہوا کہ میں نے غلط نہیں لکھا تھا۔ عارف خورشید کے افسانچوں کے مطالعے کے بعد بھائی عظیم راہی کا دعویٰ یاد آ گیا۔ انہوں نے کہا تھا اورنگ آباد افسانچوں کا مرکز ہے۔ وہ ٹھیک ہی فرما رہے تھے۔ آیئے اب عارف خورشید کی بھرپور کہانیوں اور افسانوں کا مزہ لیں۔ فن کار کے فن پر کسی نہ کسی کا عکس ضرور ہوتا ہے۔ جس فن کار سے وہ زیادہ متاثر ہو اس کا اثر چاہے تھوڑا ہی ہو اس کے فن پر پڑتا ہے۔ عارف خورشید پہ چاہے ہلکا ہی سہی انور خان کا رنگ تو ہے، ممکن ہے یہ میرا ہی خیال ہو۔ سچی بات تو یہ ہے کہ عارف خورشید کی طویل کہانیوں نے مجھے افسانچوں سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ مگر مجھے اکتاہٹ تب ہوئی جب کچھ علامتی کہانیاں میرے سامنے آئیں۔ مجھے علامتی کہانیاں لکھنے کا نہ تو تجربہ ہے نہ میں علامتوں کو سمجھ سکتا ہوں۔ پھر بھی اس صنف پر بھی بات کر لیتے ہیں۔ اس زمرے

میں ''منظر کی گواہی'' کی ہی بات کرتے ہیں۔ عارف کی زبان کی پختگی اور جملوں کی خوبصورتی کا میں قائل ہوں۔ شاعرانہ اور خوبصورت لفاظی ان کا اپنا حصہ ہے۔ آپ نثر میں شاعری کرنا خوب جانتے ہیں۔ کئی کہانیاں تو افسانچوں کا مرکب نظر آتی ہیں۔ اپنی کہانیوں میں یہ حضرت ہمیں چھوٹے چھوٹے افسانچے سناتے ہوئے چلتے ہیں۔ بہر کیف 'منظر کی گواہی' ہم کلامی کا ایک اچھا افسانہ ہے۔ عارف مجھے معاف کریں، میرا اندازہ ہے کہ یہ علامتی کہانیاں اس دور کی تخلیق کردہ ہیں جب علامتی کہانیاں عالمی سطح پر لکھی گئی تھیں، آپ کے مجموعے میں اب شامل کی گئی ہیں۔ میرے خیال میں دورِ حاضر میں تو عارف صاحب علامتوں کا سہارا نہیں لیتے۔ براہ راست اظہار کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ عارف بھائی کی پرانی شرارتیں ہیں جنھیں ہمیں جھیلنا پڑے گا۔ انسانی ذہن اپنی فکر میں اپنی رو میں کہیں بھی جاسکتا ہے۔ کوئی بندش کوئی رکاوٹ نہیں آپ یہاں بیٹھ کر امریکہ کے بارے میں سوئٹزرلینڈ یا آسٹریلیا کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ یہ آپ کے شعور کی رو سے آپ پتھر یگ میں چلے جائیں۔ چندر گپت موریہ کے دور میں نکل جائیں، چانکیہ سے انٹرویو کرلیں۔ مہاتما بدھ کی بات کرلیں گورونانک کے دور کو اوڑھ لیں، کوئی پابندی نہیں۔ یہ تو شعور کے رو کی اڑان ہے۔ علامتی کہانیوں میں دو باتوں پہ بہت زور دیا جاتا رہا ہے ایک ہم کلامی اور دوسرے شعور کی رو۔ 'منظر کی گواہی' میں بات اتنی سی ہے کہ راوی خود شراب پیتا ہے خوب پی کر توبہ کرلیتا ہے آخر میں دعا کرتا ہے کہ اس کا بیٹا اس کا انتخاب نہ کرے اس بوتل کی طرف راغب نہ ہو ورنہ بوتل کا یہ جن اس پر بھی سوار ہو جائے گا۔ اپنی بات کرنے کے بعد شعور کی رو میں بہہ جاتا ہے۔ کبھی ہمیں دریائے سندھ کے کنارے لے جاتا ہے جہاں محمد بن قاسم کا مجسمہ بنا کر لوگوں نے پوجا کی اور حجاج کا فعل بھی یاد کروایا۔ پھر حضرت حسینؓ کی پیاس اور سخت دھوپ کا ذکر کرتے ہوئے ان کی صداقت کی قوت برداشت کے بارے میں بات کی۔ پھر حضرت ابراہیمؑ حضرت اسمٰعیلؑ کا قصہ بھی سناڈالا۔ حضرت موسیٰؑ کے عصا کا سانپ بن جانے کا بھی ذکر ہے۔ اس بیچ ایک بہت پیارا جملہ ہاتھ لگا، ''سورج غروب ہوتے ہی سمندر نہا کر نکلا''، پھر ذکر جہانگیر کا بھی ہے کہ اس نے شیر افگن کو قتل کروا کر نور جہاں کو پایا اور ساری زندگی انصاف کرتا رہا۔ عدل جہانگیر مشہور ہوا۔ ہندوستان کی سرزمین پر وہ تاریخی زخم ہے کہانی کا محور ہی دراصل تقسیم ملک ہے۔ زندگیاں تقسیم ہوگئیں، ویران ہوگئیں، کٹ کٹ کر بٹ گئیں، کبھی پھولوں کو چوم کر بھی ہجرت کے کانٹوں کو گلے لگا کر پھولوں کی خوشبوں اڑا لے گئے۔ مجھے

کہنے دیجیے کہ عارف خورشید کی یہ علامتی کہانی پڑھ کر میرے اعصاب پر قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' سوار ہوگیا۔ علامتی افسانوں کا حال بالکل ماڈرن آرٹ کی طرح ہوتا ہے آرٹسٹ تصویر بنا کر ایک طرف ہو جاتا ہے دیکھنے والوں کی نظر اسے اپنے اپنے زاویوں سے دیکھتی ہے اور اپنی سوچ کے مطابق ہر دیکھنے والا اس تصویر میں کوئی بھی وجود ڈھونڈ لیتا ہے جس کا آرٹسٹ کو وہ تصویر تخلیق کرتے ہوئے بھی اندازہ نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک منظر کی گواہی تقسیم ملک کا سانحہ بیان کر رہا ہے۔ شعور کی رو پہ سوار تخلیق کار کہیں سے کہیں نکل گیا۔

افسانہ ''قافلے والو سچ کہنا'' ایک جاندار کہانی ہے جس کا مفہوم میں تو یہی سمجھ سکا ہوں کہ سالار، رہبر کوئی بھی ہو قافلے رکتے نہیں۔ آج یہ سالار تو کل وہ کیا فرق پڑتا ہے۔ گھوڑوں کی سواری، تلوار، سالار قافلہ اور دف بجنا، ان سب اشاروں سے تو یہی ظاہر ہے کہ زمانہ خلفائے راشدینؓ کا ہے اور ماحول عرب کا ہے۔ خستہ حال شخص نے آگے بڑھ کر سالار کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور ضد کی کہ وہ قافلے کے ساتھ جائے گا مگر سالار انکار کرتا تو وہ شخص چلا جاتا ہے۔ سالار سوچتا ہے کہ اس کے باپ کی تباہی ایک سائل کی بددعا سے ہوئی تھی۔ وہ ہنستا ہے مجذوب پاگل صوفی۔ گھر میں کوئی تقریب تھی اس کے باپ نے سائل کو جھڑک دیا تھا گھر کو آگ لگی، سب کچھ تباہ ہو گیا اسی غم میں باپ پاگل ہو گیا اور چل بسا۔ قافلہ ایک سرائے میں قیام کرتا ہے۔ وہ خستہ حال شخص وہاں بھی موجود ہے۔ شاید وہ خستہ حال شخص برائی کی علامت ہے کہ وہ ہر جگہ موجود ہے اور سالار اس سے دور رہتا ہے۔ سالار عبادت میں مشغول ہے اور اپنا خاکی جسم چھوڑ دیتا ہے یعنی انتقال ہو جاتا ہے سالار کا۔ نیا سالار چن لیا جاتا ہے اور قافلہ رواں دواں ہو گیا اپنی منزل کی طرف۔ کسی کے مرنے پر بچھڑنے پر قافلے رکتے نہیں رواں دواں رہتے ہیں۔ یہ دنیا یہ ممالک چلتے ہی رہے ہیں۔ سالار بدلتے رہتے ہیں، دنیا کا کاروبار رکتا نہیں۔

اس کڑی کی تیسری کہانی ہے 'مکبر الصوت' اس افسانے میں عارف خورشید کی قوم کے تئیں فکرمندی کھل کر سامنے آتی ہے، مسلمانوں کی حالت کیا ہے۔ ان کے شب و روز کیا ہیں۔ سب کچھ عیاں ہے۔ اذان کی آواز جھنجھوڑ جاتی ہے کہ آؤ بھلائی کی طرف، آؤ نماز کی طرف، مگر قوم لذتوں کے سمندر میں ڈوبی رہتی ہے۔ اپنے مذہبی فریضوں سے نظریں پھیرتی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کو آپ نے مچھلی کی علامت دی ہے جو تالاب میں ہی خوش ہے۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اسے اس کی پرواہ نہیں۔ حوض

میں طوفان اٹھا۔نمازیوں نے دیکھا پانی میں جوش آرہا تھا۔مچھلیاں ابلتے پانی میں تڑپ رہی تھیں۔وہ حوض کے اندر ہی رہیں۔یعنی یہ قوم باہر نہیں نکلتی، ترقی کی نہیں سوچتی، سست ہوگئی ہے، مصیبتیں جھیلے گی، تڑپے گی، مار کھائے گی، مرے گی، کٹے گی، مگر کچھ کر نہ پائے گی، اللہ کا شکرادا کرے گی اپنے حوض میں ہی صبر شکر سے رہے گی۔مظلوم ہوکر بھی ان کا نصیب کٹہرے میں کھڑا ہونا ہے۔عارف خورشید نے بڑی چابک دستی سے کام لیتے ہوئے چھ دسمبر کے سانحہ پر بھی ماتم منایا ہے۔لکھتے ہیں آخر کار ساری مچھلیاں جل گئیں۔دنیا دیکھتی رہی ساری لاشیں پانی کی سطح پر تیرتی رہیں تھیں۔قوم کے پاس اظہار کی قوت نہیں۔شاعر، داستاں گو مجتہد کے پاس اظہار کی قوت نہیں فوٹو گرافی، موسیقی اور مصوری منع ہے۔قوم اذان کی آواز سنتی ہے پتھر بن جاتی ہے۔صبح اٹھتی ہے اپنی اپنی گاڑیوں میں کاروبار کرنے چلی جاتی ہے شام کو پھر پتھر بن جاتی ہے۔یعنی نہ اذان کی آواز سنتی ہے نہ نماز ادا کرتی ہے۔مچھلیاں درختوں پر چڑھیں بہت دشواریوں کے بعد مینار مچھلیوں کا انتظار کرتا ہے۔یعنی یہ قوم ترقی کے لیے جدوجہد نہ کرسکی مینار پر چڑھنا بہر حال ترقی کرنا ہے۔اس کہانی کا اختتام بہت خوبصورت الفاظ سے کیا ہے۔دو جملوں میں کتنی بڑی حقیقت چھپی ہے، ذرا غور کریں۔

> ''یہ گوشت پوست کے حساس انسانوں کی دنیا ہے.........نہیں۔!یہ تمھارا وہم ہے، یہ تو مجسموں کی دنیا ہے۔جہاں ایک مجسمہ دوسرے مجسمے کی پوجا کرتا ہے۔!!''

ان دو جملوں سے بہت کچھ اخذ کیا جاسکتا ہے۔دنیا پر سماج پر یہ بہت گہری چوٹ ہے۔ظاہر ہے کہ علامتی کہانیاں کردار، واقعات، زبان ومکان سے عاری ہوتی ہیں شعوری رو ہوتی ہے جو بہتی چلی جاتی ہے کہیں بھی۔بلا جھجک، بلا خوف۔بغیر بندش کے ایسی کہانیوں میں کہانی کار اپنے آپ کا کھل کر بے باکانہ اظہار کرتا ہے، کوئی سمجھ سکے یا نہ۔علامت کا فیشن بھی ہندوستان بلکہ یوں کہیے کہ مشرق کی طرف مغرب سے ہی آیا ہے۔اسے اپنایا پاکستان کے ادیبوں نے۔وہ ان کی ضرورت تھی۔پاکستان میں فوجی حکومت تھی ان کی تانا شاہی کے خلاف کوئی منہ نہیں کھول سکتا تھا شاعروں اور ادیبوں نے اظہار کا ذریعہ علامتوں کو بنایا، اپنے دل کی بھڑاس بھی نکال لیتے، تحفظ کا سایہ بھی رہتا۔جن لوگوں نے منہ کھولا براہ راست بات کہی ان شاعروں کو ملک بدر ہونا پڑا، جیسے فیض احمد فیض، اور احمد فراز وغیرہ۔

ہندوستان میں محض فیشن کے طور پر علامتوں کو اپنایا گیا، جسے قاری زیادہ دیر برداشت نہ کرسکا۔ کسی صاحب نے علامتی کہانیوں کے بارے میں لطیفہ سنایا کہ ایک شخص نے بک اسٹال سے علامتی کہانیوں کا مجموعہ خرید کر کہا کہ اب اس مجموعے کی کنجی بھی دے دیں تاکہ میں یہ کہانیاں سمجھ سکوں۔

بیانیہ کہانیوں میں عارف خورشید کی کہانی 'الساس' بہت پیاری ہے۔ عنوان ہی پرکشش ہے 'مجرموں کی پناہ گاہ' سروج کی شادی کے سات سال بعد بھی اس کی گود خالی تھی۔ جس شادی شدہ عورت کو بچہ نہ ہو تو دنیا والے اس کے گلے میں خواہ مخواہ بانجھ پن کا طوق ڈال دیتے ہیں۔ کمی چاہے مرد کی ہی ہو۔ سروج اسی ذہنی تکلیف سے گزر رہی تھی کہ پجاری کی نظریں اس کے جسم کا محاصرہ کرنے لگیں۔ اس نے پجاری کی نظروں کو بھانپ لیا اور سوچا پجاری ہی اسے اس برزخ سے نکالے گا۔ جانے کیوں مجھے یہاں لفظ 'برزخ' مناسب نہیں لگا، جو عالم برزخ کے طور پر مروج ہے کہ مرنے کے بعد ارواح اسی مقام پر رہیں گی قیامت تک۔ لغوی معنی دیکھیں تو عارف نے یہ مناسب لفظ استعمال کیا۔ مجھے اچھا نہیں لگا ویسے بھی یہ لفظ عام فہم نہیں آج غالبؔ اور مومنؔ کا دور تو ہے نہیں کہ الفاظ عام ہوں گے۔ بہر حال ہم ادیبوں کو سلیس زبان کا سہارا لینا چاہیے جسے عام قاری بھی ہضم کرلے۔ بہر حال آیئے کہانی کی طرف، بہت ہی شارٹ کٹ طریقہ سے عارف نے یہ بات واضح کردی کہ پجاری اور سروج کا جنسی تعلق بن گیا۔ بڑے خوبصورت جملوں سے۔ ملاحظہ فرمائیں:

"مندر میں سب سے پہلے آنے والی سروج سرشار ہو کر لوٹ رہی تھی اور لوگ تازہ پھول لیے مندر کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔"

ایک جملے میں ہی بات مکمل ہوگئی یہ بات مکمل ایک صفحہ میں بھی ہوتی۔ بڑا اچھا اختصار ہے ویسے بھی میں نے عارف کو الفاظ بہت کم استعمال کرتے ہوئے پایا ہے۔ وہ بات کو زیادہ نہیں بڑھاتے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ عارف کو قاری کے وقت کی قلت کا احساس ہے۔ سروج کے ہاں بھگوان داس کی پیدائش اور اس کی شادی۔ سروج کا اپنے بیٹے بھگوان داس سے کہنا کہ تیری بیوی کو مندر جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی اس جملے میں عارف بہت کچھ کہہ گئے۔ یہ جملہ بہت پسند آیا۔

"عورت اولاد کی خواہش میں ساری زندگی خود کو برہنہ کرتی رہتی ہے۔"

گو عارف خورشید اختتام پہ کسی دھماکے کے قائل نہیں، یہ بات ان کے افسانچوں میں تو موجود ہے، پھر

بھی طویل کہانیوں میں ان کا آخری جملہ بھی دھماکے سے کم نہیں ہوتا یہ دیکھیے :

''پوجا کے دوران کبھی اس کو پجاری جوان نظر آتا اور کبھی اپنا بیٹا''

عارف نے اس افسانے میں رومانی پہلو بھی قلمبند کیے، جنسی پیچ بھی تھے مگر موصوف نے اشتعال انگیزی سے کام نہیں لیا، نہ ہی جنسی چٹخارے کی طرف راغب ہوئے جبکہ موضوع ہاٹ تھا۔

'سات چاند' بھی ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ بیوی بہت خوبصورت ہے، جاذب نظر، مکمل جوان، ہر زاویہ سے مناسب اور قابل قبول۔ شوہر اسکول میں ٹیچر ہے۔ وہ ایک نئی عورت سے متاثر ہوتا ہے۔ ہر عورت کے جسم کے کسی نہ کسی حصے سے وہ متاثر ہوتا ہے۔ جو عضوا سے باہر کی عورت کا پسند ہوتا ہے گھر آکر اپنی بیوی کا وہی عضوا سے غائب نظر آتا ہے۔ ایک دن وہ بھری بھری چھاتی والی عورت کو دیکھتا ہے، جب وہ گھر آتا ہے تو اس کو اپنی بیوی کی چھاتی بالکل سپاٹ نظر آتی ہے۔ کسی عورت کی خوبصورت چال دیکھتا ہے تو اسے بیوی کی چال بے ڈھنگی نظر آتی ہے۔ کسی عورت کے لمبے بالوں سے متاثر ہوتا ہے تو گھر آکر اپنی بیوی اسے گنجی نظر آتی ہے۔ یہ افسانہ ایسے شوہروں کے منہ پر طمانچہ ہے جو اپنے گھر میں خوبصورت بیوی کے ہوتے ہوئے باہر جا کر منہ مارتے ہیں۔ باہر والیوں سے متاثر ہوتے ہیں، بیوی سے بدظن ہوتے ہیں۔ یہاں گھر کی مرغی دال برابر کا محاورہ مناسب لگتا ہے۔ کچھ عیاش دوست ہم نے یہ کہتے بھی سنے ہیں کہ ایک ہی ذائقے کا کھانا کھاتے کھاتے دل اوب جاتا ہے۔ ہم لقمہ دے دیتے ہیں کہ اگر عورتیں اسی بات پہ عمل کرنے لگیں تو۔؟ بہر حال افسانہ اپنی جگہ متاثر کرتا ہے اور مکمل ہے۔ ہاں میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ سہل نہیں، یہ نفسیاتی شہ پارہ ہے جو عام فہم نہیں۔

''آکاش بیل'' عورت مرد کے تعلقات اور الجھنوں کی کہانی ہے۔ محبوبہ نے خودسوزی کرلی۔ اس کے جنازے کو غسل دیا جا رہا ہے۔ راوی اپنے ذہن میں مرنے والی کی یادیں تازہ کر رہا ہے۔ وہ سوچ رہا ہے کہ تعلق کا آغاز تو یہیں سے ہوا کہ جب تمھارے دل سے میں نے اپنے نام کی دھڑکنیں سنیں تو میں نے تمھیں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں شادی شدہ ہوں۔ پھر مرنے والی کی شادی ہوئی۔ شوہر بے ڈھنگا اور بے وقوف ملا۔ شوہر کا ظلم برداشت نہ کرسکی اور دو ماہ کے بعد ہی شوہر کو چھوڑ آئی اور راوی کے ساتھ جسمانی تعلق بنالیے۔ افسانہ دو زمانوں میں چلتا ہے، حال اور ماضی، راوی حال کی منظر گوئی بھی کر رہا ہے، بیچ بیچ میں ماضی کی یادوں کو بھی کرید رہا ہے۔ مثلاً وہ لوگوں کے

درمیان بیٹھا ان کی باتیں سن رہا ہے اور ان کو کوس بھی رہا ہے اور ماضی کو بھی بار بار چھو رہا ہے یہ بھی شعور کی رو ہے۔ راوی جب چاہتا ہے حال کے بارے میں بات کرتا ہے اور جب چاہتا ہے ماضی کی باتیں، جو مرنے والی کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں، یاد کر لیتا ہے۔ حال میں رہ کر وہ بتا رہا ہے کہ اب جنازہ اٹھا، اب مسجد کے سامنے رکھ دیا گیا، اب اس نے کاندھا دیا ہے۔ اشاروں سے یہ بھی واضح ہوا کہ یہ ظہر کا وقت ہے کیوں کہ چار سنتیں دن میں تو ظہر کی پڑھی جاتی ہیں پھر فرض۔ مرنے والی ملازمہ ہے۔ اس کا ایک شریک کار بھی ہے جو مرنے والی پہ عاشق تھا۔ خودسوزی کی وجہ یہی رہی کہ گھر والے چاہتے تھے کہ مرنے والی اپنے شوہر کے گھر جائے۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ اختتام پہ جنازے کا سفر ختم ہوتا ہے مرنے والی کو قبر میں اتار دیا جاتا ہے۔ راوی جو اس کے پیار میں گرفتار تھا، جو اس کو پیار کرتا تھا، جس کا مرنے والی سے تعلق تھا اسے بھی مرنے والی کے ساتھ دفن کر آیا یعنی اپنے پیار کو۔ یعنی مرنے والی کے ساتھ ہی راوی نے محبت بھی ترک کر دی۔ سیدھی سادھی کہانی ہے کوئی الجھن نہیں عارف خورشید کی یہ کہانی ذرا دوسری کہانیوں سے ہٹ کر ہے، اس کا اسلوب بھی الگ ہے۔ ایک بات میں کہنا چاہوں گا کہ یہ کہانی مسلم معاشرے کو مزہ دے سکتی ہے۔ ہمیں یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے کہ ہم جب ادب تخلیق کرتے ہیں تو کسی خاص طبقے کے لیے نہیں کر رہے ہیں اور ادب کا قاری کسی بھی مذہب کسی بھی خطے سے تعلق رکھ سکتا ہے۔ ادب معاشرے کے ہر شعبے کے لیے تخلیق ہونا چاہیے۔

'طواف حرم' ایک اچھی کہانی ہے۔ الطاف اپنی والدہ کو دفنا کر آتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جب آدمی غمزدہ ہوتا ہے اسے ہر چیز روتی ہوئی نظر آتی ہے۔ گھر آ کر وہ اپنی بیوی کو جس کا نام نیلوفر ہے اپنی ماں کی سچائی بتانا چاہتا ہے۔ ماں گزر گئی بیٹا دفنا کر گھر آتا ہے۔ گھر میں کوئی رشتہ دار یا دوست نہیں۔ ہم نے تو دیکھا ہے کہ گھر میں دو تین دن تو مہمان رہتے ہی ہیں۔ عین ممکن ہے بڑے شہروں میں ایسا ہوتا ہو کیوں کہ لوگوں کے پاس وقت کم ہی ہوتا ہے، پُرسے کے لیے۔ بہر حال ماں کو دفنانے کے بعد الطاف گھر آتا ہے تو صرف بیوی اور بچہ ہے۔ الطاف نیلوفر کو سچائی بتاتا ہے کہ اس کا چچا ایک دیندار اور پرہیزگار آدمی تھا۔ پنج وقتہ نمازی تھا ایک بار اس کا باپ باہر گیا تو چچا عشاء پڑھ کر ماں کے بیڈروم میں گھس گیا اور بھاوج سے بلات کار کیا۔ وہ یعنی الطاف کی ماں روتی رہی۔ اس نے باپ کے آنے پر اس کے بھائی یعنی الطاف کے چچا کی شکایت کی، جس نے الٹا ماں کو طلاق دے دی۔ الطاف کی پرورش ماں

نے کی الطاف کا نمبر ایم بی بی ایس میں لگا اور کلاس میں مُردوں پر تجربات کا سلسلہ شروع ہوا تو الطاف نے ایک لاش کے تھپڑ مارا۔ وہ لاش اس کے اسی چچا کی تھی۔ موضوع بہت اچھا تھا اگر اس موضوع کو میں اپناتا تو اختتام پہ لاش کو دیکھتے ہوئے ایک زوردار تھپڑ رسید کرتا اور بس کہانی تو یہیں ختم ہوگئی، آگے کچھ کہنے کو ہے ہی نہیں ۔ یہ الطاف کی نفرت کی انتہا تھی ۔ بہر حال یہ اپنے اپنے اسلوب کی بات ہے، Treatment کا مسئلہ ہے جو اپنا الگ الگ ہوتا ہے۔ لاش کو تھپڑ مارنے کی سزا میں الطاف کو کلاس سے باہر کردیتے ہیں۔ ماں کالج جا کر ڈین سے بات کرتی ہے۔ وہ الطاف کو کہتی ہے کہ وہ اسے refill بنائے گی جس کا پوائنٹ کبھی خراب نہ ہوگا۔ قصہ سن کر نیلوفر اپنے خسر کی تصویر ٹیبل سے ہمیشہ کے لیے ہٹا دیتی ہے۔

افسانہ 'آئینہ خانہ' بہترین نفسیاتی موضوع ہے۔ جبار غریب مدرس کا بیٹا ہے۔ ایم بی بی ایس میں اس کا نمبر لگ جاتا ہے۔ جبار کا ہوسٹل میں ایک دوست تراب ہے جو باتونی ہے اور فلسفے بیان کرتا رہتا ہے۔ ہوسٹل کے کمرے کی کھڑکی میں جب جبار بیٹھتا ہے تو سامنے ایک رئیس خاندان کی لڑکی دھوپ میں اس پر شیشے کی چمک ڈالتی ہے اور ہنستی ہے۔ آئینے کی اس چمک سے بہت فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ مثلاً جبار کو آئینے کی اس چمک سے والہانہ محبت ہوجاتی ہے، آئینے کی چمک اس کی زندگی کا حصہ بن جاتا، زندگی کے آخری مرحلے تک جبار آئینے کی چمک سے پیار کرتا، انجام کچھ بھی بنایا جاسکتا تھا۔ بہر حال یہ میری سوچ تھی ۔ یہ درست ہے کہ ہر ادیب کی سوچ کا اپنا اپنا الگ زاویہ ہوتا ہے۔ بہر حال آئینے عارف خورشید کے آئینہ خانہ کی طرف ہی لوٹنے میں اختتام پہ جبار بمبئی چلا جاتا ہے اور اپنی کلاس فیلو ''مونا'' جس کو وہ پسند کرتا ہے اس سے محبت کا اظہار کردیتا ہے اور آئینے کی چمک سے خود کو محفوظ کرلیتا ہے۔

''داستان مرکب ہے'' وہ جب بچہ تھا تو ایک رات اس کی آنکھ کھل گئی، ہلکی روشنی میں اس نے ماں باپ کو دیکھ لیا۔ ماں نے اسے تھپک کر سلا دیا سمجھی وہ سوگیا وہ پھر سے مصروف ہوگئی وہ دیکھتا رہا اور ہر رات سونے کی اداکاری کر کے سب کچھ دیکھنے لگا۔ وہ جماعت نہم تک پہنچا تھا کہ گیارہ سال کی لڑکی سے لے کر ساٹھ سال کی عورت تک سے واقف ہو چکا تھا۔ وہ عیاش بن گیا اور بڑا گندہ عیاش جو عورت لڑکی، شکل وصورت، عمر اور رشتہ کچھ نہیں دیکھتا تھا، عورت کو عورت کے طور پر استعمال کرنا اس کا

شیوہ تھا۔اس کی شادی نہ ہوسکی، وہ بدنام ہوگیا ادھیڑ عمر میں شادی ہوئی تو وہ جسمانی طور پر ناکام رہا۔ دلہن چھوڑ کر چلی گئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا جملہ بہت ہی مناسب جگہ پر استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ''تھکی ہوئی پیٹھ کو مذہب ہی کی دیوار سہارا دیتی ہے'' وہ تھک کر مسجد کی سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔ کہانی تو مجھے اتنی سی ہی ملی، باقی تو شعور کی رو ہے لفاظی ہے، اتار چڑھاؤ ہے، یادیں وہی عیاشیوں کی یادیں۔ حمیرا مودودی کی کتاب 'شجر ہائے سایہ دار' کا ایک اقتباس دیا ہے۔ اقتباس کہاں ختم ہوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں بشارت کا ذکر۔ یہ افسانہ شعور کی رو کی نذر ہوا ہے۔ کوئی شخص کس وقت کیا سوچتا ہے، کن یادوں کے ریلے میں بہہ جاتا ہے کیا خبر؟ سوچ پہ تو کوئی قید نہیں کوئی بندش نہیں۔ اپنے رنگ کا یہ اچھا افسانہ ہے۔

''بے آواز شہادت'' اس افسانے کی خوبی ہے کہ اس کی گود میں کئی اچھے افسانچے بیٹھے ہیں، افسانہ ماضی کی یادوں کا گہوارہ ہے۔ وہ ایک ٹیچر ہے جو آج ریٹائر ہوا ہے اس کی الوداعی پارٹی کا اہتمام کیا جا رہا ہے وہ اکیلا سائنس روم میں بیٹھا ہے کہ انسانی ڈھانچے میں حرکت ہوتی ہے۔ اس میں آنکھیں نمودار ہوتی ہیں۔ وہ ڈھانچہ ایک خوبصورت لڑکی کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور بولنے بھی لگتا ہے۔ ڈھانچے والی لڑکی اسے بیتے دنوں کی یاد دلاتی ہے۔ کہتی ہے وہ اسے تب سے دیکھ رہی ہے جب وہ جوان تھا۔ آج وہ بوڑھا ہوگیا، ریٹائر ہوگیا اور اسکول چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اس لڑکی نے اسے بتایا کہ اس نے اس کی ساری جد و جہد کو دیکھا ہے وہ کیسی کیسی مصیبتوں سے گزرا ہے، اسے معلوم ہے۔ پھر وہ زندگی کی حقیقتوں، تعلیم کے نظام میں ناہمواریوں، زیادتیوں کے بارے میں باتیں کرتی ہے۔ انھیں باتوں میں کئی افسانچے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً صدر انجمن نے اچانک اسکول میں آ کر حاضری رجسٹر چیک کیا جس پر ایک لیڈی ٹیچر کے دستخط نہیں ہوئے۔ سپروائیزر جو انگلش کا پرچہ سیٹ کر رہا ہوتا ہے اس سے صدر صاحب سوال کرتا ہے کہ اس ٹیچر کی درخواست کہاں ہے۔ سپروائیزر وہی سیٹ کیا ہوا پرچہ صدر کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ صدر اسے ایسے دیکھتا ہے جیسے وہ پرچہ پڑھ رہا ہو اور سپروائیزر کو حکم دیتا ہے کہ ٹھیک ہے اس درخواست کو فائل کر دو۔ دیکھ لیجیے یہ بذات خود ایک اچھا افسانچہ ہے۔ اس کا عنوان اگر ''فائل کر دو'' رکھ کر شائع کریں تو شاید یہ بہت سے افسانچوں پر بھاری ہو۔ یہ واقعہ بھی ڈھانچہ اس ٹیچر کو سناتا ہے۔ آخر میں چپراسی اس ٹیچر کو ڈھونڈھتا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ یہاں بیٹھے ہیں وہاں پارٹی

میں آپ کو یاد کیا جا رہا ہے۔تقریب ہوتی ہے تقاریر کے بعد اسے وداع کیا جاتا ہے وہ تھکے قدموں سے اپنی گاڑی تک پہنچا تو کوئی اسے گیٹ تک چھوڑنے آیا جس کی آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر التجا تھی ''دیکھو کبھی کبھی آجایا کرو ورنہ میں واقعی مر جاؤں گی'' اختتام اچھا ہے۔مگر ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ جائے تقریب سے ریٹائر ہونے والا اکیلا ہی اپنی گاڑی کی طرف آیا؟ جب کہ روایت تو یہ ہے کہ ریٹائر ہونے والے کو ساتھی ملازمین بڑے اہتمام کے ساتھ گھر چھوڑنے آتے ہیں۔ یہ عجیب سا لگا کہ وہ اکیلا ہی جائے تقریب سے گاڑی تک آیا۔ ماضی کی یادوں کو کھنگالنے کے لیے یہاں ہم کلامی کی بجائے ایک تصوراتی لڑکی ماضی کی یاد دلاتی ہے۔

طویل مختصر افسانوں کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو عارف خورشید کا اپنا الگ انداز ہے۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں عارف خورشید وقت کے ساتھ ساتھ بیانیہ افسانوں کی طرف آ تو گئے مگر ان کے ذہن پر تجربہ تمثیل اور علامت کا اب بھی اثر ہے۔ان کی کہانیاں خیالوں میں سانس لیتی ہیں۔آپ تصوراتی رو میں بہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ایسا نہیں کہ عارف تنہائی پسند انسان ہیں،خود کلامی زیادہ پسند کرتے ہیں یا پھر ماضی کے جھروکوں میں کھو جانا ان کی خو ہے۔کرداروں کی بھیڑ ان کو اچھی نہیں لگتی۔ زماں و مکاں کے بھی یہ قائل نہیں۔ان کا بڑا مقصد اظہار ہے۔ وہ علامت سے ہو، بیانیہ سے ہو، افسانچے سے ہو یا غزل سے،بس اظہار ہونا چاہیے اور فوری۔عارف نے علامتی کہانیاں شاید ان دونوں تخلیق کیں، جب اردو ادب میں علامت کا فیشن در آیا تھا۔ان کی یہ پرانی کاوشیں ہی ہیں جو آپ نے بیسویں صدی کے آخری مرحلے میں بھی اپنے مجموعے ''قافلے والو سچ کہنا'' میں شامل کیں جبکہ یہ آوٹ آف فیشن ہو چکی ہیں۔ یہ شامل ہونا چاہیے تھیں، ادب کی یہ بھی ایک ورائیٹی ہے۔آج کل بھی جو زیادہ پڑھے لکھے افسانہ نگار ہیں اپنا اسٹیٹس دکھانے کی غرض سے علامتی افسانے لکھ رہے ہیں اور کچھ مدیران اُن کے زیر اثر انھیں چھاپ بھی رہے ہیں، مگر وہ قارئینِ ادب کو قبول نہیں۔ بات عارف بھائی کی ہو رہی ہے تو صاحب عارف بیانیہ میں بھی شعور کی رو کو استعمال کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے افسانوں میں ڈرامائی انداز نہیں پایا جاتا۔ کردار، مکالمے، پلاٹ، منظر نگاری، کہانی میں موڑ، یا اختتامی دھما کہ یہ سب لوازمات پائے تو جاتے ہیں مگر دھندلے۔امید ہے میں جو کہنا چاہتا ہوں شاید کامیاب ہو چکا، 'الساس' اور 'آکاش بیل' میں بیانیہ کے لوازمات موجود ہیں یہ کہانیاں شاید تازہ ہیں۔ عارف

زیادہ تر رشتوں کی ناہمواری سے غمگین ہیں ایسا نہیں کہ آپ صرف رشتوں کی ناہمواری کے موضوعات اپناتے ہیں۔اس سے زیادہ آپ کے اندر اپنی قوم کے تئیں درد ہے،قوم کے لیے آپ ہمہ وقت فکر مند ہیں۔مسلمان کیا کر رہے ہیں، کتنے غافل ہو گئے، مذہب کے تئیں کیوں سنجیدہ نہیں۔دنیا کے قدم بہ قدم ترقی کیوں نہیں کر پاتے۔کیوں کنویں کے مینڈک بنے ہوئے ہیں۔اپنی ذہانت اپنی قابلیت کے بل بوتے دوسری قوموں سے آگے کیوں نہیں نکلتے۔یہ سب تفکرات میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہمارے عارف خورشید اپنے کڑے مشاہدات کے بل بوتے اپنی کہانیوں میں جیتے ہیں۔زندگی کو بہت ہی قریب سے دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں ایک سچے اور خدا پرست مسلمان ہیں۔اپنی قوم کے تئیں ان کے جذبات ان کی تخلیقات میں کھل کر ظاہر ہوئے ہیں۔آپ ایک بے خوف اور بے باک ادیب ہیں۔کسی کے سامنے انگلی اٹھانا ان کا شیوہ ہے۔ایسے لوگ پیٹھ کے پیچھے بات نہیں کیا کرتے۔کہانیوں کے حوالے سے اپنے مشاہدات اپنے اردگرد ہونے والی تبدیلیوں، جن کو یہ کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، کے موضوعات ہی اپناتے ہیں۔

ان کے افسانچوں کا ذکر کروں تو سچ پوچھیے مجھے تو عارف بہت آگے چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔میرا اندازہ ہے جو غلط ثابت بھی ہو سکتا ہے کہ ادبی تاریخ میں یہ دور افسانچوں کے زوال کا دور کہلائے گا کیوں کہ ہرا یرا غیرا افسانچے لکھنے لگا ہے۔لوگ افسانچے بناتے ہیں، کثیر تعداد میں، ہزاروں کی تعداد میں جس کی وجہ سے افسانچے کا معیار گر چکا ہے۔بے معنی، پھیکے اور کمزور افسانچے۔آج کا مقبول افسانہ نگار افسانچوں سے پرہیز کرنے لگا ہے۔قبلہ جوگندر پال اور رتن سنگھ کے علاوہ کوئی سینیر افسانہ نگار اس میدان میں سنجیدگی سے نہیں آیا۔جو شخص افسانہ کے رموز کو نہیں سمجھتا، تکنیک سے اسلوب سے واقف نہیں، وہ اچھا افسانچہ نہیں لکھ سکتا۔افسانچوں کے اس تاریک ماحول میں عارف خورشید ایک لائیٹ ہاؤس کی طرح نظر آرہے ہیں، روشنی دکھا رہے ہیں۔ مجھے عارف کے افسانچوں میں منٹو کے سیاہ حاشیے میں شامل چھوٹے افسانوں، جنھیں آج ہم افسانچے ہی کہہ رہے ہیں، کی خوشبو محسوس ہوئی۔'محلے کے بچے' افسانچہ کو ہی لے لیں اس میں ایک تاثر ہے آج کے مسلمانوں پر ایک بھرپور طنز ہے، حقیقت ہے۔افسانچہ پڑھنے کے بعد قاری بہت دنوں تک اس کی گونج محسوس کرے گا، 'ڈائناسور' بھی بھرپور افسانچہ ہے۔دراصل افسانچے کمزور تب ہوتے ہیں جب ہم ہر موضوع (معاف

کیجیے) ہر واقعہ پہ افسانچہ تخلیق کر دیتے ہیں۔ بہت کم واقعات ہوتے ہیں جن کو افسانچے کا لباس پہنایا جاتا ہے اور وہ کامیاب افسانچہ ہو پاتے ہیں۔ یہ بات بھی اپنی جگہ درست کہ ادیب کا ہر فن پارہ شاہ کار نہیں ہوا کرتا۔ بہر حال یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ عارف خورشید جیسے افسانچہ نگاروں کے دم سے یہ صنف پھلے پھولے گی، ورنہ تو قاری بھی مدیر بھی افسانچوں سے اکتا گئے ہیں۔ کچھ ایک دو مدیران جو خود افسانچے تخلیق کر رہے ہیں وہ اس صنف کو مقبول بنانے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔

عارف خورشید علامتی کہانیوں، بیانیہ افسانوں خاص کر افسانچوں کے ایک کامیاب فن کار ہیں، جن کے بارے میں میں عرض کر چکا ہوں کہ آپ کا انداز الگ ہے، ہٹ کر ہے، شعور کی رو کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔ آپ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ شاعرانہ طبیعت کی وجہ سے اپنے افسانوں میں نثری شاعری کرتے ہیں۔ خوبصورت لفاظی، مناسب جملے اور بہترین مثالیں آپ اپنے افسانوں میں پروستے ہیں، جو متاثر کرتے ہیں۔ آپ کی ایک اور خوبی سامنے آئی کہ آپ بیساکھیوں کا سہارا نہیں لیتے، اپنے پاؤں پر چلنا پسند کرتے ہیں۔ میرا مطلب شاید آپ سمجھ گئے ہوں گے، یعنی کسی بڑے ادیب کی سفارش لے کر قارئین کے سامنے نہیں جاتے کہ یہ اچھے فن کار ہیں ان کو پڑھیے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ فن کار اپنے فن کے بل بوتے ادب میں جینا پسند کرتا ہے، اسے کسی طرح کا کوئی احساس کمتری نہیں۔ میں عارف خورشید سے کبھی نہیں ملا افسانوں سے اندازہ ہوا ہے کہ آپ محکمہ تعلیم سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ خدا آپ کو صحت دے، تندرستی دے تا کہ ہم آئندہ بھی ان کے فن سے محظوظ ہوتے رہیں اس طرح کہ:

یہ بھی خبر نہ ہو سکی تیرے خیال میں
آ کر قریب کون کدھر سے گزر گیا

(عارفؔ)

☆☆☆

وقت کے چاک پر

حسن فرخ

جوزف کوزیڈ نے کہا تھا کہ ”دل میں گہرا دکھ لیے میں انگلستان کے لوگوں کی دلچسپی کے واسطے قصے سناتا رہتا ہوں“ لیکن عارف خورشید، دل میں ہزاروں نئے احساسات اور تجربات مسلم معاشرے کے متوسط طبقے کی گھریلو زندگیوں کے بھولے بھالے لمحوں کی کہانیاں فن کارانہ انداز اور تخلیقی رو کے ساتھ اُردو والوں کی سمع گوشی کے واسطے قصوں خاکوں اور افسانچوں میں نہیں، شاعری کے وسیلے سے سناتے رہتے ہیں ان کی فکر، اسلام کے اخلاقی اقدار اور حسیت سے مملو ہے، ایسا لگتا ہے کہ عارف خورشید کو اپنے معاشرے میں جذب ہو جانے والی گھٹن اور جوانی کے فطری تقاضوں کے نادانستہ ارتکاب کا شدید احساس ہے اور یہ بھی کہ ۔

نا کردہ گناہی کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

عارف خورشید نے افسانے کے تعلق سے لکھا ہے کہ ”زندگی کے متوازی چلنے والا افسانہ“ ان کے خود متعین کردہ اشاراتی معیار سے اگر دیکھا جائے تو ”وقت کے چاک پر“ شامل چار افسانے مجھے تو زندگی کا حصہ معلوم ہوئے اور ساتھ ہی ایسی ہی کیفیتوں کا اظہار جن کا احساس تو سبھی کو رہتا ہے لیکن اسے سپرد الفاظ کرنے سے زیادہ تر کو جھجک محسوس ہوتی ہے۔

عارف خورشید کا کہنا ہے کہ:

”افسانہ نگار کی ذمہ داری ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے اس کے بارے میں جانتا ہو۔ افسانہ زمین سے اٹھتا ہے تو کچھ سوالات لے کر اٹھتا ہے۔“

”شجر ممنوعہ“ میں ایسے کچھ سوالات ہیں کہ کیا ایک ایسا شخص جو بڑی مستعدی سے کئی بار فتح کا جھنڈا اگاڑ چکا ہو، ایک ناکامی اس کی کمزوری کیسے ہو سکتی ہے۔ غازی کی اس ناکامی کی بھی جو نفسیاتی وجہ ہو اس کا اظہار مبہم ہے۔ منٹو نے ”ٹھنڈا گوشت“ میں ایسا ناکامی کا بھرپور نفسیاتی ردعمل دکھایا تھا جبکہ

صنف نازک کا ردعمل بے حد انتہا پسندانہ تھا۔ شجر ممنوعہ میں ملکہ کا ردعمل ''انتظار کی بے اطمینانی ہے جو کہ ٹھنڈا گوشت اور شجر ممنوعہ کے کرداروں کے سماجی و معاشرتی فرق کو واضح کرتا ہے۔''

اس افسانے میں ہیرو (غازی) کے ماضی کے لمس اور لذت کے تجربات اس کی حال کی زندگی پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ کیا یہ کامپلکس شبینہ کا دور تک ساتھ چلنا مگر منزل تک پہنچنے سے منع کر دینے کی مایوسی اور تشنگی کا پیدا کردہ تو نہیں کہ غازی کو ہر ایسے لمحے میں ماضی کے واقعات آ کر ستاتے اور اسے نفسیاتی الجھن میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

''وقت کے چاک پر'' میں چار خاکے ہیں جن میں قاضی سلیم کے خاکے کو پڑھنے سے ان کی وہی شخصیت ابھرتی ہے جیسی کہ بہت سے لوگوں کے تصور میں ہے لیکن حال ہی میں اثر فاروقی نے نہ صرف قاضی سلیم بلکہ بشر نواز کے بارے میں بھی بہت ہی خطرناک قسم کے انکشافات کیے ہیں اور ان دونوں کی ایک بالکل ہی جدا شخصیت کو پیش کیا ہے۔ اب ان میں کس کا تجربہ یا مشاہدہ درست ہے یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ ایک اچھے تخلیق کار میں بعض شخصی کمزوریاں تو ہو سکتی ہیں لیکن اس کا کردار، منفی نہیں ہو سکتا۔ قاضی سلیم اور بشر نواز بہت اچھے شاعر ہیں۔ اسی لیے ان کے کردار کے تعلق سے کسی طرح کی بدگمانی مشکل ہی ہے۔

عارف خورشید کے ''وقت کے چاک پر'' میں قاضی سلیم کا خاکہ ہے جس سے ایک شاعر کا تصور ابھرتا ہے۔ کچھ دن قبل راشد آزر نے ایک دلچسپ تبصرہ پروفیسر انور معظم کا سنایا تھا ان دنوں قاضی سلیم اورنگ آباد میں سراج پر سیمنار اور جشن کر رہے تھے۔ انور معظم سے ایک ملاقات میں راشد آزر نے پوچھا کہ کیا آپ اس میں جا رہے ہیں انور معظم نے جواب دیا کہ ہاں بھئی وہ تو جانا ہی پڑے گا۔ اس کے بعد انور معظم نے وجد کے شعر میں تصرف کرتے ہوئے سنایا۔

دو سو برس میں آج سراجؔ و ولیؔ کے بعد
قاضی سلیم اٹھے ہیں اٹھ کر کریں گے کیا؟

اس حصے میں قاضی سلیم کے علاوہ حمید سہروردی، جاوید ناصر اور رشید انور کے خاکے ہیں۔ خاکوں کا انداز بھی ان کے قول کے مطابق ہے۔ قلم کار اپنا حکم صادر نہیں کر سکتا کیونکہ کردار کا اپنا کردار ہے۔ عارف خورشید نے ان خاکوں میں واقعی اپنا حکم صادر نہیں کیا بلکہ جن پر بھی خاکہ لکھا ہے ان کے کرداروں کو ابھارا ہے۔

افسانچہ کے حصے میں ترپن افسانچے ہیں۔ انتظار حسین کے بقول تخلیق بنیادی اور فطری طور پر آوارہ گرد ہوتی ہے لیکن تخلیقی فنکار اسے اپنے پلاٹ یا تصور میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ عارف خورشید نے اپنے افسانچوں میں اس قول کی سچائی کا ثبوت پیش کیا ہے۔

افسانچے کے بارے میں ان کا یہ کہنا کہ اپنی ابتداء سے پہلے اور اختتام کے بعد بھی جاری رہنے والا افسانہ ان کے تمام ترپن افسانچوں میں سے اکا دکا کو چھوڑ کر سب اس تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ ان سبھی افسانچوں میں عارف خورشید نے سماجی و معاشرتی ڈھانچہ میں موجود حقائق کو، جن میں سے بعض کو وہ برائی یا سماجی لعنت سمجھتے ہیں، بڑے خوبصورت کلائمکس کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ کفایت لفظی سے کنارہ نہ کیا جائے۔ ان میں سے بعض افسانچوں کا طنز بہت گہرا لیکن موجودہ ریاکارانہ انداز کا پرتو ہے۔ مثلاً افسانچہ ہے ''اللہ کا گھر'':

''کتنا نیک آدمی ہے گھر کے ساتھ ساتھ مسجد بنا رہا ہے۔

مسجد کے ساتھ ساتھ گھر بنا رہا ہے۔''

ایسے افسانچوں میں جن پہلوؤں کو عارف خورشید نے اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے ان میں سے بعض سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے جو کہ ہر شخص کی انفرادی سوچ کا تابع ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود عارف خورشید کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھنے اور اس کے اظہار کا حق حاصل ہے اور ہمیں بھی ان سے اختلاف کا حق حاصل ہے۔ ہمیں کسی تخلیق کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے نقطہ نظر یا پھر مرکزی خیال یا فکر کے بارے میں اظہار خیال سے پہلے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جس نکتے کو تخلیق کا موضوع بنایا گیا ہے اس کی کامیاب پیش کشی ہوئی ہے یا نہیں۔ ایک افسانچہ ہے۔ ''محلے کے بچے'':

''اس کے بچوں سے سارا محلہ پریشان تھا

اس نے تنگ آ کر اپنے بچوں کو دینی مدرسے میں ڈال دیا۔

اب وہ فارغ ہو کر لوٹے ہیں تو سارا شہر پریشان ہے۔''

یہ افسانچہ بھی بھرپور طنز کا حامل ہے، تاہم یہاں غور و فکر کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ پوری سچائی نہیں۔ ہمارے سماج میں ان دنوں انتہا پسندوں کی تعداد کا بہت بڑا حصہ پڑھے لکھوں پر مشتمل ہے۔ جن میں سے زیادہ تر ایم بی بی ایس، انجینئر، انفارمیشن ٹکنالوجی کے ماہرین اور سائنس کے گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کی تعداد زیادہ ہے۔ عارف خورشید کی یہ کتاب بہر قیمت دعوت مطالعہ دیتی ہے۔ ☆☆

ایک کولمبس شاعر اپنی سوچ کے جزیرے میں

حماد انجم

میں نے عارف خورشید کو نہیں دیکھا۔ ان کو پڑھنے کی توفیق ضرور حاصل ہوئی مگر رسالوں میں۔ ایک دن ان کا ایک مجموعۂ کلام ڈاک سے ہم دست ہوا۔ کتاب کے دونوں طرف صاحب کتاب کی تصویر چھپی تھی اس کے نیچے عارف خورشید لکھا ہوا تھا۔ میں تصویر دیکھتا رہا۔ گویا ادب کا اینگری ینگ مین، ایک خشمگیں جوانِ رعنا، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر محوِ کلام تھا۔ ''سوچ کے جزیرے'' میں بیٹھا اردو کا شاعر، ادیب، افسانہ نگار، تبصرہ نویس مجھے اپنی شاعری کی تلاوت کے لیے مجبور کر رہا تھا۔ فکر کا یہ جزیرہ ثلاثیوں اور غزلوں سے معمور دعوتِ شوق دینے لگا۔ اندھیروں کی مسرت، اجالوں کی خوشی، آدھی رات کا سناٹا اور دوپہر کی کڑی دھوپ حرف ولفظ کے اس جزیرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ نعت کے دو پھول اپنی خوشبو لٹا رہے تھے۔ زباں پہ ''صَلِّ علیٰ'' رقص کر گیا میرے۔

☆

رب کے پیارے سب کے پیارے آپؐ ہیں
آدمیت کے سہارے آپؐ ہیں!
تیرگی میرا مقدر کیوں بنے
نور برساتے نظارے آپؐ ہیں!

☆

صلوٰۃ ورد کروں یہ اصول کافی ہے
طلب چمن کی نہیں، ایک پھول کافی ہے
نہ مال و زر کی ہوس ہے نہ جاہ و منصب کی
حضور آپؐ کے قدموں کی دھول کافی ہے

ثلاثی میں نعت رنگ کا نظارہ ہوتا ہے۔عارف خورشید کہتے ہیں۔

سب سے پیارے ہو اتنا کافی ہے
تاج کی تخت کی ضرورت کیا
تم ہمارے ہو اتنا کافی ہے

یہ نظم اتنی مہارت سے لکھی گئی کہ مجھے اس میں نعت کا تیور نظر آیا۔زاویہ بدلا تو مجھے تین مصرعوں کی یہ غزل معلوم ہوئی پھر پردہ گرتا ہے اور نظم سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے۔معاً اینگری ینگ مین شاعر کی یہ ثلاثیاں مجھے اپنی طرف کھینچ لائیں۔

لفظ کو وار کے نہ کم سمجھو
میرے ہاتھوں میں ہے قلم دیکھو
اس کو تلوار سے نہ کم سمجھو!

اور کچھ بھی نہیں کہانی میں
میں ہوں ساحل پہ ہاتھ میں پتھر
دائرے بن رہے ہیں پانی میں

دنیا میں آدمی اپنے منصب کی تکمیل میں سرگرم رہتا ہے۔اس کی تگ وتاز جاری رہتی ہے۔ایک ایک سانس پہاڑ کے پتھر کی مانند لڑھکتی چلی جاتی ہے۔پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا ہے۔زندگی کا یہ مکمل فلسفہ ہے۔

فکر کو اپنی فاش کرتا ہوں
مل رہے ہیں جہاں زمین و فلک
میں کسی کو تلاش کرتا ہوں

کیا بتائیں تمھیں کہ کیسے تھے
ریزہ ریزہ بکھر گئے ورنہ
ہم بھی اک دن چٹان جیسے تھے

کائنات بھر کہانی تین تین مصرعوں میں نظم ہوتی چلی گئی۔ فن کار اپنے خونِ جگر کو نچوڑتا رہا اور اس کی سرخی سے شعر اسکیچ کرتا جا رہا ہے۔ اور ساتھ ساتھ سوچتا جاتا ہے۔

یاد کب اس کا ساتھ چھوڑے گی
سوچتا ہوں کہ شاعری اپنی
اور کب تک لہو نچوڑے گی

پھر حوصلہ للکار بن جاتا ہے۔

ہر مسرت کو تج کے دیکھوں گا
ڈھال کر عشق اپنی سانسوں میں
حسن سے بھی الجھ کے دیکھوں گا

یہاں شاعر پھر اسی اینگری ینگ مین کے فارم میں آ گیا۔ پتھر کے سینے میں دفعتاً ایک گداز جذبہ بیدار ہوتا ہے اور یہ ثلاثی بھی نمو پذیر ہو جاتی ہے۔

دھڑکنوں پر شباب آ جاتا
ہر تمنا جوان ہو جاتی!
تو اگر بے نقاب آ جاتا

پھر خطروں سے کھیلنے کا عمل شروع ہوتا ہے اور میرے سامنے یہ ثلاثی اپنی آب و تاب کے ساتھ لہرا اٹھی۔

ٹھوکروں نے ہمیں سنبھالا ہے
کس کو خطرات سے ڈراتے ہو
ہم کو خود حادثوں نے پالا ہے

پھر جھنجھلاہٹ پر نظم ہوتی ہے۔

عہد ماضی نچوڑ کر دیکھا
تیری زلفوں کی یاد میں ہم نے
پھول ہر روز توڑ کر دیکھا

☆

تیر یوں دل پہ مارنے والے
نام اپنا کبھی بتا تو سہی
مجھ کو ہر شب پکارنے والے

غموں کی آرزو کرنے والا......غم کوفن کا محرک جاننے والا......آخر دھیرے دھیرے اس منزل پہ آ گیا۔

کتنے رشتوں کے درمیاں ہے کوئی
اس کو پایا بھی اب تو کیا پایا
خالی خالی سا اک مکاں ہے کوئی

شام سے سو رہا ہے وہ ایسے
صبح سے بھی نہیں غرض کوئی
رات سے بھی ہے وہ خفا جیسے

اب کلائمیکس یہاں نظر آتا ہے زندگی کی کہانی کا......زندگی سے سوال کیا جاتا ہے۔

غم ہے کم ، درد پر زیادہ ہے
موت نے اپنے پنجے گاڑ دیے
زندگی تیرا کیا ارادہ ہے

اب یہاں سے ''غزل'' قاری کوخوش آمدید کہتی ہے۔عروض کے پیمانے میں الفاظ وتخیل کی مئے شہداب ڈھالی گئی ہے۔

حکم ثانی کا منتظر ہوں میں
ناگہانی کا منتظر ہوں میں
جی رہا ہوں مگر ابھی عارفؔ
زندگانی کا منتظر ہوں میں

جب کوئی مہربان ہوتا ہے
ہم کو کیا کیا گمان ہوتا ہے
کرنے لگتی ہے آنکھ ہی باتیں
جب کوئی بے زبان ہوتا ہے
غم اترتے ہیں جس جگہ عارف
وہ ہمارا مکان ہوتا ہے

سکون مجھ سے چھین کر وہ اضطراب دے گیا
ہے ریت ریت زندگی عجب سراب دے گیا
وہی ہے عارف آج بھی قدم قدم پہ ساتھ جو
مری غزل غزل کو ایک اضطراب دے گیا

وقت کے چاک پر لفظوں کا کوزہ گر شعر کی زبان میں گفتگو کر رہا تھا اور میں ہمہ تن گوش بر آواز تھا۔ کتاب کی مکمل ورق گردانی کر لینے کے بعد مجھے یک گونہ انبساط کا احساس ہوا اور اطمینان کا سانس لے کر مجموعہ کلام کو ایک جانب رکھ دیا ...... میں سوچ رہا تھا کہ آسمانِ ادب کا یہ تابندہ سیارہ جسے اورنگ آباد دکن کا عارف خورشید کہتے ہیں ادب اور فن کے کتنے مدار میں گردش کرتا ہے۔ کبھی نثر کے مدار میں آتا ہے تو افسانے، ناول، خاکے اور تبصرے کا انبار لگا جاتا ہے۔ شاعری کے مدار میں گردش آمادہ ہوتا ہے تو نظموں اور غزلوں کے نمونے قرطاس پر لعل و زمرد کی مانند بکھر جاتے ہیں۔ اس جاندار سیارے کی ادبی روشنی اپنی بہار دکھاتی جا رہی ہے۔ شاید لفظ ''خورشید'' کی یہ معجز نمائی بھی ہے جو ایسا اقبال عارف کی قسمت میں آیا ہے۔ پٹنہ میں عالم خورشید اور خورشید اکبر کا اقبال جاگ رہا ہے تو اورنگ آباد دکن میں عارف خورشید کا۔ دعا ہے کہ ادب کا یہ سورج بھی اوجِ نصف النہار حاصل کرے اسے کبھی زوال نہ آئے۔

کرنوں کی دعائیں رہیں پانی میں پگھلتی
سورج کو گناہوں کا علاقہ نہیں ملتا!

عارف کی مندرجہ ذیل ثلاثی محل نظر ہے کیونکہ قافیہ کا فقدان پایا جاتا ہے۔ دوسری ثلاثی ''ذوقافیتین'' ہے۔

تم ہو ناداں تو گم رہو[1] گے ہی
تم سے چھٹ کر بھی ساتھ ہوں ہر پل
میں جہاں ہوں وہاں رہو گے ہی

دیکھ[2] فرقِ گدا و شاہ یہاں
لوگ کہتے ہیں مفلسی جس کو
اس سے بڑھ کر کوئی گناہ کہاں

اسی طرح ایک غزل کا مطلع بھی محل نظر لگا۔

گرتے گرتے سنبھل بھی جاتا ہوں
ساتھ تیرے جدھر بھی جاتا ہوں!

پوری غزل میں قافیہ ''جدھر'' کے ہم وزن قافیوں کو نبھایا گیا ہے۔ مطلع کے پہلے مصرعے میں ''سنبھل'' قافیے سے خارج ہے۔ نظرثانی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

''سوچ کے جزیرے'' میں بیٹھا ہوا شاعر اپنی سوچ میں غرق کسی دیگر جزیرے کی دریافت میں فکر مند ہے خدا کرے عارف خورشید کے سوچ سمندر میں نئے نئے جزیرے اسی طرح ابھرتے رہیں۔

[1] ''گم رہنا'' اور صرف ''رہنا'' (قیام کرنا) الگ الگ ہیں۔
[2] اس ثلاثی میں قافیہ کی کوئی غلطی نہیں ہے۔

☆☆☆

عارف خورشید: حیات نامہ و ادبی سفر

حمایت علی خان

اگر آپ اردو ادب سے تعلق رکھتے ہوں اور مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں تو آپ عارف خورشید سے ضرور واقف ہوں گے، ان کی تخلیقات کا مطالعہ بھی کیا ہوگا۔ آیئے میرے ذہن میں عارف خورشید کا جو خاکہ محفوظ ہے میں اُس سے آپ کو متعارف کر دوں۔

نام عارف علی خان، قلمی نام عارف خورشید، پستہ قد، گندمی رنگ، گٹھیلا جسم، چوڑا چکلہ چہرہ دل اور سینہ کشادہ، سنجیدہ متین طبع مزاج نہایت پر کشش لب ولہجہ، بات کرتے ہیں تو منہ سے ادبی مہک چاروں طرف بکھر جاتی ہے اور ایک پراگندہ ماحول سے ایک خوشگوار ماحول بن جاتا ہے۔

عارف خورشید جیسا کے آپ بھی واقف ہیں۔ ایک ممتاز مشہور و معروف افسانہ نویس، ناول نگار ایک عمدہ شاعر و مصور کی حیثیت سے ہندوستان بھر میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ویسے میں آپ کو بتاتے چلوں اِن کے خاندان میں کوئی ادیب، شاعر یا مصور نہیں ہوا۔ عارف نے اپنی بے پناہ خداداد صلاحیتوں کی بنا پر اردو ادب میں ملک کے صف اول کے فنکاروں میں اپنا مقام بنایا۔ اس فن کی منشی پریم چند، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر اور جیلانی بانو جیسے قد آور فنکاروں نے اپنے خون پسینہ سے آبیاری کی اور عارف نے نئے لب ولہجہ سے اس افسانہ نویسی کو روشناس کروایا، اس کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔

عارف کے تخلیق کردہ شہ پاروں پر مزید روشنی ڈالنے سے قبل میں اُن کی نجی حالاتِ زندگی سے واقف کرانا چاہوں گا۔

دراصل عارف کا خاندانی سلسلہ افغانستان سے عارف کے آبا و اجداد یعنی ان کے دادا ولایت علی خان ان کے صاحبزادے احمد علی خان وغیرہ ایک افغانی قبیلہ کے ہمراہ ہندوستان آکر یوپی کے قصبہ شاہ جہاں پور میں مقیم ہوئے۔ عارف کے والد بزرگوار مصطفٰے علی خان، احمد علی خان کے صاحبزادے ہیں کہتے ہیں کہ تقی حسن خان کے جدامجد بھی اُسی افغانی قبیلہ کے ساتھ ہندوستان آئے تھے اور وہ خاندان

بھی شاہ جہاں پور ہی میں سکونت پذیر ہوا۔ بعد میں ہر دو خاندان اورنگ آباد منتقل ہو گئے۔

بیسویں صدی کے پہلے پچاس سال پوری دنیا کے لیے ایک تاریخ ساز عہد کہلاتا ہے۔ ہندوستان ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوا اور پھر اس کے بعد قتل و غارت گری کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس میں لاکھوں بے گناہوں کو شہید کر دیا گیا۔ اس عذاب کے اثرات ابھی زائل بھی نہیں ہوئے تھے کہ عارف ۱۹۵۰ء میں اس دنیا میں تشریف لائے جبکہ سارا ملک فرقہ پرستی کی آگ میں جل رہا تھا۔

۱۹۶۰ء میں عارف کے والد بزرگوار رحلت کر گئے۔ اب عارف کی اور اہل خاندان کی کفالت کی ذمہ داری ان کے دو حقیقی ماموں یعنی محمد یونس صدیقی اور محمد ایوب صدیقی پر آن پڑی تھی۔ دونوں ماموں کا شمار شہر کے معزز تاجروں میں ہوتا تھا۔ بہر حال عارف کو فوقانیہ اسکول میں داخل مل ہی گیا اور بفضل تعالیٰ ان کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ عارف نے میٹرک کے بعد ڈرائنگ کے امتحانات پاس کیے اور مولانا آزاد ہائی اسکول اورنگ آباد میں بحیثیت ٹیچر ملازمت حاصل کر لی۔ ملازمت کے دوران انہوں نے ڈی ایڈ، بی پی ایڈ، بی کام اور اردو سے ایم اے کی ڈگری بھی حاصل کی۔

اب حالات کسی قدر ہموار ہو رہے تھے کہ ۱۹۶۴ء میں ان کی والدہ ماجدہ اقبال آراء بیگم اس دارفانی سے کوچ کر گئیں۔ یہ سانحہ عارف کے لیے ناقابل برداشت ضرور تھا لیکن عارف نے حوصلہ ٹوٹنے نہیں دیا اور زندگی کا سفر ماموں کی زیر سرپرستی جاری رکھی۔ ۱۹۷۳ء میں تایا عبدالرشید خان (حیدرآباد) کی دختر فرحانہ بیگم سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ ان سے ان کے تین صاحبزادے ہیں جن کے اسم گرامی مصطفیٰ علی خان، ڈاکٹر مجتبیٰ علی خان اور مرتضی علی خان ہیں۔ ماشاءاللہ تینوں بھی برسر روزگار ہیں۔

عارف کو طالب علمی کے زمانہ سے مطالعہ کا شوق تھا، انہوں نے نہ صرف ہندو پاک کے نامور فنکاروں کی تخلیقات کا بغور مطالعہ کیا بلکہ ان کے تجربات سے سبق سیکھ کر خود بھی ایک افسانہ نگار، ناول نگار اور شاعری کے مشہور تخلیق کار بن گئے۔

ان کے پسندیدہ افسانہ نگار سعادت حسن منٹو اور پاکستان کے احمد ندیم قاسمی ہیں۔ پسندیدہ شاعر غالب اور پاکستان کے شاعر فیض احمد فیض ہیں۔ عارف کا پہلا افسانہ ''اسپیشل مزار'' ۱۹۷۲ء میں کالج کے میگزین میں شائع ہوا اور بہت مقبول ہوا۔ ان کا پہلا ناولٹ ''لہولہو آرزو'' جسے اردو زبان کی

فصاحت اور بلاغت کا ایک شاندار نمونہ ہونے کا شرف حاصل ہے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ پھر اس کے بعد عارف نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ عارف کی اب تک ۱۶ سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور کچھ زیرِ طبع ہیں۔

عارف کے پہلے ناول ''لہولہو آرزو'' کے پیش لفظ میں ڈاکٹر عصمت جاوید مشہور مفکر دانشور ماہر لسانیات یوں رقم طراز ہیں کہ ''عارف خورشید کا زیرِ نظر ناولٹ ایک فنی تجربہ ہے۔ عارف خورشید کی پشت پر فنی تجربوں کی ایک شاندار اور جاندار روایت ہے، جس نے آج کے قاری میں ہر شعور کو بیدار کیا ہے۔ ادب نہ خارجی زندگی کا عکاس ہے اور نہ مصور وہ تو باطنی الجھنوں اور محرومیوں کا کہیں علامتی اظہار ہے اور کہیں پیکری اظہار''۔ آگے لکھتے ہیں ''اس ناولٹ میں ڈرامائی ''خود کلامی'' کی ٹیکنیک اپنائی گئی ہے، جس میں ایک بولنے والا اور دوسرا سننے والا ہے جو اس کے سامنے نہیں ہے۔ اپنی بپتا سنانے والا واحد متکلم ''میں'' ہے جو سخت جذباتی ہیجان میں مبتلا ہے اسے ایک ناکام عاشق کے دکھے ہوئے دل کی پکار سمجھئے۔''

منشی پریم چند اردو افسانے کے بابائے آدم کہلاتے ہیں۔ انہوں نے اردو ادب کے بارے میں کہا ہے کہ جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح نہ بیدار ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے۔ ہم میں قوت و حرارت نہ پیدا ہو، ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے جو ہم میں سچا ارادہ و مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال نہ بیدار کرے وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے۔ اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہوتا۔ منشی پریم چند انجمن ترقی مصنفین کی پہلی کانفرنس اپریل ۱۹۳۶ء میں اپنے صدارتی خطبہ میں کہتے ہیں: زبان بول چال کی بھی ہوتی ہے اور تحریری بھی۔ بول چال کی زبان تو میر امن اور للو کے زمانہ میں بھی موجود تھی۔ انہوں نے جس زبان کی داغ بیل ڈالی وہ تحریر کی زبان تھی اور وہ ہی ''ادب'' ہے ہم بول چال سے اپنے قریب کے لوگوں سے اظہارِ خیال کرتے ہیں، اپنی خوشی یا رنج کا نقشہ کھینچتے ہیں، ادب وہی کام تحریر سے کرتا ہے۔

مندرجہ بالا دانشوروں کے خیالات کے پس منظر میں ہم عارف خورشید کی تخلیقات کا سنجیدگی سے جائزہ لیں تو وہ ان پر ایمانداری کے ساتھ پورے اترتے ہیں۔

آخر میں، میں عارف خورشید کی ادبی خدمات پر انھیں دلی مبارک دیتے ہوئے مضمون کو اس دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ ''اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔''

☆☆☆

افسانہ نگار، ناول نگار، شاعر، تبصرہ نگار

رخشندہ روحی

عارف خورشید صاحب کی کتاب 'وقت کے چاک پر' پڑھی۔ پہلا صفحہ کھولتے ہی ان کی بات دل کو جا لگی، کہتے ہیں۔ ''میری کاوش کو سکہ بند نقاد یا منصوبہ بند ناقص کے نظریہ سے دیکھنے کے بجائے اپنی نظر سے دیکھیے اور فیصلہ کیجیے۔''

ان کے مشورے پر ثابت قدم رہ کر ان کے افسانوں و افسانچوں کو اپنی نظر سے دیکھ کر اپنی رائے دینے کی کوشش کرتی ہوں۔ کیونکہ ایک قاری ہوں نہ کہ نقاد!

زیر نظر کتاب میں چار افسانے، ایک تبصرہ، چار خاکے اور باون افسانچے شامل ہیں۔ پہلا افسانہ 'شجر ممنوعہ' ہے۔ ان کی یہ رومان پسند کہانی عورت کو حسی لطافت و سحر آگیں پیکر عطا کرتی ہوئی اس کے طلسماتی حسن کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ بیوی کے پہلو میں محبت اور پہلا لمس کس قدر ہیجان انگیزی پیدا کر سکتا ہے۔ تخیل کی روش پر وہ اپنی محبوبہ کے سراپا میں ڈوب ڈوب گئے ہیں۔

''چہرے پر دو دیئے جھلملا رہے تھے۔ ہونٹوں پر گلاب دم توڑ رہے تھے۔ رخساروں پر دنیا ہر مسرت ٹھہر گئی تھی۔ گردن پر ایسے جاذب نظر رنگ بکھرے تھے جس کو مصور دیکھتا ہی رہ جاتا۔ پہاڑیوں سے اترتی کئی ندیوں کے بل کمر پر نچھاور ہو رہے تھے۔ وہ ان ساری ندیوں میں اکیلا بہتا چلا گیا۔''
جب وہ حقیقت کی سرزمین پر واپس ہوتے ہیں تو کیا خوبصورت بات کہتے ہیں۔

''ماضی سے لوٹ کر وہ بہت تھک گیا تھا۔'' لفظیات کی جدت و تازگی کے ساتھ احساسات اور تجربات کا تخلیقی اظہار بڑی سادگی اور پرکاری سے کر جاتے ہیں۔

دوسرا افسانہ ہے ''سات چاند''، ابھی تک تو چاند چہرہ ہی پڑھا اور سنا تھا، لیکن عارف صاحب عورت کے ناز و انداز اور جسم کے حصوں کو چاند سا کہتے نہیں تھکتے ہیں۔

''عورت کے سراپا میں چار چاند نظر آتے ہیں۔ جیسے چاند دوپٹہ اوڑھے افق سے طلوع ہو رہا ہو، چہرے پر دو چاند چمک رہے ہوں، چوٹی میں پروئے ہوئے چاند دمک رہے ہوں، سینے پر دو چاند

ایستادہ ہوں، چوٹی کا سرا دو چاند پر ٹکا ہوا ہو۔"

دوسری عورت سے وابستگی کی وجہ سے محرومی کا عجب سا اظہار عجب سی وارفتگی ان کے اس جملے میں نظر آئی۔

"دوسری عورت کی جو چیز آپ انجوئے کر لیتے ہیں وہ آپ کی بیوی میں کم ہو جاتی ہے......"

تیسرا افسانہ ہے "داستان مرکب ہے"، اس افسانے کو میں کئی بار پڑھنے پر بھی ٹھیک سے سمجھ نہ پائی......انسانی درد و کرب محبت کی دل نوازیاں اور سچائیاں کمال ضبط کی شدت۔! اس کہانی میں کئی موقعوں پر نظر آتے ہیں۔ "ہر معلمہ کو وہ ماں کی نظر سے دیکھتا اور خود کو باپ سمجھتا۔" انسانی مزاج کی یہ عجیب و غریب گتھی ہے جو سلجھانے سے اور الجھتی سی لگتی ہے۔

چوتھا افسانہ ہے "بے آواز شہادت"، تعلیمی میدان میں کس درجہ اور کس طرح کا کرپشن پھیل رہا ہے۔ اساتذہ اور اسکول کالج صرف پیسہ بٹورنے کی مشینیں ہیں۔ اس تمام کاروبار میں ملوث لوگوں کی عارف صاحب نے باریک بینی سے مناسب الفاظ میں عکاسی کی ہے۔

"سوال نوجوان کیا کرتے ہیں اور تم......تم جواب دینے والوں کی صف میں آگئے ہو......"

"جب آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تو اصل میں کھل جاتی ہیں۔"

"ایک مدرس رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف میں بیٹھتا ہے اور رجسٹر حاضری پر دستخط بھی کرتا ہے۔

دوسرا جماعت میں کرسی پر پیر اٹھا کر بیٹھ جاتا ہے اور پنج سورہ پڑھتا رہتا ہے۔ جب طلبہ زیادہ شور کرتے ہیں تو چلا کر کہتا ہے، "چپ بیٹھو حرام زادو! میں پنج سورہ پڑھ رہا ہوں۔ باتیں کرو گے تو گناہ ملے گا......"

"اس کا منہ کھلتے ہی آواز کی لہروں سے کمرے میں پھر سے اجالا ہو گیا۔" تخیل کی پرواز کتنی اونچی ہے کہ ابھی صرف منہ کھلا ہے اور کمرہ منور ہو گیا۔

"میٹرک میں انگلش کے پرچے میں زیادہ طلبہ فیل ہو گئے۔ سوسائٹی کے صدر نے ٹیچر کو طلب کیا اور کہا تمھارا پرفورما خراب ہے۔ وہ پریشان نظروں سے ٹیبل پر رکھے کاغذات کو دیکھنے لگا۔ صدر مدرس نے کہا صاحب پرفورمنس بول رہے ہیں۔" اونچے عہدوں پر براجمان افسران کی قابلیت!!

''تم خوبصورت ہو۔ مرد خوبصورت ہوتا ہے، عورت اپنی محبت کو، اپنی چاہت کو حسین ہی کہتی ہے چاہے وہ دنیا کی نظر میں کچھ بھی ہو۔ یہ جملہ میرے دل کو ایک خوشی دے گیا کہ مرد ہو کر وہ عورت کے جذبات کیا خوب سمجھتے ہیں۔

ان کی شخصیت کی کئی فکری وفنی خصوصیات ہیں۔ دور حاضر کا اضطراب، سیاسی انتشار وانسانی تہذیب کا زوال سب پر ان کا بے باک قلم اپنی نفاست کے ساتھ رقم طراز ہے۔ اپنے خیالات وجذبات کا اظہار کئی فنی ذرائع سے کرتے ہیں۔ شاعر، افسانہ نگار، تبصرہ نگار......اوصاف ثلاثہ کے میدان میں وہ پوری مستعدی کے ساتھ ڈٹے ہیں۔ ان تمام فنون کا یک جا ہونا ان کی رنگارنگ شخصیت ہے۔

ان کے افسانوں میں سماجی شعور وآگہی عام آدمی کی زندگی کے مسائل اور ہلکے پھلکے طنز کی چھیڑ چھاڑ موجود ہے۔ جو بیک وقت دل کو افسردہ ہونے سے باز رکھتی ہے۔ شاعری وادب فنون کے اس ملاپ سے ان کی کہانیاں باریک احساسات کی آئینہ دار ہیں۔

عارف خورشید نے معمولی موضوعات کو شدت سے محسوس کیا اور فنی سلیقے سے ،لفظیات کی روانی سے قاری کو متحیر کر دیا۔ انھوں نے زندگی کے نشیب وفراز کو سادہ اور عام فہم انداز میں پیش کیا ہے۔ زبان وبیان کی روانی عام انسانی زندگی کو سچ اور مبالغے کے درمیان بھٹکنے نہیں دیتی، بلکہ جو پیغام وہ دینا چاہتے ہیں، بہ آسانی قاری کے ذہن ودل تک پہنچتا ہے۔ الفاظ کی کفایت شعاری معانی کو تند کر دیتی ہے، جو خاص انہیں کا حصہ ہے۔

عارف خورشید صاحب نے مختصر افسانوں کو موضوعاتی، تکنیکی اور تخلیقی سطح پر ایک نئی روشنی سے روشناس کرایا۔ ان افسانچوں میں ان کی اپنی شناخت ایک نئی جہت کے ساتھ نمایاں ہے۔ چلہ، حج، اللہ کا گھر، میوٹ، قرآن کی زبان، بیلینس، سچ کہوں گا، مالک، جسم وجاں، گشت، حور۔۔ یہ افسانچے میرے ذہن میں محفوظ ہو گئے ہیں۔

☆☆☆

ایک ہمہ جہت فنکار

ڈاکٹر رضوان انصاری

عارف خورشید اردو زبان و ادب کے ان شیدائیوں میں سے ایک ہیں جو جنوبی ہندوستان میں پرچم اردو کو صرف لہرا ہی نہیں رہے ہیں بلکہ اس کی آبیاری میں اپنے خون جگر کا بھی استعمال فرما رہے ہیں۔ عارف خورشید اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ آپ کے مقالات، تنقیدی مضامین، خاکے اور شعر و نغمہ ملک کے موقر جرائد و رسائل میں بیشتر شائع ہوتے رہتے ہیں۔

عارف خورشید کثیر التصانیف صاحب قلم دانشور ہیں۔ نثر و نظم دونوں اصناف ادب میں خوب لکھتے ہیں۔ یہ دراصل ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں مگر غزل کی زلفیں سنوارنے میں بھی کسی اردو شاعر سے پیچھے نہیں۔ ان کا دل و دماغ صرف ایک صنف کی خدمت کر کے مطمئن نہیں رہتا ہے بلکہ وہ تبصرے اور خاکے بھی تحریر کرنے میں پیش پیش رہتا ہے۔ اب تک تقریباً ڈیڑھ درجن کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن میں افسانے، ناولٹ، خاکے، افسانچے، تبصرے، ثلاثیاں، غزلیں اور تنقیدی مضامین وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

عارف خورشید سے میری براہ راست کوئی ملاقات نہیں، اس لیے میں ان کی شخصیت سے نہ متاثر ہوں اور نہ مرعوب، البتہ ان کی تخلیقی استعداد کا دل سے معترف ہوں۔ میرے مطالعے کے میز پر موصوف کی تین معرکۃ الآراء اور اہم ترین کتابیں ہیں، جو مجھے مطالعہ اور پھر بعد میں اظہار خیال کے لیے مجبور کر رہی ہیں، جس کے نتیجے میں یہ چند سطور ضبط تحریر میں پیش کر رہا ہوں۔

عارف خورشید کی نہایت اہم تخلیق ''رنگ امتزاج'' ہے جو ۲۰۰۳ء میں شائع ہو کر دانشورانِ ادب کے ہاتھوں میں آئی۔ عارف صاحب ایک جہاں دیدہ، وسیع مطالعے کے مالک ہیں۔ ان کا مطالعہ کائنات بھی زیادہ ہے۔ وہ حسین و جمیل گل و بوٹے کھلانے کا ہنر رکھتے ہیں۔ وہ لفظوں کو انگشتری پر نگینہ کی شکل میں سجانے کا فن جانتے ہیں۔ وہ مافوق الفطرت دنیا کی نہ تو سیر کرتے ہیں اور نہ ہی ہمیں

سیر کراتے ہیں بلکہ اپنے آس و پاس اور متعلقین سے خام مواد حاصل کرتے ہیں اور اپنی دانشوری کی کل میں ڈال کر اصل چیز قلم و قرطاس کے توسط سے پیش کرتے ہیں۔ یہ ان کی حقیقی خوبی ہے وہ اس حقیقت کا اعتراف بہت ایجاز کے ساتھ یوں فرماتے ہیں۔

''اطراف و اکناف کے منشوروں سے پھوٹتی ہمہ رنگی روشنیاں میرے قلم کی روشنائی میں۔'' (ص ۴: رنگ امتزاج)

یہ روشنیاں موصوف کو کہیں کسی شاعر میں نظر آئیں تو کہیں کسی ناقد یا محقق میں۔ بہر حال اب وہ ان کے قلم کی روشنائی میں ہیں ''رنگ امتزاج'' میں گیارہ تبصرے اور آٹھ خاکے شامل ہیں۔ اگر ان تمام تبصروں اور خاکوں پر لکھا جائے تو ایک بہت طویل مقالہ ہو جائے گا، اس لیے نہایت اختصار سے کام لینا ناگزیر ہو گیا۔

اہل علم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ تبصرہ، تنقید کا ایک باب ہے اور میری نظر میں یہ کام بہت اہم ہے، کیونکہ اپنے خاص اور مقرب احباب ادب نواز کی کتابوں پر لکھنا اور ادب کے مقام کا احترام ملحوظ خاطر رکھنا، نیز دوستی بھی باقی رکھنا بڑا مشکل ہی نہیں بہت دشوار گزار منزل ہے۔ ان مراحل سے گزرنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔ یہ تو عارف خورشید صاحب جیسے صاحب علم اور دانشور کا کام ہے۔ انھوں نے یہ دشوار کام بہت ہی حسن اسلوبی سے انجام دیا ہے۔

عارف خورشید ایک کامیاب مبصر ہیں۔ انھوں نے عام روش سے انحراف کرتے ہوئے تبصرہ نگاری کے اسلوب کو اپنایا ہے۔ ان گیارہ تبصروں میں بعض کے لئے عنوانات خود بنائے ہیں اور یہ مضامین کی شکل اختیار کر چکے ہیں جبکہ چار تبصرے کتابوں کے نام سے ہیں۔ وہ اُردو زبان کے مزاج اور رمز سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ان گیارہ تبصروں میں انھوں نے آسان، سلیس اور رواں زبان کا استعمال فرمایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ موضوع اور صنف پر سیر حاصل روشنی ڈالنے کے علاوہ مصنف کی شخصیت وغیرہ پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ ''رنگ امتزاج'' میں شامل پہلا تبصرہ اورنگ آباد دکن کی نامور شاعرہ ڈاکٹر رعنا حیدری کی شعری تخلیق پر مبنی ہے۔ موصوف ڈاکٹر رعنا حیدری کی شخصیت کا تعارف کراتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''شفیق فاطمہ شعریٰ کے بعد اورنگ آباد دکن کے شعری افق پر چمکنے والا اہم

ترین نام ڈاکٹر رعنا حیدری کا ہے۔اپنے مجموعوں کی اشاعت میں انھوں
نے بہت تاخیر کی، ورنہ ان کے شعری اسلوب کی خالص نسائی جذبات اور
نسوانی محسوسات کی فضا سازی شاعری کے متوالوں کو عرصہ پہلے اپنے
حصار میں لے چکی ہوتی۔اس شعری سفر میں ان کی پوری کائنات نسوانی
ہے۔ رعنا حیدری خاموش طبع ہیں۔ خاموشی ہی سے لکھتی رہتی ہیں۔
مشاعروں میں مشکل سے شرکت کرتی ہیں، تشہیر کی قائل نہیں، شاید اسی
لیے اب تک ایسا نہ ہوسکا۔ان کی نظموں کے انداز اور معیار کی بنیاد پر ہم
پوری ذمے داری سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کا شمار اہم شاعرات میں کیا جاسکتا
ہے۔" (رنگ امتزاج ص:۸)

متذکرہ اقتباس سے ڈاکٹر رعنا حیدری کی شخصیت، شاعری اور شاعری میں مقام نیز ان کی نظموں کے انداز اور معیار پر بڑا واضح تبصرہ ملتا ہے۔ڈاکٹر حیدری نظم معریٰ کی شاعرہ ہیں۔مثال کے طور پر پیش کئے گئے تمام تر نظموں کے اشعار نظم معریٰ سے متعلق ہیں۔

عارف خورشید صاحب کے تبصروں کی طوالت کی وجہ غالباً یہ ہوسکتی ہے کہ وہ جب کسی شاعر یا ادیب کی تخلیق پر اظہار خیال فرماتے ہیں تو اس کی تمام تر تخلیقات کو مدنظر رکھ کر فرماتے ہیں۔وہ اجمال میں کہنے کے بجائے اس کے تمام تر محاسن شعری اور ذاتی کو نظر میں رکھ کر تفصیل میں چلے جاتے ہیں۔ ان کے تبصروں میں تنقید کا عنصر نہیں ہے بلکہ محاسن کو موضوع بحث بنانے کی سعی کی ہے۔البتہ محاسن کو وہ مبالغہ یا غلو کی حد میں جانے نہیں دیتے ہیں۔بعض بعض تبصروں کی نوعیت بالکل غیر جانبدارانہ ہے جس میں وہ بہت زیادہ کتاب پر کھل کر اظہار خیال فرماتے ہیں۔

"رنگ امتزاج" میں خاکے بھی ہیں۔ یہ خاکے نہایت رواں اسلوب اور دلچسپ ہیں۔ طرز بیان میں مکالمے کا لطف ملتا ہے۔ عارف خورشید کا مشاہدہ بہت وسیع اور نظر باریک بیں ہے۔وہ خاکہ نگاری میں جزئیات سے بھی کام لیتے ہیں۔وہ شمیم خاں کا خاکہ کچھ اس طرح اپنے لفظوں میں پیش کرتے ہیں:

"شمیم کا بدن چھریرا، چہرہ لانبا، پیشانی چوڑی، رنگ امریکہ سے برآمدشدہ

گیہوں جیسا، ہاتھ پیر لمبے، ناک چہرے کی مناسبت سے ٹھیک ٹھاک، بلند آواز میں باتیں کرنا اور خطرناک قہقہہ لگانا اس کی پہچان ہے۔ قد پانچ فٹ آٹھ انچ' وزن باسٹھ کلو' کبھی داڑھی رکھ لی تو ایک بال چٹکی سے کریہہ صورت بنا کر اکھاڑتا ہے اور سامنے دو دانتوں سے چبا کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ یوں بال اکھاڑنا یہی اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ داڑھی مونچھیں صاف کر لیں تو سیدھا ہاتھ بار بار پیشانی پر رگڑلے گا، جس سے سر کے بال سرکتے جا رہے ہیں۔ کبھی سکون سے نہیں بیٹھتا۔ اکیلا ہو تو بال اکھاڑنے اور پیشانی رگڑنے میں مصروف نظر آئے گا۔'' (رنگ امتزاج ص ۸۵)

شمیم خان کے عادات و اطوار' لباس و وضع و قطع نیز ان مشربات وغیرہ پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''شمیم لباس کے معاملے میں لاپروا ہے۔ کبھی لیڈر بن گیا تو لیڈر جیسے کپڑے سلائے کبھی سنجیدگی سے شاعری شروع کر دی تو شاعروں جیسا حلیہ بنا لیا۔ کبھی بزنس کی سوجھی تو سفید شرٹ پتلون سلوایا اور شرٹ اِن کر کے نکل گیا۔ کبھی سگریٹ چھوڑ دی پان شروع کر دیا تو لال چھینٹے نہ صرف اپنے شرٹ پر بلکہ سامنے والے کے منہ پر بھی نظر آئے۔ پان چھوڑا پھر سگریٹ شروع کر دی۔ مسجد میں قسم کھا کر شراب چھوڑ دی، کچھ دنوں کے بعد بیئر اس جواز سے شروع کر دی کہ بیئر شراب نہیں ہوتی۔ جب سمجھ میں آیا کہ بیئر بھی شراب ہے تو یہ کہہ کر کہ اب تو قسم ٹوٹ ہی گئی ہے، دوبارہ شراب شروع کر دی، جو آج تک جاری ہے۔'' (رنگ امتزاج ص ۸۵)

عارف خورشید صاحب میں طنز کا عنصر بھی ہے۔ وہ اپنے بعض خاکوں میں اس کا برمحل استعمال بھی کرتے ہیں۔ ان کے طنز میں تیر و نشتر نہیں بلکہ نرم اور پر لطف جملے ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اپنے ایک خاکے میں کچھ اس طرح طنز کے ساتھ آتے ہیں:

''انور خاں یکم مارچ ۱۹۴۲ء کو دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا میں آئے تھے

اور ۴ر دسمبر ۲۰۰۱ء کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پنٹا گون پر تیسری جنگ عظیم کا بگل بجنے سے ایک ہفتہ قبل منگل کو رخصت ہو گئے۔

بھارت ۱۵ ر اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ہوا اور دستور کا نفاذ ۲۶ ر دسمبر ۱۹۵۰ء سے عمل میں آیا۔ دستور کے نفاذ سے ٹھیک تیس سال بعد انور خان عقد مناکحت میں بندھے اور فطری دستور اساسی اسی دن سے نافذ العمل ہو گیا۔ شادی تیس سال دس ماہ اور پچیس دن کی عمر میں ہوئی۔"

اسی کے ساتھ وہ انور خاں کا خاندانی شجرہ بھی اختصار میں تحریر کرتے ہوئے ان کی مشقت آمیز زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں:

"مہمند قبیلے کے پٹھان تھے۔ ان کے اجداد فوج میں ملازمت کے سلسلے میں سکندر آباد دکن آئے تھے۔ ان کے والد قاسم خاں نو سال کی عمر میں بمبئی آگئے اور یہاں ہر طرح کے کام کئے۔ جہاز پر خلاصی کی، کلینزی کی، ٹیکسی چلائی، والد کے انتقال کے وقت انور خاں جماعت دہم کے طالب علم تھے۔" (رنگ امتزاج۔ص ۱۰۲)

عارف خورشید کی بعض بعض خاکوں میں بہت جامع تنقید بھی ملتی ہے۔ وہ بہت پنے تلے جملوں میں اپنی بات کہنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ انور خاں کے افسانہ نگاری پر بڑا وسیع تبصرہ ملتا ہے۔ دیکھیے:

"کم لفظوں میں زیادہ کہنا، مختصر افسانے میں بہت کچھ سمیٹ لینا انور خاں کا کمال تھا۔ ان کے مختصر ترین افسانے پڑھ کر بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ بات تشنہ رہ گئی۔" (رنگ امتزاج۔ص ۱۰۳)

جیسا کہ ما قبل تحریر کہا جا چکا ہے کہ اگر عارف خورشید صاحب کی تخلیقی اثاثے پر اختصار سے ہی لکھا جائے تو ایک بہت بڑا مقابلہ سپرد قلم ہو جائے اس لئے 'رنگ امتزاج' میں موجود تمام تر خاکوں پر اظہار خیال کرنا ممکن نہیں۔ البتہ ان خاکوں میں اتنی دلکشی پیدا کر دی گئی ہے کہ مطالعہ کرنے کے لئے کتاب ہاتھ میں آنے کے بعد رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ بقیہ یہی صورت حال اب لکھنے کی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ خاکے پر کچھ نہ کچھ لکھا ضرور جائے مگر افسوس ہے کہ ایسا کر پانا ممکن نہیں۔ اس لئے تقریباً ہر خاکے

لئے چند اقتباس درج کر رہا ہوں۔

خاکوں کے زمرے میں سب سے آخری خاکہ رفعت سعید قریشی کا ہے۔ ان کے خاکے بیان کرنے سے قبل قریشی صاحب سے والدہ کی خدمت گزاری اور ان کی عزت کرنے سے متعلق تاریخ اسلام کا ایک زریں حقیقت تحریر فرمائی ہے۔ قریشی صاحب کی زوجہ محترمہ کا روزمرہ کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

''قومی سطح پر مشہور و مقبول دانشور خاتون ڈاکٹر دلاری قریشی (جو پہلے دلاری گپتا تھیں) کا تعلق ایک تعلیم یافتہ خاندان سے ہے۔ وہ نہ صرف ایک اچھی رائٹر ہیں بلکہ ایک مشفق ماں، ایک فرمانبردار بہو، ایک باصلاحیت بیوی اور ایک دین دار خاتون ہیں، جن کے دن کی ابتداء فجر کی نماز اور تلاوت کلام پاک سے ہوتی ہے۔ اس کے تمام دن کی مصروفیات میں پڑھنا لکھنا' درس و تدریس اور مختلف سماجی و سیاسی سرگرمیاں شامل ہیں۔'' (ص۱۳۲)

''آج رفعت سعید قریشی کا تعارف اسی خاتون کے شوہر کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔'' (۱۳۲)

''مورث اعلی وسط ایشیاء سے سندھ کے راستے ہندوستان آئے اور اورنگ آباد دکن کے ہو رہے۔''

''رفعت کے والد عبدالحمید قریشی نے ہمرو مشروع کی صنعت کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ ان کے نانا بشیر احمد خان 'پربھنی' کے رئیس اعظم تھے۔ ان کی دولت مندی شاہ خرچی اور پٹھانی غصہ پر مبنی کہانیاں ان کی والدہ ہاجرہ خاتون اکثر سناتی تھیں۔ رفعت کے مزاج میں گرمی اس پٹھانی قبیلے کی دین ہے۔'' (ص۱۳۳)

عارف خورشید اپنے ایک اورنگ آبادی دوست کے بارے میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

''اورنگ آباد ہی کیا، شاید ساری دنیا میں ایسا کوئی نفاست پسند شخص ہوگا جو

موز دھو کر کھاتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی چیز دھو کر استعمال نہیں کرتا یہاں تک کہ منہ بھی نہیں دھوتا۔"؟ (رنگ امتزاج ص ١١٣)

"کتاب آج تک نہیں خریدی، بڑی انکساری سے مانگ کر لے جاتے ہیں اور جہیز میں ملے ٹین کے صندوق میں رکھ کر بھول جاتے ہیں۔" (١١٧)

"اکثر اسکول آ کر کلی کرتے اور منہ دھوتے، شرٹ پتلون پہنتے ہیں، جس کو ٹیلر کی استری کے بعد پھٹنے تک استری کی نوبت نہیں آتی۔ بال حجام کے جما دینے کے بعد پھر کبھی کنگھی کے استعمال کی زحمت نہیں ہوتی۔ بار بار توجہ دلائی جائے تو داڑھی بنا لیتے ہیں۔" (ص ١١٧)

"پیدا ہوئے تو دائی نے غسل دیا تھا اب یہ کام غسال کو کرنا ہے۔"

"شاید بڑھتے جسم سے نا امید نہیں۔ ویسے اولاد سے بھی ابھی تک نا امید نہیں، اگرچہ شہوت کے رواں دواں سوتے، جو جاری ہی نہیں ہوئے تھے، سوکھ گئے ہیں۔" (١١٧)

"روزہ پابندی سے رکھتے ہیں۔ نماز نہیں پڑھتے اور رمضان میں بھی گالی سے باز نہیں، آتے کہتے ہیں روزہ دار کا ہر عمل عبادت ہے۔"

عارف خورشید کا ایک ایک جملہ نہایت دل نشیں اور رواں ہے۔ پڑھتے چلے جایئے۔ قاری کے لیے کس طرح کی کوئی اکتاہٹ نہیں آتی۔ اختر الزماں ناصر کے خاکے کا عنوان یوں دیا ہے کہ "آواز تم نے جب دی......" اختر الزماں، علامہ اقبال کے شیدائیوں میں سے تھے۔ وہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اختر الزماں ناصر، اقبال کے عاشق ہیں اپنے بچپن سے، حیرت ہے کہ ان کے کلام پر اقبال کا کوئی اثر نہیں ہے۔ مگر یہ طے ہے کہ اقبال کی شخصیت کا کوئی پہلو، سیرت کا کوئی نقطہ، زندگی کا کوئی گوشہ، کلام کا کوئی کوچہ، فکر کا کوئی موڑ، فلسفہ کا کوئی علاقہ ان سے پوشیدہ نہیں۔ طرز ادا یا اسلوب کی کوئی پریشانی نہیں تھی، وژن بھی موجود تھا، استدلال بھی میسر تھا۔ دیگر علوم وفنون

کا وقوف بھی حاصل تھا، لیکن اختر الزماں ناصر نے لکھا نہیں۔ وجوہات کا مجھے علم نہیں۔'' (رنگ امتزاج ص ۱۱۷)

ایک طنزیہ جملہ اختر الزماں کی زبان سے ملاحظہ ہو۔

''اختر الزماں ناصر کی جگہ جگہ گل پوشی ہو رہی ہے۔ وہ حج کر کے آئے ہیں، لال مسجد میں اپنے واقعات حج بیان کر رہے ہیں۔

''شیطان کو کنکریاں مارنے کے بعد میرے ایک ساتھی نے کہا یہ کنکریاں بچ گئی ہیں۔ میں نے کہا رکھ لو وہاں کام آئیں گی۔ میں سامعین کے چہروں پر مسکراہٹ اور ان کے چہرے پر گہرا طنز دیکھ رہا ہوں۔'' (رنگِ امتزاج۔ص ۱۲۶)

اب تک جو کچھ لکھا گیا وہ عارف خورشید کی کتاب 'رنگ امتزاج' سے متعلق رہا ہے انھوں نے درجنوں کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی ایک کتاب ''وقت کے چاک پر'' بھی ہے جس میں چار افسانے، ایک تبصرہ، چار خاکے اور ترپین افسانچے شامل ہیں۔ اب سے قبل خاکوں پر ہی لکھا گیا ہے اس لیے افسانچوں پر چند سطور میں اپنی بات تحریر کرنا چاہوں گا۔

''شاہ رخ خان دس پندرہ حسیناؤں کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ ان کے جسم پر برائے نام جانگیہ اور چولی تھی۔

مولانا نے آنکھیں بند کر لیں

انشاءاللہ میں بھی حوروں کے ساتھ......'' ('حور' وقت کے چاک پر۔ص ۱۶۳)

لڑکے والے: ہم جہیز کے قائل نہیں۔

لڑکی والے: ہماری بیٹی شادی کے چند ماہ کے بعد الگ ہو جائے گی تو اسے سامان کون دلائے گا؟'' (ضروری سامان۔ص ۱۴۲)

''سیٹھ نماز پڑھ رہے ہیں اور نوکر پنکھا جھل رہا ہے۔

سیٹھ بہت ہی خشوع وخضوع سے نماز پڑھنے لگے کہ نوکر دیکھ رہا ہے۔''

(مالک ۱۴۱)

''دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔ دونوں کے خاندان

شادی کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ دونوں نے شادی نہیں کی۔
دونوں کسی اور کے کام بھی نہیں آئے؟" (بے کار محبت۔۱۳۶)

"عورت کو سونا پسند ہے۔
سنار کو سونا پسند ہے۔
اس لیے سنار کی دکان پر عورتوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔
اور ہر سنار جوہری ہوتا ہے۔" (جوہری۔۱۳۴)

"اس کے بچوں سے سارا محلہ پریشان تھا
اس نے تنگ آکر اپنے بچوں کو دینی مدرسے میں ڈال دیا
اب وہ فارغ ہو کر لوٹے ہیں تو سارا شہر پریشان ہے۔"
(محلے کے بچے)

"وہ وضو کر کے مسجد جا رہا تھا کہ ایک شخص نے اسے سو روپے بل کم دکھانے کے لئے الیکٹرک میٹر میں تار لگانے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دیئے۔ نوٹ جیب میں رکھ کر مسجد کی طرف بڑھتے ہوئے وہ سوچنے لگا" مجھے پھر سے وضو کرنا چاہیے۔" (چلہ۱۱۹)

"آنٹی اجتماع ہے آپ کو بلایا ہے
اچھا، گیٹ بند کر کے چلے جاؤ۔" (آنٹی ۱۳۰)

"آج اس کا عدالت سے سبکدوشی کا پہلا دن تھا۔
اس نے فجر کے بعد قرآن کھولا تو اسے جگہ جگہ سے حروف اڑے ہوئے نظر آئے۔
اسے خیال آیا کہ اسی پر وہ ہاتھ رکھوا کر لوگوں سے کہلواتا تھا۔
"جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا......" (سچ کہوں گا۔۱۳۳)

"آج بھی بیوی کے انکار پر وہ خاموش سو گیا، تو دیکھا فرشتے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ وہ نمازیں پڑھتی ہے۔ عبادت کرتی ہے۔ میں اس

عورت پر دن بھر رحمت بھیجتا رہتا ہوں۔

دوسرے نے کہا۔ وہ انکار کرتی ہے۔ منہ پھیر کر سو جاتی ہے۔ میں رات بھر اس پر لعنت بھیجتا رہتا ہوں۔

دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا انجام......؟ (انجام۔۱۳۲)

عارف خورشید کے ان افسانچوں میں سماجی اور معاشرتی حالات پر خوب کھل کر لکھا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اسی کو اپنے افسانچے میں جگہ دیتے ہیں۔ افسانچہ جس اختصار کا متقاضی ہے اور جس طرح وسیع مطالعہ درکار ہے وہ تمام محاسن عارف خورشید کو حاصل ہیں۔ وہ بہت کم لفظوں میں اپنی بات کہہ دینے کا خواب اعلی ہنر رکھتے ہیں۔ وہ سماج میں پائی جانے والی خامیوں کو خوب صورت پیرایے میں بیان کرتے ہیں۔ کہیں کہیں اخلاقیات کو بھی موضوع بنایا ہے۔ عارف خورشید کا قلم اپنی تمام جولانیاں نثر کے ساتھ شعر و نغمہ میں بھی ابھر کر سامنے آیا ہے۔ وہ ایک خوش فکر شاعر بھی ہیں۔ ان کی شاعری میں زندگی ہے۔ وہ ادب برائے کے قابل نہیں۔ وہ ادب برائے زندگی پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ جس طرح نثر میں بڑی روانی اور سلاست رکھتے ہیں۔ اسی طرح شعر و نغمہ میں بھی کمال تامہ رکھتے ہیں۔ وہ صنف جدید، جسے ثلاثی کہا گیا ہے، پر کھل کر شعر کہتے ہیں۔ نعت بھی صاف ستھرے کہتے ہیں اردو کی تمام اصناف سخن پر شعر کہنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ ''سوچ کے جزیرے'' میں موصوف کی ایک نعت شریف ہے۔ پورا کلام دل میں اتر کر روح کو بالیدگی عطا کرتا ہے۔ سلاست اور روانی آپ اپنی مثال ہے۔ دلی جذبات بہت ہی احترام اور مقامِ مصطفیٰ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کی پاسداری کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

تیرگی میرا مقدر کیوں بنے
نور برساتے نظارے آپؐ ہیں

اپنی ہستی آپؐ پر کردوں نثار
میرے دریا کے کنارے آپؐ ہیں

میری منزل کا تعین آپ سے
میری راتوں کے ستارے آپؐ ہیں

دوسری نعت شریف سے اشعار دیکھیے ۔

نہ مال و زر کی ہوس ہے نہ جاہ و منصب کی
حضورؐ آپ کے قدموں کی دھول کافی ہے
میری تمام سیہ بختیاں مٹانے کو
بس اک شعاع کرم کا نزول کافی ہے
میں خوف حشر سے لرزاں تھا اک صدا آئی
کرے تو اپنی خطائیں قبول ، کافی ہے
جنھیں تلاشِ دو عالم ہے وہ تلاش کریں
مرے لیے تو خدا کا رسولؐ کافی ہے

عارف خورشید کو جدید صنف ثلاثی میں بھی شعر خوب سے خوب تر کہنے کا ملکہ حاصل ہے۔ وہ خیال کی بلندی اور علوئے فکر پر مبنی کلام کہتے ہیں۔ یہ خوبی ان کی جدید صنف ثلاثی میں بھی ملتی ہے۔ زبان و بیان میں پاکیزگی اور سلاست ہے۔ بلا کسی خاص التزام کے چند ثلاثی پیش کیے جا رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے ۔

ہر شرارت کسی کی یاد آئی
گزری راتوں کا جب خیال آیا
پھر شرافت کسی کی یاد آئی

متذکرہ ثلاثی میں تغزل بھرپور ہے۔ مگر جس اختصار اور روانی کے ساتھ خیال کو شعر کا جامہ عطا کیا گیا ہے وہ عارف خورشید کا ہی حصہ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں وہ جس خیال کو جیسا چاہتے ہیں نظم کر دیتے ہیں۔

عصر حاضر کا آدمی آج ہر چیز کو نمایاں کر کے خود میں بہت خوش رہتا ہے۔ جو چیز چھپانے کی ہے اس کی بھی نمائش کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ یہ ثلاثی دیکھیے ۔

یہ نصیحت بھی اب نمائش ہے
ہم گنہ گار ہی سہی یارو
پارسائی بھی اب نمائش ہے

ایک سچی حقیقت کس قدر جامع اسلوب میں پیش کردی ہے۔ ثلاثیاں دیکھیے :

کھو کے پانے کی آرزو کیسی
اُڑ کے آئے ہیں یاد کے جگنو
زندگی ہے سیاہ شب جیسی

پتے شاخوں پہ ساتھ رہتے ہیں
ہم سے پہلے نہ ٹوٹ کر گرنا
سب یہ اک دوسرے سے کہتے ہیں

بھول جاتے ہیں سب علالت کو
وہ مسیحا صفت اگر آئے
گھر پہ بیمار کی عیادت کو

لفظ کو وار سے نہ کم سمجھو
میرے ہاتھوں میں ہے قلم دیکھو
اس کو تلوار سے نہ کم سمجھو

تیری خوشبو ہے میری سانسوں میں
پھر بھی یہ روح چاہتی کیا ہے
دل کے جیسی چبھن ہے آنکھوں میں

اب کہاں جا کے کھو گئے ہیں لوگ
ہم کو دیتے نہیں ہیں یادیں بھی
کتنے کنجوس ہوگئے ہیں لوگ

وہ شرافت کی بات کرتا ہے
اس میں شاید غرض ہے پوشیدہ
کیوں محبت کی بات کرتا ہے

لوگ دولت سے پیار کرتے ہیں
وہ ہیں پردیس میں یہاں گھر میں
دوعَیَن انتظار کرتے ہیں

صرف اس کا ظہور دیکھا ہے
بجھ گئے مہر و ماہ و نجم تمام
ہر طرف اس کا نور دیکھا ہے

اس قبیل کے متعدد ثلاثیاں ہیں جن پر سیر حاصل تبصرہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ عارف خورشید نے ان میں بحر ناپیدار کنار کو سمونے کی کامیاب سعی کی ہے۔ ان کی فکر میں جہانِ معنی ہے وہ اپنے خیال کو نئے نئے اسلوب میں جامہ شعر عطا کرنے میں مکمل قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی فکر میں ندرت اور گہرائی ہے وہ یقیناً ایک کامیاب منفرد طرز ادا کے شاعر ہیں۔

عارف خورشید کی کتاب ''سوچ کے جزیرے'' میں غزلیں بھی ہیں۔ اگر ان پر اظہار خیال نہ کیا گیا تو کتاب شکایت کرے گی، اس لیے چند غزلیہ اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔

جب اندھیرے کے گھنگھرو بکھرنے لگے
روشنی کے کنارے بھی کم کم ملے

روشنی کا سفر ہے تری آرزو
کچھ اندھیرے ملے بھی تو کم کم ملے

کیوں روز بھٹکتے ہیں سمندر کے قبیلے
کیوں نیند کے زخموں کو مسیحا نہیں ملتا
کرنوں کی دعائیں رہیں پانی میں پگھلتی
سورج کو گناہوں کا علاقہ نہیں ملتا
وہ کون ہے جو رات کے خاموش پہر میں
بے خواب فصیلوں سے اکیلا نہیں ملتا

عارف خورشید غزل کے بہت نباض ہیں۔ اس کی رمزیت اور کنایت سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔ شعری لوازم سے بھی باخبر ہیں۔ وہ جدید استعارے و کنائے سے شعر میں محاسن پیدا کرتے ہیں۔ جیسا کہ ماقبل اشعار میں خاموش پہر، کرنوں کی دعائیں، سورج کو گناہوں، سمندر کے قبیلے، روشنی کا سفر وغیرہ اصطلاحات سے اُردو غزل کو آشنا کیا ہے۔

سہل ممتنع میں بہت خوب صورت شعر کہتے ہیں۔ شعر دیکھیے ؎

شاہ راہوں پہ بہہ رہے ہیں لوگ
سادگی ڈھل رہی ہے پتھر میں

کس کو رخصت کیا ہے دنیا نے
شہر مرحوم ہوگئے جیسے

جیسے اس کے سوا نہیں کوئی
کیا زمانہ ذہین ہوتا ہے

کون سمجھے خدا کی مرضی کو
شہر فردا میں کیوں منادی ہے

سبز پریوں کے غول آتے ہیں
رات کا نور ہے محبت میں

ہر طرف ہے تلاش میری ہی
کون ہے کس نے یہ صدا دی ہے

عارف خورشید کے کلام میں پندووعظ بھی ہے۔ وہ آسان زبان میں اپنی بات کو کہہ کر مخاطب کو نصیحت دینا چاہتے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو۔

نوک زباں سے گھولیے لفظوں میں چاہتیں
آبِ دعا سے دھویئے لہجے کے زنگ کو

تغزل سے بھرپور شعر دیکھیے۔

گفتگو ہورہی تھی دنیا کی
کس کے شانے پہ سو گیا ہے وہ

عصر حاضر میں انسانیت مفقود ہوتی جارہی ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان سے دور رہنا پسند کرتا ہے۔ وہ خودغرض اور مفاد پرست ہو چکا ہے اس مفہوم پرمبنی بیشتر اشعار اردو ادب کے صفحات پر ملتے ہیں مگر عارف خورشید نے انفرادیت پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ شعر دیکھیے:

سنتے ہیں کل کے دور میں انسان تھے بہت
تاریخ ہے اداس کہ انسان اب کہاں

تصوف پرمبنی یہ شعراپنی بلاغت کا دادخواہ ہے۔ اس طرح کے شعر کہنا آسان نہیں۔ یہ تو عارف خورشید جیسے قادرالکلام کا کام ہے۔ شعر دیکھیے۔

جس کی آواز کی تلاش میں ہوں
اس کا لہجہ سنائی دیتا ہے

عارف خورشید وسیع مطالعہ ومشاہدہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنے تجربات کو بھی شعر کا جامعہ عطا کرتے ہیں تو کبھی عام تجربات کو شعرونغمہ میں بیان کرتے ہیں۔ تقریباً ہر ذی شعور اس حقیقت سے آشنا

ہے کہ عشق کا انجام رسوائی اور ذلت کے سوا کچھ نہیں۔ عشق مجازی میں بے چینی و اضطرابی کیفیت ہمہ دم رہتی ہے۔ شاعر موصوف اپنے تجربات اور عام مشاہدات کو شعری جامہ عطا کرتا ہوا کہتا ہے۔

چین دل کا نہ لطف جاں اس میں
حاصل عشق بس کہ خواری ہے

ایک سچا عاشق اپنے محبوب کے عشق میں جب مبتلا ہوتا ہے تو اسے دنیا اور اہل دنیا سے کوئی خبر نہیں ہوتی ہے۔ اس خیال کو عارف خورشید کے لفظوں میں ملاحظہ ہو۔

یہ بھی خبر نہ ہو سکی تیرے خیال میں
آ کر قریب کون کدھر سے گذر گیا

یہ شعر بھی دیکھیے۔

ہے اسی کی ہواؤں میں خوشبو
وہ بچھڑ کر ہے درمیاں جیسے

عارف خورشید کے یہاں بے شمار ایسے الفاظ و اصطلاحات ہیں جو عام فہم بھی ہیں مگر ان میں مخصوصیت بہت ہے۔ ایک عام محاورہ پر شعر دیکھیے۔

آنے لگتے ہیں صحن میں پتھر
پیڑ جوں ہی جوان ہوتا ہے

کتنا آسان ہے اللہ سے باتیں کرنا
کتنی مشکل سے مگر تجھ سے میری بات ہوئی

عارف خورشید ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ دانشور ہیں۔ ان کی نظر اُردو کے کلاسیکل شعراء کے کلام پر بہت گہری ہے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نے مومن خاں مومنؔ دہلوی کے ایک شعر کی ایسی داد دی کہ وہ عالم گیر شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس شعر کی بلاغت اور تغزل پر مرزا غالب دہلوی کی اس درجہ خوش ہو گئے تھے کہ انھوں نے اس ایک شعر کے عوض اپنا پورا دیوان دینا منظور کر لیا تھا۔ شعر میں سادگی اور تغزل بھرپور ہے۔ مومنؔ دہلوی کا شعر ملاحظہ ہو:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

عارف خورشید نے بھی مومن دہلوی کی اس خوب صورت اور پیاری زمین میں شعر کہنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس غزل سے صرف دو شعر دیکھیے اور لطف لیجیے۔

اے خدا تجھ سے بات کرتا ہوں
گھر میں جب تیسرا نہیں ہوتا
روشنی اختلاف کرتی ہے
ان اندھیروں میں کیا نہیں ہوتا

حاصل مطالعہ یہ ہے کہ عارف خورشید ایک قادر الکلام غزل گو، ثلاثی گو، خاکہ نگار، افسانہ نویس اور افسانچہ نیز ایک نہایت اعلیٰ معیار کے مبصر ہیں۔ان کی نظر اُردو کی نثری اور شعری اثاثے پر گہری ہے وہ اپنے مطالعہ میں الفاظ و معانی کے بحر نا پید کنار رکھتے ہیں۔ جدید الفاظ اور اصطلاحات اور شعر کی لوازم بر محل استعمال کر کے شعر میں معنویت پیدا کرنے میں، بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔ مطالعہ و مشاہدہ اور تجربات کی ایک وسیع دنیا خود میں رکھتے ہیں۔ وہ اُردو کے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ عارف خورشید اورنگ آباد کے علمی و ادبی حلقے میں عصر حاضر کے خورشید کے مانند ہیں۔ان کا یہ شعر خود ان پر بھی صادق آتا ہے:

وضع اپنی مگر ہم نے بدلی نہیں
لاکھ طوفاں اٹھے سیکڑوں غم ملے

☆☆☆

قوس قزح کے رنگ!

رونق جمال

عصر حاضر کے ادباء و شعرا تکبر کے نشے میں چور یہ دعوے کرتے نظر آتے ہیں کہ فلاں صنف کا موجد ہوں' فلاں صنف میری ہے۔ افسانچے کا موجد فلاں ہے' ایک سطری کہانی کا موجد فلاں ہے' اب میں ایک لفظی کہانی لکھوں گا اور موجد کہلاؤں گا۔! وغیرہ وغیرہ!! لیکن آپ میرے اس دعویٰ پر حیران رہ جائیں گے کہ یک لفظی کہانی' ایک سطری' افسانچہ یا افسانہ ازل سے پہلے لکھا گیا تھا اور ان اصناف کا موجود یا مصنف کوئی اور نہیں اللہ تعالیٰ ہے۔ جی ہاں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے ایک لفظی کہانی لکھی ''کن'' اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ایک لفظ ''کن'' نے کتنے افسانے پیدا کردیئے، لاکھوں کروڑوں انگنت۔ یہ چھوٹا سا لفظ دو حرفوں کا مجموعہ ہے جس پر ساری کائنات کا انحصار ہے۔ دنیا کی ابتدا بھی اسی ''کن'' سے ہوئی ہے اور انتہا بھی اس ''کن'' سے ہوگی۔ اس ایک لفظی کہانی کو کروڑوں سال بیت گئے لیکن آج تک اس کی گہرائی کو کوئی بھی ناپ سکا ہے نہ سمجھ سکا ہے۔!! اس کے بعد یک سطری کہانی کی بات کی جائے تو قرآن حکیم میں سب سے چھوٹی آیت ہے۔ اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرْ کئی مختصر آیتیں ہیں اور کئی طویل آیتیں ہیں۔ جن سے کسی بھی مومن کو انکار نہیں ہے۔ یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان جیسے غلطیوں کا پتلے کو بھی ''کن'' کی قوت عطا کی ہے اور تخلیقی و تسخیری صلاحیت دی ہے قصہ مختصر کرنا چاہوں گا کیوں کہ مجھے یہاں بات عارف خورشید صاحب کی کتابوں اور فن پر کرنی ہے۔

عارف خورشید کا شمار عصر حاضر کے اہم افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ وہ بیک وقت ایک منفرد افسانہ نگار' صاحب طرز ادیب و نقاد اور شاعر کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ عارف خورشید کا تعلق اردو افسانہ نگاوں کی اس نسل سے ہے جو ۱۹۸۰ء کے بعد سامنے آتی ہے اور جس نے ۱۹۴۰ء کے بعد نئے اور جدید تجربات کے نام پر بہم اور بے معنی انسانوں کیخلاف آواز اٹھائی اور اردو افسانے میں قصہ پن کا احیا کیا اور اس کا دوبارہ قاری سے رشتہ استوار کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ عارف خورشید

نے اپنا ادبی سفر بہت خاموشی اور متانت کے ساتھ شروع کیا تھا جو ہنوز اسی انداز میں جاری ہے۔ پچھلے پچیس، تیس سال کے طویل تخلیقی سفر میں انہوں نے بے شمار افسانے' افسانچے لکھے ہیں اور اپنے لئے شاعری بھی کی ہے۔

مہاراشٹر صوبے کا شہر اورنگ آباد تاریخی شہر ہے بادشاہوں صوفی سنتوں اور دانشوروں کے لیے ہمیشہ چرچا میں رہا ہے۔ آج بھی اورنگ آباد دانشوروں کا گہوارہ ہے۔ ڈاکٹر عصمت جاوید، اختر الزماں ناصر، میر ہاشم، ڈاکٹر ارتکاز افضل، رفعت نواز، اثر فاروقی، شاہ حسین نہری، بشر نواز، اسلم مرزا، نورالحسنین، قاضی رئیس اور ڈاکٹر عظیم راہی جیسے قد آور ذی علم' جہاں دیدہ اور تخلیقیت پر دراز جہان اردو کی آبیاری کررہے ہیں۔ اس ادبی کہکشاں کے درمیان اپنی چمک کا لوہا منوانا بچوں کا کھیل نہیں ہے یہ سعادت عارف خورشید کے حصے میں بدرجۂ اتم آئی ہے۔ اسی لئے تو عارف خورشید ۱۹۹۹ء میں شائع افسانوں کے مجموعے ''قافلے والوں سچ کہنا'' کے مختصر سے پیش لفظ میں رقمطراز ہیں۔

''طبیعت میں تعلیٰ نہیں ہے لیکن خود کے بونے کا احساس ہے جس کو میں ابھی تک رد نہیں کرسکا۔ میری خواہش پوری طرح سے پوری نہیں ہو رہی ہے اپنی تصویر دیکھ کر حیران ہوں کہ یہ وہی ہے جو سوچتا ہے کہ روح درد بھی محسوس کرتی ہے۔ جسم لذت بھی، آنکھیں دیکھنا بھی جانتی ہیں اور کان سننا بھی، ناک سونگھنا بھی اور ہاتھ چھونا بھی، مجھے نسیم دھر کے لمس یاد آ گئے۔''

عارف خورشد کی لکھی یہ چند سطریں ان کے قلم کی روانی کی غماز ہیں۔ مجموعے کے تمام افسانے لاجواب ہیں لیکن افسانہ ''قافلے والو سچ کہنا'' تاریخی افسانہ ہے جس میں روانی ہے' بیانیہ ہے دلچسپی ہے' تاریخی واقعات کی جانب اشارے ہیں اور عارف خورشید کا اپنا اسلوب ہے جو کہانی کو وہ جال عطا کرتا ہے جس میں قاری ابتدا ہی سے پھنسا چلا جاتا ہے۔

''وقت کے چاک پر'' کا بھی عارف خورشید نے چار سطروں کا پیش لفظ لکھا ہے جو کتاب میں شامل خاکوں افسانوں اور افسانچوں کی طرح دلچسپ ہے۔ ان چار سطروں میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

''گزشتہ چند برسوں میں قلم کی آنکھ میں جو آنسو آئے وہ قرطاس کی مژگاں پر
کب تک رکے رہتے۔ ضبط کا دامن چھوٹا تو صحیفے کی صورت گری اور وقت
کے چاک پر گردش کرتے لمحے قید ہو گئے۔ میری کاوش کو سکہ بند نقاد یا
منصوبہ بند ناقص کے نظریہ سے دیکھنے کی بجائے نظر سے دیکھئے اور فیصلہ
کیجئے۔ یاد رکھیے جرأت مندانہ سچ ہی زندہ رہتا ہے، تحسین و تنقیص کسی
شمار و قطار میں نہیں آتی۔!''

طویل افسانوں میں ''شجر ممنوعہ'' ایک شاہکار افسانہ ہے۔ افسانے کی آخری تین سطریں
ملاحظہ فرمایئے انشاءاللہ آپ بھی شجر ممنوعہ کو پڑھنے کے لئے بے چین ہو جائیں گے۔

''شبینہ نے امانت میں خیانت نہیں کی یا مجھے خیانت سے بچایا۔ کیا مرد بھی
کسی کی امانت ہوتا ہے۔! اللہ نے کیوں آدم کی پسلی سے عورت پیدا کی یہ
تفریح ہے تو دکھ بھری سزا تو کڑی ہے۔ آخری خیال نے ذہن کے رن وے
سے اڑان بھری اور نیند نے پر پھیلا دیئے۔''

خاکے چاروں بھی اچھے ہیں لیکن قاضی سلیم صاحب پر لکھا خاکہ قت کے چاک پر میں
عارف خورشید نے قاضی سلیم سے اپنی عقیدت، محبت، خلوص، اپنے پن، گہرے تعلقات کو دل کے عمیق
گہرائیوں سے نکال کر قرطاس پر بکھیرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ جو لوگ قاضی سلیم سے نہیں ملے
انھیں خاکہ وقت کے چاک پر پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوگا کہ وہ بھی قاضی صاحب سے مل چکے ہیں
اور تاعمر انھیں قاضی صاحب سے نہ مل پانے کا غم کچھ کے لگا تارہئے گا۔

آج ایک ادیب کے لیے دنیا جتنی غور طلب ہے پہلے کبھی نہ تھی ہمیں نئی صدی میں داخل
ہوئے ایک دہائی گذر چکی ہے اور اب ہم دوسری دہائی کے سفر میں ہیں۔ وقت کیسے اور کس طرح گذر دیا
ہے اس کا احساس کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ ہاں یہ انسانی تہذیب و تمدن کا بہت الجھا ہوا دور ہے
جس سے ہم نبرد آزما ہیں۔ ہر لمحہ ایک کہانی ہے، ہر لمحہ ایک قصہ ہے، ہر لمحہ ایک افسانہ ہے، بلکہ اگر ادیب
آنکھیں کھلی رکھے تو حقیق ت میں ہر لمحہ ایک افسانچہ ہے، اسی لئے میں ہمیشہ کہتا اور لکھتا ہوں کہ افسانچے

ہمارے اطراف واکناف میں بکھرے پڑے ہیں بس ضرورت ہے ہمارے سینے میں حساس دل کی۔ اگر ادیب کے سینے میں احساس دل ہے تو وہ اپنے پسند کا منظر جس نے اسے متاثر کیا ہو اسے افسانچے کی شکل میں قلم کی مدد سے کاغذ پر اتار دیتا ہے۔ عارف خورشید کا نام افسانچوں کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ انھوں نے افسانچے کے آسمان پر کمندیں ڈال رکھی ہیں اور اپنے منفرد لب و لہجے و اسلوب کی وجہ سے اپنا ایک الگ مقام بنالیا ہے۔ واضح ہو کہ افسانچہ نویسی کے لئے چار باتوں کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ تخلیقی ذہن، استقلال، عمیق مشاہدہ اور وسیع مطالعہ۔ عارف خورشید ان خصوصیات پر کھرے اترتے ہیں۔ ان کے تمام افسانچوں میں تخلیقی عمل نمایاں نظر آتا ہے۔ افسانچے کو موصوف اس قدر فنکارانہ صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے رقم کرتے ہیں کہ قاری افسانچے کے اختتام پر چونک جاتا ہے اور بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے.....واہ.....اس طرح ان کے تمام افسانچوں میں پلاٹ اور کردار ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے مختلف النوع مسائل کی طرح تضادات سے پر ہیں۔ ان مجموعوں میں کوئی بھی افسانچہ جبراً ٹھونسا ہوا نظر نہیں آتا۔ افسانچے پڑھتے ہوئے قاری محسوس کرتا ہے کہ افسانچے کے ان کرداروں سے وہ بخوبی واقف ہے اور یہ تمام کردار کہیں اس کے آس پاس ہی موجود ہیں ہر افسانچہ کسی نہ کسی ایسے پہلو کو جو ہمارے سماج اور سماج کے معاشرے سے جڑا ہوا ہے اجاگر دکھائی دیتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

"قرآن کی زبان"

میں انسپکٹر کلکرنی کے ساتھ Commissioner office کی Foreigner Registration Branch میں بیٹھا تھا کہ چند سعودی نیشنل ویزا Extention (توسیع) کے لیے آئے۔ کلکرنی نے انھیں تیسری مرتبہ دوسرے دن آنے کو کہا وہ تیز لہجے میں گفتگو کرتے ہوئے چلے گئے۔ کلکرنی نے شبہ ظاہر کیا۔ وہ مجھے گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے کہا مجھے عربی نہیں آتی۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔!

"تمھارا قرآن کونسی زبان ہے؟"

آخر میں اب بات کرتے ہیں عارف خورشید کی شاعری کی۔ اس وقت میرے سامنے ان کا

شعری مجموعہ ''سوچ کے جزیرے'' ہے۔ شعری مجموعے کے پیش لفظ میں عارف خورشید نے صرف پانچ سطروں کو زحمت دی ہے۔ فرماتے ہیں۔

''اے صنف سخن میں ایجاد کے متوالوا لے تجربوں کو حوصلے بخشنے والے اعتدال پسند شاعر و ذرا سوچو۔ تین مصری نظمیں تو لکھی جاسکتی ہیں بلکہ لوگوں نے ایک مصری نظمیں بھی لکھی ہیں بعض تو ایک لفظی نظم کا بھی دعویٰ کرتے ہیں لیکن اگر ثلاثی ایک علیحدہ صنف سخن ہے تو اس کے لیے رباعی کی طرح مخصوص بحر ہونی ہی چاہیے ورنہ ہر معہ مصری نظم کو ثلاثی بھی کیوں کہا جائے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ثلاثی کو تثلیث کے نام سے مکمل شکل قمر اقبال نے دی ہے۔''

اسی لئے میں نے مضمون کے ابتدا میں لکھا ہے کہ عارف خورشید نے اپنے لئے شاعری کی ہے۔ عارف خورشد کے افسانچوں کا رنگ ان کی شاعری میں بھی صاف جھلکتا ہے ملاحظہ کیجئے۔

میرے ہمراہ دو قدم چل کر
خود ہی وہ اصل راہ بھول گیا
تھا مرے قافلے کا جو رہبر

سہ مصرعی نظموں کی طرح عارف خورشید غزل پر بھی اچھی گرفت رکھتے ہیں اور اپنے لیے چھوٹی بحر پسند فرماتے ہیں، لیکن چھوٹی بحروں میں بھی بڑی بڑی باتیں صفائی سے کہہ دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

کرنے لگتی ہے آنکھ ہی باتیں
جب کوئی بے زبان ہوتا ہے

عارف خورشید اپنے مزاج کی طرح شعر کہتے ہیں جس طرح وہ اپنی باتوں اور نثر میں چٹکی لینے سے نہیں چوکتے اسی طرح شاعری میں بھی نہیں چوکتے ملاحظہ فرمائیں:

اس شہر میں سچ بات کا دستور نہیں ہے
لگتا ہے یہاں کوئی بھی منصور نہیں ہے

مومن خان مومنؔ کی زمین میں عارف خورشید نے کیا پیاری بات کہی ہے، کس خوبصورتی سے کہی ہے اور کس چابکدستی کا مظاہرہ کیا ہے کہ ہے دشمن بھی درد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ آپ ملاحظہ فرمائیں:

اے خدا تجھ سے بات کرتا ہوں
گھر میں جب تیسرا نہیں ہوتا

بہر حال عارف خورشید جیسے کثیر الاشاعت ادیب و شاعر کے لئے چند صفحات پر کچھ بھی لکھنا مشکل کام ہے میں نے ایک کوشش کی ہے لیکن خود مطمئن نہیں ہوا ہوں۔ شاید آپ حضرات کی تشنگی بھی باقی رہ گئی ہو۔ اس لیے معافی چاہتا ہوں۔ بھائی عارف خورشید کو ان کی تمام تخلیقات تمام کاوشات کے لئے دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ زور قلم اور زیادہ اور زیادہ۔

☆☆☆

عارف خورشید......'وقت کے چاک پر'

سلام بن رزاق

عارف خورشید ایک ہمہ صفت قلمکار ہیں۔ انھوں نے ناول، افسانہ، افسانچہ، شاعری، تبصرے، خاکہ نگاری غرض یہ کہ ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر میدان میں اپنے تخلیقی اظہار کے کہیں دھندلے، کہیں گہرے نقش چھوڑے ہیں۔ اگر چہ تخلیقی اظہار کی یہ خوبی اُن کی فنکارانہ شخصیت کا ایک بڑا وصف ہے تاہم یہ ہمہ جہتی بحیثیت فنکار اُن کی شناخت قائم کرنے میں دشواری بھی پیدا کرتی ہے۔ مختلف اصناف پر مشتمل اُن کی اب تک ڈیڑھ درجن کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان سب کا جائزہ لینے کے لیے ایک دفتر درکار ہے لہذا یہاں ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر اُن کی صرف ایک کتاب ''وقت کے چاک پر'' کا مختصراً جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں چار افسانے، چار خاکے، ایک تبصرہ اور باقی افسانچے ہیں۔ اس سے پہلے اُن کے غالباً پانچ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے شائقین ادب کے ذہنوں میں اُن کا نام محفوظ ہے۔ اگر چہ اُن کے بعض افسانوں پر ''جدیدیت'' کا ملمع چڑھا ہوا نظر آتا ہے تاہم اُن کے بیشتر افسانے ابہام اور ژولیدگی سے پاک ہوتے ہیں۔ انھوں نے متنوع موضوعات پر افسانے لکھے ہیں مگر ''عورت اور مرد کا جنسی رشتہ'' اُن کا محبوب موضوع ہے۔ جس پر انھوں نے مختلف پہلوؤں سے خامہ فرسائی کی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ میں چاروں افسانے اسی ''رشتے'' کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔

''شجر ممنوعہ'' میں غازی اور ملکہ ہنی مون منانے اورنگ آباد آتے ہیں۔ تنہائی پاتے ہی دونوں کے جسم خود سپردگی کے جذبے سے چھلکنے لگتے ہیں لیکن عین اختلاط کے وقت غازی کے تصور میں اپنی سابقہ محبوبہ شبینہ کا چہرہ ابھرتا ہے اور اُس کا جوش سرد پڑنے لگتا ہے۔ اسے شبینہ کے ساتھ بتائے ہوئے لمحے بار بار یاد آتے ہیں۔ شبینہ کے ساتھ بوس و کنار کی حد تک وہ سارے مراحل سے گزر چکا تھا مگر آخر میں شبینہ اُسے منزل پر پہنچنے سے پہلے یہ کہہ کر روک دیتی ہے کہ ''امانت میں خیانت گناہ ہے'' اور اب

ملکہ سے وصل کے لمحوں میں اُسے شبینہ اسی لیے بار بار یاد آتی ہے کہ اُس نے اپنی ''امانت'' کے ساتھ ساتھ اسے بھی ''خیانت'' کے گناہ سے بچایا تھا۔ غالباً اسی لحاظ سے افسانے کا عنوان ''شجر ممنوعہ'' رکھا گیا ہے۔

افسانے کی زبان رومانیت سے لبریز ہے۔ افسانے میں شروع سے آخر تک تجسس اور دلچسپی قائم رہتی ہے۔ افسانہ پڑھتے ہوئے بے اختیار غیاث احمد گدی کا افسانہ ''خانے تہ خانے'' یاد آجاتا ہے۔ ''خانے تہ خانے'' کی تھیم ''شجر ممنوعہ'' سے کافی ملتی جلتی ہے لیکن ''ٹریٹ مینٹ'' دونوں کا جداگانہ ہے۔

افسانہ ''سات چاند'' میں ایک ایسے شخص کی قلبی اور ذہنی کیفیت کا ذکر ملتا ہے جو ہر خوبصورت اور جوان عورت کو ہوس پرستانہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اس ہوسنا کی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُس کی نگاہ میں اپنی نئی نویلی بیوی کے جسمانی حسن کی کشش ماند پڑنے لگتی ہے۔ اُسے پشیمانی ہوتی اور وہ اپنی ''بدنگاہی'' پر شرمندہ بھی ہوتا ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے ''ہوس ناکی'' کے ایک اچھوتے پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

''داستان مرکب ہے'' ایک تجریدی قسم کا افسانہ ہے۔ اس افسانے پر بھی جنس کا غلبہ ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار جس نے بچپن میں اتفاق سے اپنے والدین کی ہم بستری کا منظر دیکھ لیا تھا ''جنس زدگی'' کا شکار ہو جاتا ہے۔ سن بلوغیت کے بعد گیارہ سال کی لڑکی سے لے کر ساٹھ سال کی عورت تک کا تجربہ حاصل کرتا ہے۔ ہم جنسی کا بھی مرتکب ہوتا ہے لیکن شادی کے بعد پہلی ہی رات کو اپنی بیوی کو مطمئن کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے اور بیوی اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ نتیجے کے طور پر مذہب کی طرف راغب ہوتا ہے مگر یہاں بھی اسے قلبی سکون نہیں ملتا۔

افسانے کی زبان عمدہ ہے۔ بعض جملے بھی خوبصورتی سے تراشے گئے ہیں مگر عبارت کی بے ضابطگی قاری کی توجہ کو بار بار منتشر کر دیتی ہے جس سے افسانہ کسی گہرے تاثر کے بغیر مرکزی کردار کے اضطراب اور التہاب پر ختم ہو جاتا ہے۔ افسانے کا موضوع جتنا بھاری بھر کم ہے، افسانے کا ٹریٹ مینٹ اتنا ہی کمزور ہے۔

اس کتاب کا چوتھا افسانہ ''بے آواز شہادت'' فلیش بیک کی تکنک میں لکھا گیا ہے جس میں

ایک مدرس اپنی سبکدوشی کے دن دوران ملازمت پیش آنے والے سرد و گرم واقعات کو یاد کرتا ہے۔ اُسے اسکول سے رخصت ہونے کا غم ہے کیوں کہ اُس نے اسکول کو اپنے خون پسینے سے سینچا تھا۔ افسانے میں اسکول کو تمثیلی انداز میں مدرس کی محبوبہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ رومانیت سے مملو اس افسانے کے اسلوب میں بھی ''جنسی'' جھلکیاں موجود ہیں۔ یہ ایک صاف ستھرا اور جذباتی موضوع تھا۔ یہاں ''جنس'' کی قطعی گنجائش نہیں تھی۔ بعض جگہ جنسی استعاروں کے سبب موضوع کی پاکیزگی مجروح ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ عارف خورشید جہاں دیدہ افسانہ نگار ہیں لیکن پتا نہیں کیوں اُن کے بیشتر افسانوں میں ''جنس'' ایک لازمی عنصر کے طور پر شامل ہو جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اُن کے ذہن کو ''جنس'' آکاش بیل کی طرح جکڑے ہوئے ہے جو دوسرے موضوعات کو پنپنے نہیں دیتی۔ انھیں اپنے گلے میں پڑے ''جنس'' کے اس سانپ سے نجات پانی ہوگی ورنہ اُن کا فن ''جوئے کم آب'' کی طرح سمٹ کر رہ جائے گا۔ ''وقت کے چاک پر'' میں قاضی سلیم، حمید سہروردی، جاوید ناصر اور رشید انور پر چار خاکے شامل ہیں۔

خاکہ نگاری، افسانہ نگاری سے قدرے مختلف فن ہے۔ اس میں کردار سازی کی بجائے شخصیت شناسی پر توجہ مرکوز کرنی ہوتی ہے۔ نیز حقائق کو معروضی انداز میں اس طرح پیش کرنا ہوتا ہے کہ اُن میں ''فکشن'' کا سا لطف پیدا ہو۔ ذرا سی لغزش سے بھی خاکہ نگار پر جانب داری، تعصب یا مبالغہ آمیزی کا الزام عائد ہو سکتا ہے۔ عارف خورشید کے خاکے بے شک مذکورہ معائب سے پاک ہیں۔

''وقت کے چاک پر'' کے عنوان سے قاضی سلیم کا خاکہ ہے۔ قاضی سلیم منفرد لب و لہجے کے جدید شاعر تھے۔ اُن کی نظموں کے دو مجموعے آئے ہیں۔ ''نجات سے پہلے'' اور ''رستگاری'' قاضی سلیم نے بہت کم لکھا مگر جدید شاعری میں اُن کا مقام و مرتبہ مستحکم ہے۔ قاضی سلیم بڑی دلآویز شخصیت کے مالک تھے۔ نرم خو اور نرم گو۔ اُن سے جو بھی ایک بار ملتا اُن کا گرویدہ ہو جاتا۔ عارف خورشید نے بڑی محبت اور احترام سے اُن کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

دوسرا خاکہ جاوید ناصر کا ہے۔ جاوید ناصر عارف خورشید کے عزیز دوستوں میں تھے۔ انھوں نے جاوید ناصر کی شخصیت کی ایک ایک پرت کو پوری دردمندی سے کھولا ہے۔ جاوید ناصر ایک باصلاحیت، قادر الکلام، بلاغت نظام مگر مشکل پسند شاعر تھے۔ کم سخن تھے مگر جب بولنے پر آتے تو یوں

معلوم ہوتا ''اردوئے معلیٰ'' کا باب کھل گیا ہے۔ آواز میں مردانہ وقار تھا۔ مشاعروں اور جلسوں کی نظامت اس خوبی سے کرتے کہ شاعروں اور ادیبوں سے زیادہ داد پاتے۔ مگر کثرت شراب نوشی کی لت اُن کی ساری صلاحیتوں کو دیمک کی طرح چاٹ گئی۔ آخر کار اُن کی دردناک موت کا سبب بھی یہی بلانوشی قرار پائی۔ عارف خورشید نے اپنے خاکے میں جاوید ناصر کی زندگی کے ایک ایک منظر کو اس خوبی سے مصور کر دیا ہے کہ خاکہ پڑھتے ہوئے گمان ہوتا ہے کہ ہم کوئی فلم دیکھ رہے ہیں۔

تیسرا خاکہ اردو کے معروف جدید افسانہ نگار حمید سہروردی کا ہے۔ یہ خاکہ اگرچہ مختصر ہے مگر عارف خورشید نے اس مختصر خاکے میں بھی اُن کے افسانوں کی جہتیں اور شخصیت کی پرتیں اس مہارت سے کھولی ہیں کہ داد دیتے بنتی ہے۔ چوتھا خاکہ افسانہ نگار رشید انور کا ہے۔

مجموعے کے آخر میں باون افسانچے شامل ہیں۔ عارف خورشید نے افسانچے بھی خوب لکھے ہیں۔ اس سے قبل اُن کے افسانچوں کے دو مجموعے آچکے ہیں۔

ایک عمدہ افسانچہ غزل کے شعر کی طرح گٹھاؤ دار اور معنی و مفہوم سے لبریز ہوتا ہے۔ اِدھر ہمارے بعض افسانچہ نگار جو افسانچے لکھ رہے ہیں انھیں صرف الفاظ کی کھتونی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ عارف خورشید کے بعض افسانچے عمدگی سے لکھے گئے ہیں اور فن کے معیار کو چھوتے نظر آتے ہیں تاہم انھیں بھی ''کثرت نویسی'' سے احتراز برتتے ہوئے معیار و میزان پر مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

''وقت کے چاک پر'' عارف خورشید کی تحریروں کا ایسا انتخاب ہے جس میں اُن کی نثری کاوشوں کی تمام جھلکیاں موجود ہیں۔

☆☆☆

قاری سے مکالمہ قائم کرنے والا فنکار

سلیم احمد

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے لیے دو فرشتے مامور کر رکھے ہیں۔ ایک اچھائیوں اور نیکیوں کو درج کرتا ہے جبکہ دوسرے فرشتے کے ذمہ غلطیوں کی نشاندہی کرنا ہے۔ میری ادبی زندگی میں بھی عارف خورشید اور نورالحسنین انہی دو فرشتوں کی طرح ہیں نورالحسنین نے میری صلاحیتوں کو فروغ دینے میری خوبیوں سے آشنا کروایا تو عارف خورشید نے میری ادبی لغزشوں سے روشناس کروایا۔ بلکہ اپنے اس فریضے کو انھوں نے پوری دیانتداری اور سفاکی کے ساتھ ادا کیا۔ عارف خورشید کے نشتروں نے میری تحریر میں نکھار ضرور لایا مگر کئی تخیلات کا گلا بھی کاٹ دیا۔ گزشتہ ایک دہائی سے میں اپنے فن کی بیلنس شیٹ لیے بیٹھا تجزیہ کر رہا ہوں کہ ان کی عمل جراحی نے کتنا نقصان پہنچایا اور کتنا فائدہ؟ یہی بے رحمی عارف خورشید نے معاشرے کے زخموں کے ساتھ بھی روا رکھی۔ زخم یونہی نہیں بھر جاتے۔ انھیں پہلے کھرچا جاتا ہے، صاف کیا جاتا ہے پھر مرہم پٹی کی جاتی ہے۔ معاشرے کے زخموں کو بھی عارف خورشید پہلے کھرچتے ہیں اور پھر اپنے الفاظ کا مرہم لگا کر انھیں بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اس عمل جراحی میں کچھ درد ضرور ہوتا ہے، مگر معاشرے کے درد کو محسوس کرتے کرتے وہ خود بھی زخم زخم ہو جاتے ہیں۔ سحر سعیدی کے مجموعۂ کلام پر اپنے تاثرات واضح کرتے ہوئے مرحوم شاعر قمر اقبال نے لکھا تھا ہر بند کتاب فنکار کی رہائش گاہ ہوتی ہے۔ کسی کتاب کو کھولنا دروازے پر دستک دینے کے مترادف ہے۔ سچا فن کار پہلے ہی ورق پر خوش اخلاقی سے آپ کا خیر مقدم کر کے ذہنی، دلی اور روحانی ضیافت کا اہتمام کرتے ہوئے صفحۂ آخر پر پھر ملنے کے وعدے پر رخصت کر دیتا ہے۔ عارف خورشید نے یہ ضیافت بار بار کی مگر ہر بار قاری اپنے ذہن میں کچھ مضطرب سوالات لے کر لوٹتا ہے۔ کیونکہ عارف خورشید اپنے کرداروں کو کسی ماہر مصور کی طرح اپنے ذہن کے کینوس پر ابھارتے ہیں، انھیں جیتے ہیں اور پھر لفظ و معنی کی حرارت سے انھیں زندگی عطا کرتے ہیں۔ وہ اس لحاظ سے بھی منفرد ہو جاتے ہیں

کہ ان کا گہرا سماجی شعور اور درون بینی اور معاشرے کی کج روی پر طنزیاتی چوٹیں لفظوں کے گھاٹ سے اس طرح برآمد ہوتی ہیں کہ قاری کا کلیجہ کانپ اٹھتا ہے۔ عارف خورشید خان شمیم کی نظر میں انسانی محرومی کے بہترین فوٹوگرافر ہیں۔ وہ کم سواد افسانہ نگاروں کی طرح محض تخیل کی معلوم دنیا آباد نہیں کرتے۔ چونکانا اور حیرت زدہ کرنا ان کے فطری اور فنی دائرہ کار میں نہیں۔ وہ اس سے زیادہ اسی آفاقی بصیرت کے متلاشی ہیں جو بشریت کو رازہائے درون سے آشنا کروانا چاہتی ہے۔ عارف خورشید کے افسانوں کا باطنی نظام فلسفیانہ ہے۔ وہ گہری سوچ اور فکر کی مٹی سے ایسے خیال انگیز کردار تراشتے ہیں کہ قاری کو ان کے ساتھ مکالمہ قائم کرنے کے لیے ہی تمام تر تخلیقی توانائیوں سے کام لینا پڑتا ہے اور وہ بالآخر ان کی فکری صلاحیتوں پر ایمان لے آتا ہے۔ عارف خورشید نہایت محتاط افسانہ نگار ہیں لیکن اپنے قلم کے تیشے سے نظام کہن اور نظام جدید کی تھوپی ہوئی مصنوعی اقدار کو کانٹ چھینکنے کے جذبے سے وہ سرشار رہتے ہیں۔

☆☆☆

عارف خورشید کی غزل

سلیمان اطہر جاوید

غزل اردو شاعری کی بڑی بانکی صنف ہے، سیدھی سادی اور دلکش و دلنواز بھی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ غزل اپنے ازل سے لے کر آج تک پر بہار صنف سخن رہی ہے۔ چاہے کوئی موسم ہو، کیسی ہی فضا ہو، آب وہوا بھی کیسی ہی ہو، غزل غزل رہی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نے بھی غزل کہی اور حسن شوقی نے بھی۔ اپنے ایک بلند ایک بلند معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ولی، سراج اور داؤد کی غزل بھی اپنا وزن و وقار رکھتی ہے پھر میر اور سودا کا زمانہ آتا ہے۔ غالب نے بھی مملکت غزل پر حکمرانی کی۔ حالی اور پھر اقبال نے اپنا جہاں آباد کیا۔ بعد ازاں یگانہ اور جوش اور ترقی پسندوں کا دور آتا ہے۔ حالی نے غزل کی اصلاح چاہی تو کسی نے غزل کی ستائش کی اور کوئی غزل کی مذمت پر اتر آئے۔ ہر چند کہ دونوں بھی شاعر نہیں تھے لیکن کلیم الدین احمد نے غزل کو وحشی صنف قرار دیا اور رشید احمد صدیقی کے نزیک غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ غرض غزل کہنے والے غزل کہتے رہے۔ ترقی پسند تحریک کو نیند آنے لگی تو نئی غزل سے سامنا ہوا۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت نے بھی کیا کیا رنگ نہیں دکھائے۔ کلاسیکل انداز بھی رہا لیکن غزل نے اپنے پاؤں جمائے رکھے۔ آزاد غزل، نثری غزل اور دوہا غزل جیسی پھلجھڑیاں بھی چھوڑی گئیں۔ تاہم غزل کا نام اونچا کرنے میں ناصر کاظمی، احمد مشتاق اور خورشید احمد جامی جیسے چند ایک نام ملتے ہیں اور غزل کی مٹی پلید کرنے میں عادل منصوری اور ظفر اقبال جیسے شاعر رہے۔ فی زمانہ حالات غنیمت ہیں اتنی بے راہ روی نہیں غزل نے اپنا ناک نقشہ سنوار لیا ہے۔

غزل کہنا آسان ہے لیکن اچھی غزل کہنا یا غزل میں اچھے اشعار نکالنا دشوار تر بلکہ دشوار ترین امر ہے، اس لیے شاعروں کی اس کثرت اور غزلوں کی اس بہتات کے باوجود اچھے اشعار بہت کم، بے حد کم ملتے ہیں۔ نئی غزل ایسا نہیں ہے کہ سرتاپا اپنے وجود ہی سے نئی ہے، اس کے بحور و اوزان اور ہیں، کسی اور دنیا سے لائے ہوئے ہیں بلکہ یہ سب کچھ وہی ہیں جو پہلے تھے۔ نیا پن موضوعات کے تعلق

سے اس کے رویہ میں ہے، اس کے لب ولہجہ اور اسلوب میں ہے، اس کے نکھار میں ہے، اس کے تاثر میں ہے اور مجموعی طور پر اس کا ڈکشن کچھ اور ہو جاتا ہے۔ کیا بات ہے کہ ناصؔر کاظمی اور جامؔی وغیرہ کو پڑھتے ہوئے سب کچھ ایک ہونے کے باوجود سب کچھ نیا نیا دکھائی دیتی ہے۔ وہی لفظیات لیکن ان میں شاعر کا انتخاب، الفاظ سیدھے سادے بلکہ کہیں تو غیر شاعرانہ لہجے میں ایک سپاٹ اور کھردراپن، تشبیہات اور استعارات میں نیاپن، آج کے ماحول سے اخذ کردہ۔ شاعر کو یہ سب اس لیے قبول کہ آج کا معاشرہ خود ایسا ہے اس میں ایسی شیرینی اور لطافت کہاں؟ وہ دیکھتا، برتتا ایسی زندگی ہی کو ہے وہ اس کی ترجمانی نہیں کرے گا تو اور کیا؟

عارف خورشید نے بھی اسی معاشرے کی ترجمانی کی ہے جس میں وہ زیست کر رہے ہیں۔ عارف خورشید اس معاشرے کی ترجمانی کچھ اس قرینے سے کرتے ہیں کہ زندگی آئینہ ہو جاتی ہے۔ وہ معاشرے جس میں عدم اعتماد کی فضا ہے، بے معنویت عام ہے خود اعتمادی کا فقدان ہے، لایعنیت ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے، مفاد پرستی عام مزاج بن چکی ہے، دوستی، رشتہ داری، قرابت سب کچھ تجارت بن چکے ہیں، جیسے لغت میں مہر و مروت اور دوستی جیسے الفاظ نہ ہوں۔ اپنے سائے سے بھی بدگمان ہو، پاس ولحاظ کا کوئی مفہوم نہ ہو، عارف خورشید کے اشعار ہیں:

آج جینا عذاب ہے یارب — پڑھ کے لگتا ہے روز کا اخبار

جی رہا ہوں مگر ابھی عارف — زندگانی کا منتظر ہوں میں

عارفی یہ گردشیں — زندگی کی شام تک

زندگانی کی دھوپ میں عارف — ریزہ ریزہ بکھر گیا ہوں میں

بس دھوپ ساتھ ساتھ رہی زندگی تمام — اس ریگزار وقت میں شاید شجر نہ تھے

عارف خورشید ہی کیا ہر کوئی اپنے ریزہ ریزہ بکھرنے وجود کو سمیٹنے میں ہے لیکن زندگی ہے کہ جتنی سمیٹو اتنی بکھر جاتی ہے۔ غم جاناں تو ہے ہی غم دوراں بھی دم لینے کی فرصت نہیں دیتا۔ عارف خورشید زندگی کے پیچ وخم اور نشیب و فراز کو سہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں زندگی کی حقیقتیں کڑوی کسیلی ہیں لیکن کیا کیا جائے یہی تو زندگی ہے۔ شعر سنیے:

گزر رہی ہے یہ کس شہرِ روشنی سے حیات
ہر ایک ذرہ یہاں حلقۂ سیاہ میں ہے

جب یہ پس منظر ہو تو کس سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ انسان اپنا کردار کہاں تک محفوظ رکھے، شاید وہ رکھ بھی نہیں سکتا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا اور افراد بے کردار ہو گئے ہیں۔ انسان انسان نہ رہا۔ عارف خورشید نے نہایت عمدگی کے ساتھ اس کا اظہار کیا ہے:

سنتے ہیں کل کے دور میں انسان تھے بہت
تاریخ ہے اداس کہ انسان اب کہاں؟

کہنے والے کہتے ہیں کہ نئی غزل زندگی کے حقائق سے منہ چھپاتی ہے۔ ہمارے شاعروں بلکہ ہر دور کے شاعروں کے ہاں زندگی کی حقیقتوں سے فرار کی مثالیں مل جائیں گی لیکن ایسا نہیں ہے کہ زندگی کی تلخیوں کا سامنا کرنے والے نہیں ہیں۔ غمِ روزگار اور زندگی کی کڑوی کسیلی حقیقتیں تو زندگی کا جزو لازم ہیں۔ ان کا سہنا بھی زندگی ہے۔ عارف خورشید نے زندگی کے غموں سے فرار حاصل نہیں کی۔ وہ زندگی کی دھوپ چھاؤں کو محسوس کرتے ہیں لیکن یہ جو زندگی کی قدریں بدل گئی ہیں اب زندگی عیش وطرب اور شعر ونغمہ کا نام نہیں، کڑے کوسوں کو طے کرنے کا نام ہے۔ زندگی وصالِ محبوب ہی نہیں فراقِ یار بھی ہے۔ عارف خورشید کے یہ شعار:

زندگانی کو مخاطب کر کے یہ کہہ دو ذرا
فکرِ دانۂ گندم خیال جو بھی ہے

گئے موسم کی خوشبو کے سوا کیا پاس باقی ہے
دکھا لہجہ، بکھرتا ٹوٹتا احساس باقی ہے

آواز تبدیل ہو جاتی ہے، انداز بدل جاتا ہے، لہجے میں فرق آجاتا ہے۔ اطوار و آداب بھی وہ نہیں رہتے، لیکن رومانیت، حسن و عشق کے موضوعات اپنی جگہ تھے اور رہیں گے خواہ نئی غزل ہو یا کسی کی کہیں ''پرانی'' غزل۔ ویسے حقیقت بھی ہے غزل اپنے روایتی موضوعات سے صرفِ نظر کیوں کرے۔ عارف خورشید نے رومانی شاعری نہایت وسعت قلبی کے ساتھ کی ہے اور تو اور اُن کے ہاں ایسا شعر بھی مل جاتا ہے:

سمجھتا تھا کسی کو مہ جبیں، زہرہ جبیں کل تک
جو دیکھا غور سے تو اپنی بیوی ہی حسین نکلی

چند اور رومانی اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

زلف کی وہ خوشبوئیں
آگئیں مشام تک

اب مری بینائی ہے وہ سانولی سی چاندنی نقش سب دھندلا گئے بس ایک چہرہ رہ گیا

فضا تصویر بن کر مسکرائی کس کا تذکرہ جب بھی ہوا ہے

درمیاں میں کیا حیا کافی نہ تھی کس لیے تم نے یہ چلمن ڈال دی

ہے اُسی کی ہواؤں میں خوشبو وہ بچھڑ کر ہے درمیاں جیسے

اس کے دست حنائی کیا کہنا سرخ ہیروں سے ہیں جڑے ناخن

آج بھی سلگتا ہے خانۂ تصور میں تیرے جسم کا صندل، تیرے گیسوؤں کا عود

عارف خورشید کا طرز اداصاف، سادہ، سہل اور شفاف ہوتا ہے، وہ تشبیہ واستعارے سے کم ہی کام لیتے ہیں۔ مافی الضمیر کا راست اظہار کرتے ہیں، اُن کے ہاں ایسے اشعار نہیں ملیں گے جن سے نئی غزل کی حرمت پر حرف آتا ہو۔ نئی غزل کے سلسلے میں یہاں پیش کردہ اشعار سے اندازہ ہوگا کہ نئی غزل کی آبرو کو افزوں کرنے میں عارف خورشید کا بھی حصہ ہے:

رکھ کے سرِ شام کے کاندھے پہ دہکتا سورج اک تھکے ماندے مسافر کی طرح سو ہی گیا

یوں بھٹکتا ہے شہر بھر میں وہ بھول جائے کوئی مکاں جیسے

نئی غزل کے ایسے اشعار تو اُن کے ہاں اور مل جائیں گے لیکن وہ اشعار بھی ملتے ہیں جن سے نئی غزل کے وزن و وقار میں کوئی ایسا اضافہ نہیں ہوتا۔ ان اشعار کو بھی ملاحظہ کریں:

دھوپ کہتی ہے کیوں بھٹکتے ہو چھاؤں کا ذائقہ نہیں ہوتا

آج مغرب سے جو گیا ہے وہ بیچ رستے میں سو گیا ہے وہ

پیڑ کی شاخوں پہ ہوگا سورج اور جلتا ہوا سایہ ہوگا

ناؤ کاغذ کی بہا دے یارب مجھ کو ملاح بنا دے یارب

عارف خورشید نے کلاسکس سے اپنے رشتے کو مستحکم رکھا ہے۔ ممکن ہے انھوں نے اور بھی لکھا ہو لیکن اُن کے شعری مجموعے "سوچ کے جزیرے" میں دو طرحی غزلیں ہیں جن کے مصرعہ طرح ولؔی اور سراؔج کی غزلوں سے لیے گئے ہیں۔ ولی اور سراج سے ایک تو اُن کی وابستگی، دوسرے فن، شاعری اور زبان و بیان پر اُن کی قدرت۔ طرحی غزلوں کا رنگ چوکھا ہو گیا ہے۔ ولی کی غزل کا

مصرعہ طرح ہے:

دل کوں تجھ باج بے قراری ہے

عارف خورشید کی طرحی غزل ہے اس سے دو اشعار:

چشم چاہت سے خون جاری ہے آنکھ میں زخم انتظاری ہے
چین دل کا نہ لطف جاں اس میں حاصل عشق بس کہ خواری ہے

اور سراج کی غزل سے لیا گیا طرحی مصرع:

اول کی تم نے بھول گئے مہربانیاں

عارف کی طرحی غزل سے یہ دو اشعار:

جن بوریا نشینوں کی میٹھی تھیں بانیاں اُن کی دلوں پہ آج بھی ہیں حکمرانیاں
جب گھل گیا ہے زہر ہی بچوں کے دودھ میں ہوں کیوں نہ میرے عہد میں بوڑھی جوانیاں

عارف خورشید کے وہ شعری مجموعے جن میں غزلیں بھی شامل ہیں غالباً تین ہیں: ''ٹوٹا ہوا آئینہ''، ''لمحوں کی صلیب'' اور ''سوچ کے جزیرے''۔ اُن کا شعری سفر جاری ہے، جاری رہے گا اور وہ اورنگ آباد کے، جی نہیں اورنگ آباد ہی کے نہیں مہاراشٹر کے، جی نہیں مہاراشٹر ہی کے نہیں اردو دنیا کے ممتاز شاعروں میں شمار ہوں گے۔ اُن کی شاعری ہے ہی ایسی تہہ دار اور طرحدار!

☆☆☆

بیانیے کے تاثر کی تصویر

سلیم شہزاد

افسانچے (تین چار سطروں سے ڈیڑھ دو صفحے تک پھیلی ہوئی کہانی) کی صنفی تعریف، اس کے متن کی تشکیل کی تکنیک، اس کے تاثر اور موضوعات وغیرہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے مختلف قارئین (اور یہ قارئین خود افسانہ نگار ہیں، باضابطہ نقاد نہیں، ایک صاحب کے سوا) عارف خورشید کی افسانچہ نگاری پر یوں رقمطراز ہیں:

> افسانچوں کے اختصار کو تاثر کی طویل ترین کیفیات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
> دوسطری کہانی اسی طرح ہمارے تلازموں سے جڑ کر ذہن میں اتنی طویل ہو جاتی ہے جتنی ہماری عمر بھر کی واردات۔
>
> (جوگندر پال/پیش لفظ: آتشیں لمحوں میں)

افسانچوں کے تاثر کا عمر بھر کی واردات کی طرح طویل ہونا محض شاعرانہ غلو ہے۔ افسانچے کا تو کیا، کسی بہترین طویل افسانے بلکہ ناول کا تاثر بھی ایک عمر کی طوالت نہیں رکھتا۔ نورالحسنین فرماتے ہیں:

> عارف خورشید کے افسانچے فلسفیانہ اور ناصحانہ انداز سے پاک ہیں، ان کے پاس خواہ مخواہ کی خود کلامی نہیں، انھوں نے جس پر بھی قلم اٹھایا، پوری بے باکی اور دیانتداری سے کاغذ پر منتقل کیا اور ایسا تاثر قائم کیا کہ دل و دماغ ایک جھٹکا سا محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔
>
> (پیش لفظ: یادوں کے سائباں)

جوگندر پال افسانچے کے جس تاثر کو عمر بھر تک لمبا کھینچ رہے تھے، نورالحسنین نے اسے صرف ایک جھٹکے تک محدود کر دیا۔ یہ بھی عرض ہے کہ افسانچے کی بساط ہی کیا کہ اس میں خود کلامی کی جائے۔

م۔ناگ بھی نورالحسنین کی طرح عارف خورشید کی بے باکی کے قائل ہیں۔ لکھتے ہیں:

''اور کچھ بھی نہیں کہانی میں'' وہ پوری خود اعتمادی کے ساتھ بڑے dashing انداز میں سامنے آتے ہیں۔''

افسانچہ نگار کا dashing انداز میں سامنے آنا محلِ نظر ہے۔ ایسا افسانے یا ڈرامے کے کردار کے تعلق سے کہا جا سکتا ہے، فنکار کے تعلق سے نہیں اور لفظ dashing میں ذرا سی بھی اہلیت نہیں کہ کسی معمولی تنقیدی رائے کا حصہ بن سکے۔ م ناگ اسے استعمال کرتے ہیں تو وہ جانیں۔ آخر میں سلیمان اطہر جاوید کا تبصرہ بھی ملاحظہ کریجیے:

عارف خورشید نے مذہبی رہنماؤں کی بے بصری، ان کے کردار کی گراوٹ، مذہب کے نام پر عوام کا استحصال، اخلاقی بے راہ روی اور بگاڑ، معاشرتی رغبت، انتشار اور خلفشار اور زندگی کے کھوکھلے پن کو نشانہ بنایا ہے۔

ہمارے ناقدین کا المیہ یہ ہے کہ وہ ایک خرابی کو پورے معاشرے پر چسپاں کر دینے کی عجلت میں ہوتے ہیں مثلاً عارف خورشید کے افسانچے میں کسی مذہبی رہنما کی بے بصری کا رونا رویا گیا ہے تو ضروری نہیں کہ معاشرے کے سارے مذہبی رہنما ایسے ہی بے بصر ہیں جیسا کہ اوپر دیا گیا اقتباس مذہب والوں کی خرابیوں کو چن چن کر اکٹھا کر رہا اور عارف خورشید کے سر منڈھ رہا ہے کہ آں جناب ان برائیوں کو پورے معاشرے میں پھیلا ہوا دکھا رہے ہیں۔ یہ وہی بات ہے کہ افسانچے کے لمحاتی تاثر کو پوری زندگی کی طوالت تک محسوس کیا جائے۔

جوگندر پال ہوں کہ نور الحسنین، م ناگ ہوں کہ سلیمان اطہر، کسی صاحب نے یہاں زحمت نہیں فرمائی کہ عارف خورشید کے حوالے سے افسانچے کی ہیئت، اس کی بیانیہ تکنیک اور صنفی حیثیت وغیرہ پر خامہ فرسائی کرتے۔ پیش لفظ اور تبصرے جیسی چیزوں میں غیر تکنیکی مباحث کی گنجائش بھی کم ہوتی ہے مگر صرف تاثراتی باتیں کہہ کر کسی صنف کی یوں ناقدری بھی قابلِ قبول نہیں۔

افسانچے کے تعلق سے عرض ہے کہ اس کی روایت کے آغاز و ارتقاء کے مباحث ہوں کہ اس پر تحقیقی اسناد کے حصول کی سرگرمی، اس ادبی مظہر کی صنفی تنقید پر کوئی ایسی تحریر اب تک راقم کے مطالعے میں نہیں آئی جو افسانوی بیانیے کے تناظر میں افسانچے پر بحث کرتی ہو۔

کہانی ایک بیانیہ نثری صنف ہے اور اس کی مختلف ہیئتیں اس کے بیانیے کی طوالت سے

شناخت کی جاتی ہیں۔ انگریزی کے تتبع میں ایک کہانی کو ہم بھی مختصر افسانہ (short story) کہتے ہیں۔ لیکن کم طویل بیانیے کی اس ساخت و بافت میں مزید کتر بیونت کر کے ہمارے قصہ کہانی سنانے والے فنکار آج تک ایک مختصر ترہیئت پر بھی طبع آزمائی کر رہے ہیں اور حاصل شدہ بیانیہ متن کو کبھی منی کہانی، کبھی افسانچہ، کبھی خیال پارہ اور کبھی پوپ کہانی وغیرہ کا نام دے رہے ہیں۔ (اس نام کرن کے بھی بڑے جھگڑے ہیں۔) صنفی حیثیت سے یہ کون سا ادبی مظہر ہے یہ اب تک فنکار طے کر سکے ہیں، نہ اس چیز پر تحقیق و تفتیش کرنے والے ہی اس مختصر ترین لسانی مظہر کی کوئی صنفی شناخت متعین کر سکے ہیں۔ بہر حال اسے کوئی بھی نام دیا جائے، اصلاً یہ رہے گی بیانیہ نثری صنف کہانی کا ایک روپ، یہاں جسے نئی نمودہ روایت کے مطابق افسانچہ کہیں گے۔ افسانے کی ایک ہیئت کی اولین مثالیں جنس نگار سعادت حسن منٹو کے تقسیم ملک کے زمانے میں ہونے والے فسادات کے پس منظر میں لکھے گئے چھوٹے چھوٹے افسانوی وقوعات کے مجموعے بعنوان ''سیاہ حاشیے'' میں ملتی ہیں جنھیں ان کی تیز طنزیہ کاٹ اور زہر خندگی کے اظہار کے سبب ناقدین نے لطیفوں یعنی چٹکلوں کا نام بھی دیا ہے۔ افسانے اور لطیفے کے فرق کو ملحوظ رکھیں تو منٹو سے عارف خورشید تک (جنس بیانی کو دونوں فنکاروں کے یہاں مشترک صفت کہا جا سکتا ہے) افسانچے میں تیز طنزیہ کاٹ اور زہر خندگی کے عوامل کو لطیفہ یا چٹکلا خیال کرنا بہر حال تنقیدی بصیرت کا نقص ہی کہلائے گا (ویسے بڑے بڑے عصری افسانہ نگاروں کے یہاں چٹکلوں کی کثرت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا) یاد رہے کہ افسانچہ ادب کی صنف افسانے سے ہم رشتہ ہونے کے سبب اپنے آپ میں ایک صنفی مظہر ہونے کی اہلیت رکھتا ہے جبکہ لطیفہ صوفیا کے لطائف کی لطافت سے تعلق رکھنے کے باوجود بادصف فنی اور ادبی مظہر نہیں اس لیے افسانچے کو لطیفہ بننے سے بہر حال بچایا جانا چاہیے۔

مابعد جدیدیت کی بہت سی اصطلاحوں کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ ہمارا معاشرہ تیز رفتار تبدیلیوں سے گزر رہا ہے اور ہم اپنے کیے کا فوری معاوضہ چاہنے والے ہو گئے ہیں۔ انکار ممکن نہیں کہ ہمارے شاعر اور ادیب بھی اس مرض میں مبتلا نظر آ رہے ہیں۔ کا تا اور لے دوڑی کا منظر سامنے ہے کہ کچھ فنکاروں نے (مثلاً جوگندر پال ہی نے سہی) مختصر ترین بیانیہ وقوعات لکھے اور انھیں منی کہانی وغیرہ کہہ کر چھپوا دیا۔ اسے شہرت کے حصول کا آسان طریقہ اور ذریعہ سمجھ کر زبان و بیان کی باریکیوں سے

نابلد لکھاری بھی منی کہانیوں، افسانچوں اور ڈیڑھ دوسطری افسانوں کے مجموعے چھپوانے لگے۔ پھر ان پر ناقدین کی آراء اور ان کے فرمائشی تبصروں کی الگ بھرمار ہوگئی۔ کچھ رسالوں اور اخباروں کے پیشہ ور مدیروں نے آگے بڑھ کر افسانچے کو مقبولیت دلانے کا بیڑا اٹھایا اور تحقیق و تنقید، افسانچہ نگاروں کے ''گوشے'' اور بحث و مباحثے کا پوپ ڈراما چل پڑا۔ ٹھیک ایسی ہی صورتحال نثری نظم کے وجود میں آنے پر پیش آئی تھی کہ بطور شاعر مشہور ہو جانے کے لیے بہت سے غیر شاعروں اور شعری اظہار کی لطافتوں سے ناآشنا لوگوں نے نثری نظموں کے مجموعے چھپوانے کی ہوڑ شروع کر دی تھی۔

نثری نظم ہو کہ افسانچہ، راقم کا ذاتی خیال ہے کہ ان چیزوں کی ''واقعی'' تخلیق کے لیے فنکار کو زبان، بیان اور فن کی نزاکتوں کا کماحقہ علم ہونا ضروری ہے۔ صاف لفظوں میں سننا پسند کریں تو کہا جاسکتا ہے کہ اگر آپ بہترین غزل یا نظم نہیں کہہ سکتے تو آپ اچھی نثری شاعری بھی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح آپ بہترین افسانہ (دس بیس صفحات پر پھیلا ہوا) اگر نہیں لکھ سکتے تو جناب آپ بہترین افسانچہ بھی نہیں لکھ سکتے۔ (منٹو اور پال کی مثالیں اپنے سامنے رکھ کر خود سے موازنہ کرلیں) موازنے کے اسی تصور کے پس منظر میں شاعر، افسانہ نگار، خاکہ نگار، تبصرہ نویس اور ناولسٹ (یعنی شاعر کم اور نثر نگار زیادہ) عارف خورشید کے چند افسانچوں کا جائزہ یہاں مقصود ہے۔

ہمارے دوست کے افسانوں کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں: (۱) سنہری رُت کا فریب (۲) یادوں کے سائباں (۳) آتشیں لمحوں میں (۴) احساس کا زخمی مجسمہ اور (۵) قافلے والو، سچ کہنا۔ ان کے علاوہ کچھ اور افسانے ''وقت کے چاک پر'' میں بھی شامل ہیں۔ (اس پر مستزاد ''یہ شام بھی کہاں ہوئی'' میں جو تین افسانہ نگاروں کا مشترک مجموعہ ہے عارف کے افسانے شامل ہیں) اسی طرح ''تنظیم کثیر رنگی'' ان کے شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے۔ ''رنگ امتزاج'' اور ''وقت کے چاک پر'' میں ایسے چند خاکے مزید دیکھے جاسکتے ہیں۔ ''اور کچھ بھی نہیں کہانی میں'' ان کی ایسی افسانوی تخلیقات کا مجموعہ ہے جن پر یہاں بحث مقصود ہے یعنی افسانچے۔ ''آنکھوں کی زبان'' (تین افسانچہ نگاروں کے مجموعے) میں عارف کے بھی افسانچے ملتے ہیں۔ مزید یہ کہ ''وقت کے چاک پر'' (جو ان کی تازہ تصنیف ہے) میں افسانوں، تبصروں اور خاکوں کے ساتھ افسانچے بھی موجود ہیں۔ ''لہولہو آرزو'' ان کا ایک ناولٹ (طویل افسانے سے طویل تر نثری بیانیہ) ہے۔ وہ فی الوقت ''چیخ کی معیاد'' کے عنوان سے ایک ناول

(ناولٹ سے طویل یعنی بیانیہ اصناف میں داستان سے کم طویل ہیئت) لکھ رہے ہیں۔

یہ تفصیل اس لیے ضروری تھی کہ فنکار موصوف کے نثر نگاری کی طرف میلان کا منظر واضح ہو جائے۔ اب اس کام کا معیار کیا ہے، یہ تو ان کی چیزوں کو پڑھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن جیسا کہ کہا گیا، افسانچہ لکھنے کے لیے نثر نگار کا زبان و بیان و فن پر دست قدرت رکھنا لازمی ہے، اس شرط کو عارف خورشید پورا کرتے ہیں۔ ذیل کے اقتباس سے ان کے نظریۂ فن کا اظہار ہوتا ہے کہ:

> ''کہانی زمین سے اٹھائی جاتی ہے، آسمانوں میں اس کی تلاش بے سود ہے۔ شعر میں تو gap پر کیا جا سکتا ہے مگر افسانے میں اس خلاء کی کوئی گنجائش نہیں _____ اپنی طرف سے کچھ کہہ کر آگے سوچنے کے لیے قاری پر چھوڑا تو جا سکتا ہے مگر اپنا مدعا چھپا کر قاری پر یہ بوجھ نہیں ڈال سکتے کہ وہ سوچے کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' (وقت کے چاک پر/ صفحہ ۴۹)

اس خیال کی روشنی میں موصوف کے چند افسانچوں کا جائزہ پیش ہے جو ''وقت کے چاک پر'' ۱۱۹ سے ۱۴۳ صفحات تک ملتے ہیں۔ ان کا پہلا افسانچہ یوں ہے۔ عنوان: چلہ

وہ وضو کر کے مسجد جا رہا تھا کہ
ایک شخص نے اسے سو روپے، بل کم دکھانے کے لیے
الکٹرک میٹر میں تار لگانے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دیے۔
نوٹ جیب میں رکھ کر مسجد کی طرف بڑھتے ہوئے وہ سوچنے لگا:
مجھے پھر سے وضو کرنا چاہیے؟

وضو کر کے مسجد جانا/ ایک شخص کا اسے کسی وجہ سے سو روپے دینا/ اس کا شکریہ ادا کرنا/ نوٹ جیب میں رکھنا/ مسجد کی طرف بڑھنا، یہ باتیں ''زمین سے اٹھائی گئی'' ہیں۔ یہ روزمرہ زندگی کا سچ ہے اس لیے کسی طرح یہ کہانی نہیں لیکن روپے لینے والے کا یہ سوچنا کہ کیا مجھے پھر سے وضو کرنا چاہیے؟ قاری کو کچھ سوچنے کی ترغیب دینے والا جملہ ہے جو روزمرہ کی حقیقت کو افسانہ بناتا ہے اور چونکہ یہ افسانہ صرف تین جملوں پر مشتمل ہے اس لیے یہ افسانچہ ہے۔ اس میں اپنے آپ پر اور سماج کے ''بل کم دکھانے میں مددگار افراد'' پر جو طنز ہے، اس نے تخلیق میں تیکھاپن بھر دیا ہے۔ مددگار فرد نمازی

بھی ہے، یہ بات تیکھے پن کو مزید بڑھا دیتی ہے۔ پھر نمازی کی معصوم سوچ جو افسانچے کے آخری سوالیہ جملے سے جھانک رہی ہے، قاری کی فکر کے لیے تازیانے کا کام کرنے والی ہے۔

عارف کے بہت سے افسانچے ظاہر دار، باطن دار، سچے جھوٹے ہر طرح کے مسلمان کرداروں پر لکھے گئے ہیں جن میں ان کے طنز کی کاٹ اور زہر خندگی ایک مسلمان کی عصری فکر اور زندگی کے متعدد پہلوؤں پر وار کرتی نظر آتی ہے۔ وہ شرعی فقہی اصطلاحوں کو برت کر اگرچہ اپنی بات کہتے ہیں مگر کہیں کہیں ان کی چوٹ افسانوی کردار یا خیال کی بجائے سیدھے اصطلاح کی معنویت پر بھی پڑتی ہے۔ اس طرز پر عارف کو نظر ثانی کرنا اور احتیاط برتنا چاہیے مثلاً ''خواب کا انتظار'' میں وہ کہتے ہیں:

عالم اضطراب میں کئی راتیں جاگ کر بھی جب کسی فیصلے پر پہنچ نہ پایا تو میں دعائے استخارہ پڑھ کر لیٹ گیا اور رات بھر خواب کا انتظار کرتا رہا۔

اسلام میں استخارے کی معنویت عقیدے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں لسانی متن میں (یہ افسانچہ نہیں ہے) جو بیانیہ تشکیل دیا گیا ہے، عارف کے خیال کے مطابق زمین سے ضرور اٹھایا گیا لیکن افسانچہ بنے بغیر یہ زمین ہی پر رہ گیا ہے کیونکہ جس اضطراب کے حل کے لیے استخارہ کیا گیا تھا، وہ تو خواب کے انتظار کی صورت میں ختم ہی نہیں ہوا۔

ایک چیز اور جناب کی ملاحظہ کیجیے:

مرحوم بہت نیک اور شریف آدمی تھے۔
مرحوم دل کے بہت اچھے تھے۔
مرحوم صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔
مرحوم غریبوں کی مدد کرتے تھے۔
ہاں مگر
ان کی دو بیویاں تھیں۔ (شاعر: جون ۲۰۱۲ء)

تو کیا ہوا؟ اگر مرحوم کی تین یا چار بیویاں بھی ہوتیں تو یہ چند بیانیہ خبریہ جملے افسانچہ پیدا نہیں کر سکتے تھے کیونکہ افسانویت جو کہانی کے ہر روپ کو فن بناتی ہے، یہاں یکسر مفقود ہے۔

''پاگل'' نامی عارف کا افسانچہ البتہ ایک بہترین فن پارہ ہے۔ کہتے ہیں:

نیوز دیکھتے دیکھتے میری آنکھ لگ گئی۔

______ ایک پاگل کتے نے ایک آدمی کو کاٹ لیا۔اس نے بھونکنا شروع کر دیا۔لوگ اسے پکڑ کر دواخانے لے گئے۔اس نے ڈاکٹر کو کاٹ لیا۔ڈاکٹر نے نرسوں کو اور نرسوں نے مریضوں کو۔ مریضوں نے_____ سب بھونکتے ہوئے نکلے تو محلے شہر اور ملک کے لیڈران ایک دوسرے پر بھونکنے میں مصروف ہو گئے۔ساری دنیا بھونک سے گونج اٹھی۔ صبح بیوی نے شکایت کی آپ نیند میں ایسے بڑبڑا رہے تھے جیسے کتا بھونکتا ہے۔

یہ قبیح خوابی (night mare) ہے۔جس میں ایک شخص خواب میں کچھ ہوتا ہوا دیکھتا اور آنکھ کھلنے پر اِسے موجود پاتا ہے۔خواب کا یوں حقیقت میں بدل جانا دراصل حقیقت کا افسانے میں بدل جانا ہے۔اس افسانچے میں واقعہ چونکہ خواب میں وقوع پذیر ہو رہا ہے اس لیے اس کی سرعت رفتار ایک فرد سے بڑھ کر چند لمحوں میں دنیا بھر میں پھیل گئی ہے اور یہ خواب یا افسانے ہی میں ممکن ہے۔لیکن ایک خبر سے متاثر ہو کر اسے خواب اور پھر نیند میں بڑبڑانے کی حقیقت بنا دینا، یہاں بیانیے کا حاصل ہے یعنی فن پارہ ہے اور عارف نے ایسے بہت سے افسانچے لکھے ہیں جو زمین سے اٹھ کر فن کی رفعتوں کو چھو لیتے ہیں۔معاصرین کے مقابلے میں عارف کے یہاں ایسے افسانچوں کی تعداد زیادہ ہی ملے گی کیونکہ وہ سوچ کر لکھنے والے فنکار ہیں۔

وہ نہ صرف تخلیق کے لیے سوچتے ہیں بلکہ تخلیقی عمل، بیانیے کی تشکیل، زبان کی باریکیوں اور خیال اور زبان کے تال میل پر بھی خوب سوچتے اور ضرورت ہو تو لکھتے بھی ہیں جیسا کہ افسانچے کی تنقید کے ضمن میں ان کی بعض تحریریں جو ادھر ادھر رسائل میں شائع ہوئی ہیں اور جنھوں نے قارئین کو صحیح خطوط پر سوچنے کی ترغیب بھی دی ہے۔

☆☆☆

خوش بو شاعری / دکن کی خوش بو

ڈاکٹر سلیم محی الدین

مجھ سے الفاظ روٹھ جاتے ہیں
کس روانی کا منتظر ہوں میں

عارف خورشید بیک وقت ایک افسانہ نگار، ناول نگار، تبصرہ نگار اور ایک حساس شاعر ہیں۔ شاعری میں غزل کے علاوہ انھوں نے آزاد نظم اور ثلاثیاں بھی کہیں ہیں۔ ان کی اب تک مجموئی طور پر ۱۴ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن میں تین شعری مجموعے شامل ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''ٹوٹا ہوا آئینہ'' (۱۹۸۵ء)، ''لمحوں کی صلیب'' جو تین شعرا کے کلام پر مشتمل منفرد مجموعہ تھا اور تیسرا اور اہم مجموعہ ''سوچ کے جزیرے'' (۲۰۰۹ء) میں منظر عام پر آ کر پذیرائی حاصل کر رہا ہے۔

عارف خورشید غزل کے ایک خوبصورت شاعر ہین۔ ان کی شاعری کی اس خوبصورتی میں دبستان اورنگ آباد کی شعری روایات کا بڑا حصہ ہے۔ نازک احساس اور منفرد اظہار ان کی غزل کی خصوصیت ہے۔ احساس کو مشاہدے کی طاقت عطا کرنا اور مشاہدے کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھنا عارف خورشید کا مشغلہ ہے اور یہی جب قلم اور کاغذ کے حوالے سے ظاہر ہوتا ہے تو دل ودماغ کو روشن کر دیتا ہے، ملاحظہ ہو۔

جس کی آواز کی تلاش میں ہوں
اس کا لہجہ سنائی دیتا ہے

روز و شب کا شمار کرتا ہوں
حوصلوں کا شکار کرتا ہوں

کشتیاں کاغذی سمندر میں
کتنے پیغام ایک منظر میں

شام تک گھر کا آسماں بھی ہوں
رات ہوتے ہی بے مکاں بھی ہوں

زندگی کے چھوٹے چھوٹے تجربات کو شعر کا قالب عطا کرنا اپنے آپ میں ایک کمال ہے اور عارف خورشید اس فن سے خوب واقف ہیں۔ وہ مراٹھواڑا کی غزل گو شعرا کی جدید نسل سے تعلق رکھتے ہیں ان کے کلام میں مختلف رنگ اور کیفیات پائی جاتی ہیں جو ان کے اظہار کو تنوع عطا کرتی ہیں۔ عارف خورشید جدیدیت کے عہد میں منظرعام پر آئے۔لہٰذا خیال کی ندرت بھی ساتھ لائے۔خیال کی ندرت کے ہمراہ اظہار کی انفرادیت ان کے کلام کو دوآتشہ بنادیتی ہے۔

اک یاد ہے تیزاب صفت پھول پہ دل کے
رشتہ یہ کبھی ختم وہ ہونے نہیں دیتا

نہ روشنی کا سفر ہے، نہ یوں ہوا کا سفر
تمھیں پتا نہیں ہوتا ہے کیا، دعا کا سفر

موجود ہے سب حشر کا ساماں مرے اندر
رہتا ہے کوئی مجھ سے گریزاں مرے اندر

عارف خورشید ایک فن کی آبیاری میں مصروف ہیں اور ایسے لگتا ہے کہ فن بھی ان کی ناز برداری میں محو ہے۔ان کے مجموعے کو پڑھتے ہوئے اس کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے کہ عارف خورشید کسی اِزم، کسی نظریے یا کسی تحریک سے متاثر نہیں ہیں لیکن ان کا اصل کمٹ مینٹ ان کے فن سے ہے۔ ان کا یہی کمٹ مینٹ ان کے اشعار میں موجود جدید حسیت سے ہوتا ہے۔

روشنی کی لکیر ہے شاید
یہ اندھیرا ضمیر ہے شاید

دھوپ کہتی ہے کیوں بھٹکتے ہو
چھاؤں کا ذائقہ نہیں ہوتا

ہوئی جب تیز تر آندھی تو آخر
گرے پتوں پہ تکیہ کرلیا ہے

غم اترتے ہیں جس جگہ عارف
وہ ہمارا مکان ہوتا ہے

مرہٹواڑا کی غزل کی ارضیت یہاں کے تخلیقی فنکاروں کو ایک جانب تو زمین سے جوڑے

رکھتی ہے اور دوسری جانب بلند آہنگی سے روکتی ہے۔ نتیجتاً زمینی حقیقتوں سے قریب ایک ایسے مدھم لہجے کا جنم ہوتا ہے جو شبنم کی پھواروں کی طرح دلوں کے پھولوں پر جگمگا اٹھتا ہے۔ عارف خورشید کے ہاں بھی یہ عمل اپنی دلفریبی کے ساتھ عمل پذیر ہے۔

پرورش کر رہے ہیں اشکوں سے
خواب آنکھوں میں بوگیا ہے وہ
خواب کیوں جھانکتے ہیں کھڑکی سے
نیند کیوں ڈوبتی ہے بستر میں
درمیاں راستے میں رشتے ہیں
میں خدا کی طرف رواں بھی ہوں
ایک احساس کار فرما ہے
دھوپ ہے آسماں تو ہوگا ہی

لیکن بعض زمینی حقیقتیں اس سے بھی زیادہ تلخ ہوتی ہیں۔ شاعر کا کمال یہی ہے کہ وہ تلخ حقیقتوں سے چشم پوشی نہیں کرتا بلکہ جرات اور جسارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کا اظہار اپنے اشعار میں کرتا ہے۔

سوچتا تھا کہیں نکل جاؤں
اپنے بچوں سے پیار کرتا ہوں
روشنی اختلاف کرتی ہے
ان اندھیروں میں کیا نہیں ہوتا
گونجتی ہیں ہزار آوازیں
حافظہ بے صدا نہیں ہوتا
ارادہ ہوں مجھے توڑ کبھی
اور دشمن سے ہرا دے یارب

مجموعی طور پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ عارف خورشید ندرت خیال اور ندرت اظہار کے حامل ایک حساس جدید شاعر ہیں اور مراٹھواڑہ کی غزل کی دیرینہ روایت کی ایک خوبصورت کڑی بھی۔ ☆☆

تجسس کا مسافر

سہیل اختر

'سوچ کے جزیرے' جناب عارف خورشید کا مجموعۂ کلام ہے، جو ثلاثیوں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔ یہ ان کا تیسرا مجموعہ کلام اور پندرھویں تصنیف ہے۔ عارف خورشید ایک کثیر الجہت فنکار ہیں۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ افسانہ نگار، ناول نویس، اور تبصرہ و خاکہ نگار بھی ہیں۔ ان کی سوچ کا کینوس وسیع ہے، جس کے اظہار کے لیے انھیں مختلف اصنافِ سخن کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ تخلیقیت کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر اُن کے اندر ہے، جس کے اظہار کی تڑپ انھیں مختلف اصناف کی صحرا نوردی پر اکساتی ہے، پھر بھی ترسیل کی پیاس نہیں بجھتی۔ بقول ان کے ۔

نہ جانے کتنے یگ بیتے ، ہماری پیاس باقی ہے
عجب سودا ہے ، ملنے کی ابھی تک آس باقی ہے

اس شعر میں جو 'ملنے' کی آس باقی ہے وہ اعجازِ سخن کی منزل ہے جس کی تلاش عارف خورشید کو ہے۔

چھیانوے صفحات کا زیرِ نظر مجموعہ دو نعتوں سے شروع ہو کر ایک سو نو ثلاثیوں اور اڑتالیس غزلوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ میرے ناقص خیال میں اگر یہ مجموعہ صرف ثلاثیوں کا ہوتا تو ایک نئی بات ہوتی۔ عارف خورشید اس پر قادر بھی تھے کہ وہ چاہتے تو صرف ثلاثیوں کا ہی مجموعہ شائع کرتے۔ لیکن یہ آزادی بہر حال مصنف کی ہوتی ہے کہ وہ اپنی کتاب کو کس طرح منظر عام پر لاتا ہے۔ انھوں نے ثلاثیوں سے پہلے اس کے متعلق تحریر کیا ہے کہ:

> ''تین مصرعی صنفِ سخن، جس کا ایک مصرع کم کرنے پر عدم تکمیل کا احساس ہو، جو بحرِ خفیف مسدس یعنی 'فاعلاتن مفاعلن فَعِلُن فعْلُن، یا فاعلاتن مفاعلن فَعِلان فَعْلان' میں لکھی جائے اور جس میں قافیہ کی نوعیت الف ب الف ہو۔''

مندرجہ بالا تعریف سے کسے اتفاق نہیں ہوگا، لیکن وزن کی جو قید انھوں نے لگائی ہے یہ اہل علم وفن کے نزدیک جائز ہو، لیکن میرے ناقص خیال سے اس طرح کی پابندیوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ شعراء نے مختلف اوزان میں ثلاثیاں تخلیق کی ہیں اور قلم کاروں کی یہ آزادی برقرار رہنی چاہیے۔ ویسے بھی اردو شاعری میں یاروں نے ہر صنفِ سخن میں ضرورت سے زیادہ ہی سختیاں عائد رکھی ہیں۔ اہل نظر کے نزدیک جس قدر آزادی جائز ہے انھیں تو برتنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔

عارف خورشید کی ثلاثیوں کا مطالعہ کرنے کے دوران ان کی ایک ثلاثی پر میری نظر ٹھہر گئی۔

فکر کو اپنی فاش کرتا ہوں
مل رہے ہیں جہاں زمین و فلک
میں کسی کو تلاش کرتا ہوں

'میں کسی کو تلاش کرتا ہوں' بظاہر ایک سادہ سیدھا عام سا مصرع لگتا ہے، لیکن جس قدر غور کریں اس کے اندر اتنی ہی معنی کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ یہ شاعر کے تجسس، تلاش و جستجو کا پتہ دیتی ہے۔ میرے خیال سے یہی ان کی شاعری کا بنیادی وصف بھی ہے۔ میں نے یہ نوٹ کیا ہے کہ ان کی زیادہ تر ثلاثیوں (اور شعروں میں بھی) یہی تجسس ہر جگہ موجود نظر آتا ہے۔ کہیں زیریں لہر کی صورت اور کہیں سطح پر آ کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا۔ یہ تلاش و جستجو ان کے یہاں تخلیقیت کا بنیادی محرک ہے۔ گو اِن کے اشعار اور ثلاثیاں زندگی کے مختلف پہلوں، تجربوں، کامیابیوں اور ناکامیوں کا احاطہ کرتی ہیں، لیکن کسی نہ کسی شکل میں اس تجسس کی جلوہ گری ہر جگہ نظر آتی ہے۔ تخلیقی اضطراب تو ہر فنکار کے یہاں ہوتا ہے، لیکن عارف خورشید کی خاصیت یہ ہے کہ اس سیمابی کو انھوں نے مثبت دِشا دی ہے۔ ان کے اندر کا متجسس فنکار انھیں کچھ الگ کرنے پر اکساتا ہے۔ شعر کا مرکزی فکر تو آمد کی ہی دین ہوتا ہے لیکن شعر کی آخری شکل شاعر کی تخلیقی قوت، اس کی اختراعِ طبع، اس کے ہنر اور کمال کا محتاج ہوتی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک طرح کا مرکزی خیال کئی فنکار کو آئے لیکن یہ شاعر کی انفرادی لیاقت پر منحصر کرتا ہے وہ اس خیال کو کس طرح پیش کرتا ہے اور اسے کس طرح مختلف بناتا ہے۔ ان کے یہاں مختلف کہنے کی شعوری کوشش ہر جگہ نظر آتی ہے جس نے ان کی شاعری میں تہ داری پیدا کی ہے۔ تجسس انھیں صحرائے فن کے سفر پر آمادہ کرتا ہے۔ انھیں مصروفِ ریاضت رکھتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی شکست و ریخت

کے مراحل سے بھی گزرتے ہیں اور مشاہدات و تجربات میں اپنا مخصوص تجسس کا رنگ بھر کر اشعار میں پیش کر دیتے ہیں۔ درج ذیل کی ثلاثیاں مثال کے طور پر پیش ہیں:

سطح پر جھیل کی ہے حسن محل
بھیج کوئی سکون کا پیغام
جل پری بن کے پانیوں سے نکل

ہے عجب اپنے آپ سے دوری
جستجو میں ہیں ہم ہرن کی طرح
اپنے اندر ہے اپنی کستوری

کیا بتائیں تمھیں کہ کیسے تھے
ریزہ ریزہ بکھر گئے ورنہ
ہم بھی اک دن چٹان جیسے تھے

رات کب نذرِ خواب کرتے ہیں
عمر بھر جاگ کر یہاں ہم تو
زندگی کا حساب کرتے ہیں

ٹھوکروں نے ہمیں سنبھالا ہے
کس کو خطرات سے ڈراتے ہو
ہم کو خود حادثوں نے پالا ہے

ایک اور غیر معمولی ثلاثی دیکھیں۔

اور کچھ بھی نہیں کہانی میں
میں ہوں ساحل پہ ہاتھ میں پتھر
دائرے بن رہے پانی میں

بظاہر ایک عام مشاہدے کی بات لگتی ہے لیکن جس قدر غور کیا جائے سطح آب پر بنتے دائرے کی طرح اس میں معنی کے نئے ابعاد روشن ہو جاتے ہیں، اور یہ تین مصرعے مل کر اس قدر وسیع مفاہیم

کے حامل ہو جاتے ہیں کہ ایک پوری کائنات اس میں سانس لیتی نظر آتی ہے۔انسان کی بے وقعتی سے شروع ہوتی ہوئی یہ کہانی پھیلتے پھیلتے تمام عالم پر محیط ہو جاتی ہے۔جو انسان پہلے مصرعے میں بے حیثیت نظر آرہا تھا،ثلاثی کے اختتام تک اسے شاعر اس بلند مقام پر بیٹھا دیتا ہے کہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ کائنات انسان کے ہی دم سے ہے۔عارف خورشید کے اپنے مشاہدے اور فکر کی کچھ اور ثلاثیاں ملاحظہ فرمائیں۔

آپ کو خود ڈبونے لگتا ہے
دیکھ سورج کہ شام ہوتے ہی
خون کے داغ دھونے لگتا ہے

کب وہ احساں کسی کا لیتا ہے
پیڑ جلتا ہے سوکھ جانے پر
سبز جب تک ہے چھاؤں دیتا ہے

پتے شاخوں پہ ساتھ رہتے ہیں
ہم سے پہلے نہ ٹوٹ کر گرنا
سب یہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں

آج کیا شے ہے اور کیا کل ہے
جا کے لوٹا ہے وقت آخر کب
زندگی آج ابھی اسی پل ہے

معاملۂ حسن و عشق بھی ان کے یہاں روایت اور اپنے ہم عصروں سے الگ رنگ لئے ہوئے ہے۔یہ رنگ حقیقت پسند اور تجربے کی صداقت لیے ہوئے سامنے آتا ہے۔اس میں ہجر کی تڑپ بھی ہے،حسن کا اعجاز بھی ہے اور بدن کی جمالیات بھی،لیکن سب عارف خورشید کے رنگ میں۔ ذیل کی ثلاثیاں دیکھیں۔

بیٹھے خوابوں میں کھو گیا ہوگا
میرے کمرے کا بلب روشن ہے
اور وہ شخص سوگیا ہوگا

یاد اس طرح تیری آتی ہے
اس پیالے میں ذہن کے جیسے
شہد کی بوند ٹپکی جاتی ہے

تیری خوشبو ہے میری سانسوں میں
پھر بھی یہ روح چاہتی کیا ہے
دل کی جیسی چبھن ہے آنکھوں میں

جب بھی اس سے نگاہ ملتی ہے
کھلنے لگتے ہیں بس کنول دل میں
مجھ کو پانی میں راہ ملتی ہے

واپسی ہوگی ، کچھ تو لکھ ، کب تک
تو نہیں پھر بھی میری چادر میں
ہے تیرے جسم کی مہک اب تک

جہاں تک غزلوں کا معاملہ ہے تو اس میں بھی عارف خورشید کا ہی مخصوص رنگ جھلکتا ہے۔ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ ان کی شاعری کا بنیادی وصف ان کی طبیعت کا تجسس اور ان کی سرشت میں جاگزیں تلاش و جستجو ہے۔ اس مخصوص رنگ نے ان کی شاعری میں ایک فکری نظام پیدا کر دیا ہے جو مطالعے کی گہرائی اور تجربے کی وسعت سے حاصل ہوتی ہے۔ چیزوں کو دیکھنے محسوس کرنے اور انھیں اظہار کے سانچے میں ڈھالنے کا ان کا اپنا ایک مخصوص زاویہ ہے۔ پہلے ان کے مخصوص رنگ کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اب تک تو میرا اس سے تعارف ہی نہیں ہے
مدت سے جو ہے دست وگریباں مرے اندر

تاریک پہاڑوں کا سفر کیوں ہے یہ عارف
تقدیر میں میری کیا کوئی طور نہیں ہے

جی رہا ہوں مگر ابھی عارفؔ
زندگی کا منتظر ہوں میں

ہمارے گھر میں ہی آکر تمام ہوتا ہے
اِدھر اُدھر سے اترتی ہوئی بلا کا سفر

عارف خورشید کے اشعار کا ایک اور وصف عصری صداقتوں کا بے باک اظہار ہے۔موجودہ دنیا جو ایک گلوبل ویلیج (GLOBAL VILLAGE) میں تبدیل ہو چکی ہے اس میں انسان کا وجود بے وقعت ہو چکا ہے۔صارفی معاشرے میں انسان ایک چیز (COMMODITY) بن گیا ہے۔اقدار زوال آمادہ ہیں۔رشتوں میں حد درجہ خود غرضی آچکی ہے۔موجودہ معاشرے کے یہ تمام پہلو اُن کی شاعری میں منعکس ہوتے ہیں جسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔کم وبیش ہر شاعر کے پاس اچھے اور برے اشعار ہوتے ہیں۔عارف خورشید کے یہاں بھی پست اشعار ہیں لیکن ساتھ ہی بہترین اشعار بھی بکثرت ہیں۔دوسرے لفظوں میں کہیں تو ان کے یہاں بھی PEAKS & VALLEYS ہیں لیکن ان کے یہاں جو PEAKS ہیں خاصے نمایاں ہیں۔ذیل کے منتخب شدہ اشعار پر غور کریں کہ خصوصیت کا ذکر کیا جا چکا ہے وہ کس طرح ان کے یہاں نظم ہوئے ہیں۔

ختم تم پر اب ہے داستاں جیسے
ٹوٹنے کو ہے آسماں جیسے

سوچتا تھا کہیں نکل جاؤں
اپنے بچوں سے پیار کرتا ہوں

تمھارے بعد ہے احساس کیوں یہ
کہ اپنا شہر جیسے مرگیا ہے

دھوپ نے مجھ کو بجھا ڈالا تھا
شام ہوتے ہی جلا دے یارب!

آج سرگوشیوں میں جینے پر
یاد آتا ہے میں بیاں بھی ہوں

صدائیں دے کے میں مایوس لوٹ جاؤں تو
وہ اپنے بند دریچوں کو پھر سے کھولے گا

عارف خورشید کا یہ مجموعہ کلام مجھے طباعتی لحاظ سے بھی بے حد پرکشش لگا۔ امید ہے یہ ان کے شاعرانہ مقام کو مزید مستحکم کرنے میں معاون ہوگا۔ میری تمام نیک خواہشات ان کے ساتھ ہیں۔

☆☆☆

انفرادیت کی چھاپ

سیفی سرونجی

علمی ادبی تاریخی سرزمین اورنگ آباد میں یوں تو بے شمار شاعروں ادیبوں نے اپنے علمی، ادبی کارناموں سے اس شہر کا نام روشن کیا ہے، لیکن نئی نسل کے شاعروں، ادیبوں میں جس نے اپنی نمایاں پہچان قائم کی ہے ان میں عارف خورشید کا نام بہت اہم ہے۔ وہ اس لیے کہ عارف خورشید صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک اچھے افسانہ نگار، خاکہ نگار بھی ہیں ادب کی مختلف اصناف میں ان کی کئی کتابیں درجنوں مضامین، خاکے شائع ہو چکے ہیں۔ جن کی تفصیل کے لیے تو کئی صفحات درکار ہیں۔ چند صفحات کے مضمون میں یہ گنجائش نہیں ہے کیوں کہ کسی صنف پر ہی لکھنا اور اس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ہی ان کی بہت سی کتابیں موجود ہیں لیکن میں یہاں صرف ان کے افسانچوں پر ہی گفتگو کرنا چاہوں گا۔ افسانچوں پر ویسے بھی آجکل بہت کچھ لکھا جارہا ہے۔ اتفاق سے افسانچوں پر سب سے زیادہ کام کرنے والے عظیم راہی بھی اورنگ آباد کے ہیں۔ عارف خورشید نے بھی بڑی تعداد میں افسانچے لکھے ہیں۔ یہی نہیں عارف خورشید نے شعری اور نثری اصناف میں نئے نئے تجربات بھی کیے ہیں۔ ناول، افسانے، خاکے، ثلاثیاں کیا کچھ نہیں لکھا اور تعریف کی بات یہ ہے کہ جو کچھ لکھا اپنے اسٹائل میں لکھا ورنہ لوگ لکھتے تو بہت کچھ ہیں لیکن اپنی شعری اور نثری تحریروں میں انفرادیت پیدا کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ عارف خورشید نے اپنی شعری اور نثری تحریروں میں انفرادیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور کامیابی سے کی ہے کہ ان کے افسانے ہوں یا شاعری خاص طور پر ان کی خاکہ نگاری میں جو بات ہے وہ بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ اول تو خاکہ نگاری مشکل صنف ہے، اردو ادب میں ویسے بھی خاکہ نگار صرف چند گنے چنے دکھائی دیتے ہیں۔ عارف خورشید نے جو کچھ لکھا اس میں اپنی انفرادیت کی چھاپ چھوڑی ہے اور سچائی کے اظہار کو اپنا وسیلہ بنایا ہے۔ سچائی یوں تو بہت کڑوی ہوتی ہے لیکن سچ کو اگر پیش کرنے کا طریقہ منفرد اور اچھا ہو تو وہی بڑا بن جاتا ہے اور اس کا اثر گہرا ہوتا ہے۔ عارف خورشید

لکھتے ہیں:

''گزشتہ چند برسوں میں قلم کی آنکھ میں جو آنسو آئے وہ قرطاس کی مژگاں پر کب تک رکے رہتے، ضبط کا دامن چھوٹا تو صحیفے کی صورت گری ہوئی اور وقت کے چاک پر گردش کرتے لمحے قید ہو گئے۔ میری کاوش کو سکہ بند نقاد یا منصوبہ بند ناقص کے نظریہ سے دیکھنے کے بجائے اپنی نظر سے دیکھیے اور فیصلہ کیجیے۔''

عارف خورشید نے ان چند سطروں میں سب کچھ کہہ دیا اور اس تحریر سے ادب سے متعلق ان کا نظریہ بھی واضح ہو گیا۔ اس تحریر کی روشنی میں ان کی تمام تحریروں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ عارف خورشید نے اپنی کسی بھی تحریر میں کسی نظریے کو سامنے نہیں رکھا بلکہ تنقید و تحقیق ان کی نظر میں کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ یہی اعتماد انھیں ان کے دیگر ہم عصروں میں انفرادیت کا حامل بناتا ہے۔ عارف خورشید کے جتنے بھی افسانچے میں نے پڑھے ہیں، ان میں یہی خصوصیات جا بجا دکھائی دیتی ہے کہ انھوں نے بہت ہی فن کارانہ انداز میں اپنے ہر افسانچے میں تلخ سچائی کا اظہار کیا ہے۔ 'ضروری سامان'، 'فارمولا'، 'ٹینشن'، 'تالا'، 'فطرت'، 'مالک'، 'جسم و جاں'، 'پاگل'، 'شاعر تمام'، 'چھپانے کی چیز'، 'مبارک' جیسے کئی افسانچے ہمیں تھوڑی دیر کے لیے ایک گہری سوچ میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ افسانچے لکھنا اور وہ بھی اچھے، جن میں ایک تخلیق کار کی پوری شخصیت اس کی ذہنیت اجاگر ہو جائے، مشکل فن ہے۔ جو بات ایک طویل کہانی یا ناول میں ہوتی ہے اسے مختصر سے مختصر کر کے افسانچے کا روپ دیا جاتا ہے۔ یہ فن کوئی آسان نہیں ہوتا کہ ذرا سی کمی سے افسانچہ لطیفہ یا ایک خبر بن کے رہ جاتا ہے، لیکن عارف خورشید نے اپنے چند افسانچوں میں واقعی اپنے تخلیقی جوہر دکھائے ہیں، مثلاً 'ٹینشن' ایک ایسا افسانچہ ہے جس میں ایک گہری معنویت ہے کہ آج کا انسان کسی بھی حالت میں ٹینشن سے مفر حاصل نہیں کر سکتا۔ تنہائی کا کرب چھپانا پڑے گا، یعنی اگر آپ کے یہاں بیٹی ہو گی تو داماد ہو گا دوسرے مسائل ہوں گے۔ بیٹا ہو یا بیٹی ہو، تنہائی ہو گویا زندگی میں ٹینشن سے چھٹکارے کا کوئی حل نہیں ہے۔ اس مختصر کہانی میں عرب کی ہی نہیں پورے انسانی سماج کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہاں بجائے اس کے کہ میں ان کے افسانچوں پر کچھ اظہار کروں یہاں چند افسانچے پیش کرتا ہوں:

مالک:

سیٹھ نماز پڑھ رہے ہیں اور نوکر پنکھا جھل رہا ہے

سیٹھ بہت خشوع خضوع سے نماز پڑھنے لگے کہ نوکر دیکھ رہا ہے۔

فطرت:

بچہ منہ میں نہیں ڈالے گا آپ بے فکر رہیں

ہر بچہ کوئی بھی چیز ہاتھ میں آتے ہی پہلے منہ میں ڈالتا ہے

ڈاکٹر صاحب میرا بچہ پہلے سونگھتا ہے

بچوں کے ڈاکٹر نے کچھ توقف کے بعد پوچھا

آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں

وہ دبئی میں ہیں

تو آپ نے کتا پال رکھا ہے۔

نمازی:

بروز جمعہ میں اپنی بیٹی کو لینے College for women قریب ایک بجے پہنچا تو کالج کا مین گیٹ بند تھا میں نے چوکیدار سے دریافت کیا تو اس نے کہا کالج کیمپس میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے اور شہر کے سارے نوجوان جمعہ پڑھنے یہیں آجاتے ہیں۔

عارف خورشید کی یہ چند کہانیاں پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی سوچ اور فکر میں کتنی گہرائی ہے۔ سماج پر بھرپور طنز کرتے ہوئے باتوں باتوں میں ایک تلخ سچائی کا اظہار کس فنکارانہ انداز میں کرتے ہیں۔ 'مالک' میں عارف خورشید نے ایک سیٹھ کی نماز کا اور اس کے دکھاوے کی نماز پر کیا خوب طنزیہ جملہ لکھا ہے نوکر دیکھ رہا ہے۔ وہ جس کے لیے نماز پڑھ رہا ہے اس کا خوف نہیں بلکہ اس نے نوکر کو دیکھ کر نماز میں اور بھی خشوع وخضوع کا اہتمام کیا۔ اس طرح ''فطرت'' میں بتایا ہے کہ شوہر دبئی میں ہے تو پھر بچہ اپنی فطرت کے خلاف بجائے کسی چیز پر ہاتھ مار کر کھانے کے سونگھتا کیوں ہے، یقیناً کتے کی صحبت کا اثر ہے۔ اس کہانی میں بہت کچھ چھپا ہے اور شوہر کی بہت زیادہ دوری کے کیا نتائج

ہوتے ہیں، واضح کر دیا گیا ہے۔ 'نمازی' میں کالج کے کیمپس میں جمعہ کی نماز میں نوجوانوں کی بھیڑ، اس میں نوجوانوں کی فطرت کو واضح کیا گیا ہے۔ غرض یہ کہ عارف خورشید کے تمام افسانچوں میں کوئی نہ کوئی اہم پہلو ضرور ایسا ہوتا ہے جو قاری کے ذہن کو چونکانے کے ساتھ ساتھ اسے جھنجوڑ دیتا ہے۔ عارف خورشید نے اپنے افسانچوں میں زندگی سے جڑے تمام تجربات و مشاہدات کو سلیقے سے پیش کیا ہے۔ افسانچے لکھنا گویا سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا فن ہوتا ہے۔ جو بات ایک طویل کہانی یا ناول میں بیان کی جاتی ہے عارف خورشید نے اسے کم سے کم الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ یہی افسانچے کی خصوصیات ہیں۔ عارف خورشید بحیثیت شاعر، خاکہ نگار تو شہرت رکھتے ہی ہیں، لیکن افسانچہ نگاری کے فن میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ آج کے انسان کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ طویل کہانیاں یا ناول پڑھ سکے اس لیے افسانچہ نگاری کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور انھیں قاری آسانی سے پڑھ بھی لیتا ہے۔ جوگندر پال سے لے کر عظیم راہی اور عارف خورشید تک بے شمار افسانچے لکھے گئے اور لکھے جا رہے ہیں۔ افسانچوں کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ یقیناً افسانچے کے فن کو بلندی تک پہنچانے میں عظیم راہی، خان حفیظ اور عارف خورشید جیسے افسانچہ نگاروں کی بڑی قربانیاں ہیں۔ جب بھی افسانچہ نگاری پر لکھا جائے گا عظیم راہی کے ساتھ ساتھ عارف خورشید کا نام بھی لیا جائے گا، جبکہ عارف خورشید نے اردو ادب کی دیگر اصناف میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ 'ٹوٹا ہوا آئینہ'، 'سنہری رت کا فریب'، 'یادوں کا سائباں'، 'دھول کی شال'، 'آتشیں لمحوں میں'، 'لہولہو آرزو'، 'احساس کا زخمی مجسمہ'، 'اور کچھ بھی نہیں کہانی میں'، 'قافلے والوں سچ کہنا' کے علاوہ کئی شعری مجموعوں اور خاکوں کی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ بلاشبہ عارف خورشید نئی نسل کے نمائندہ خاکہ نگار اور افسانچہ نگار کی حیثیت سے ایک مقبول ترین نام بن گیا ہے۔ ابھی ان کا قلم رواں دواں ہے آگے آگے دیکھتے ہیں ہوتا ہے کیا۔

☆☆☆

عارف خورشید کی فنی نامانوس کاری

ڈاکٹر عتیق اللہ

کسی ایسے فن کار کے فکر و فن پر کوئی رائے قائم کرنا مشکل کام ہے جو اظہار کے ایک سے زیادہ سانچوں سے سروکار رکھتا ہے۔ ہر صنف کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور یہ تقاضے کبھی کبھی جبر کی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان تقاضوں اور ان اِجبار کو جب ایک ناقابل عبور حد کے طور پر اپنے اوپر مسلط کر لیا جاتا ہے تو تخلیقی وفود پر قدغن سی لگ جاتی ہے۔ اصل فن کار وہی ہے جو ان تقاضوں اور ان اِجبار کا لحاظ رکھتے ہوئے تخلیقی رو کے بے محابا پن اور اس کے وفور سے نمو پانے والے امکانات اور ان امکانات کی حیرت خیزیوں پر نظر رکھتا ہے۔ درحقیقت تخلیقی آزادروی ہی میں ہزاروں ہزار امکانات کا ایک جہان ناپیدا کنار بھی پوشیدہ ہوتا ہے۔ فن بلکہ تخلیقی فن کے اس سرِّ نہانی کی فہم ہر فن کار کا مقدر بھی نہیں ہے۔

عارف خورشید ایک ایسے ہی تخلیقی فن کار ہیں جو بیک وقت اظہار کے کئی سانچوں پر قادر ہیں۔ وہ شعر کہیں، افسانچے کہیں، شخصیت نگاری کریں یا افسانے کی صفت کو آزمائیں ان کے کردار کے تشخص میں تخلیقیت Creativity کی خاص اہمیت ہے۔ عارف خورشید اپنی تخلیقی آزادروی پر حد کہیں اور کبھی نہیں باندھتے، اسی لیے ہر ہیئت اور ہر تکنیک میں ایسا کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے جسے نیا اور تازہ سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ نیز زبان کو غیر رسمی طور پر برتنے کا وہ اسلوب بھی خاص اہمیت رکھتا ہے، جس کے تحت معنی اور کشف کے مابین افتراق کی حدیں محو ہو جاتی ہیں۔ بہ ظاہر متن کچھ ہوتا ہے اور تحت المتن کچھ اور۔ عارف خورشید کے افسانوی فن کے ساتھ کی اصل کلید بھی اس کے تحت المتن ہی میں پنہاں ہے۔ ان قاریوں کو بڑی حد تک محرومی سے سابقہ پڑتا ہے جو محض برونِ متن پر اکتفا کو ترجیح کا درجہ دیتے ہیں۔

عارف خورشید اس معنی میں اپنے قاری سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ ان کی تحریر کو اس کی مجموعیت میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ کیوں کہ اس کے معمورے میں جو ایک جہان دیگر پورے

ایک تناظر کی طرح کام کر رہا ہے اس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ بعض قاری عجلت کے عادی ہوتے ہیں اور ان سکوتیوں Silences سے سرسری گزر جاتے ہیں جن میں کچھ زیادہ ہی شور یہ نشست ہوتا ہے۔ بعض تخلیقات ہی ایسی ہوتی ہیں جو رکنے، ٹھہرنے اور سوچنے کا موقع فراہم نہیں کرتیں وہ فوراً ہر این و آں کو کھول کر رکھ دیتی ہیں قاری اپنی توقع کے مطابق اس میں سب کچھ پالیتا ہے۔ بعد کے لیے اس میں کچھ بچتا ہی نہیں۔ عارف خورشید کے فن کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ وہ اکثر ہماری توقع کو رد کرتے ہیں۔ ان کی تحریر ہاں میں ہاں کم ملاتی ہے، انکار سے زیادہ خوش آتا ہے۔ عارف خورشید اپنے قاری کو ان کا وہ تخلیقی حظ اور انبساط مہیا کرنے کے درپے زیادہ نظر آتے ہیں جسے محض فن کار کا مقدر خیال کیا جاتا ہے۔

رولاں بارتھ کے نزدیک متن دو طرح کے ہوتے ہیں۔ قاریانہ یعنی Readerly اور دوسرا مصنفانہ Writerly۔ اول الذکر سے اس کی مراد وہ متن ہے جو قاری کو خود تجزیہ کرنے اور نتائج اخذ کرنے کی طرف مائل کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوتا ہے۔ اس مین وہ تعطلات اور توقفات مفقود ہوتے ہیں جنھیں پر کرنے میں قاری کو کم و بیش اسی تلذذ اور انحظاظ Pleasure کا تجربہ میسر آسکتا تھا جن سے خود تخلیق کار گزرا ہے۔ اس کے برخلاف ثانی الذکر متن جسے بارتھ مصنفانہ کہتا ہے۔ قاری کے لیے ایک آزمائش سے کم نہیں ہوتا۔ کیوں کہ بظاہر متن کچھ اور شائبہ فراہم کرتا ہے اور بہ باطن کچھ اور۔ قاری کو اس تحت المتن کو اجاگر کرنے میں لطف بے پایاں میسر آتا ہے جو بڑا گرہ دار اور معنی گیر ہوتا ہے۔ عارف خورشید کی کہانی بھی اصلاً اپنے باطن یا تحت المتن میں کہیں دبی چھپی ہوتی ہے۔ عارف پوری آواز میں بات کرنے سے ہمیشہ دامن بچاتے رہے ہیں۔ کیوں کہ آواز میں شور بہت ہوتا ہے۔ عارف کی زیرلبی یا کم گوئی کے اندر جو شور ہے اس کی معنی خیزی الگ نوعیت کی ہے۔

اس قسم کا شور ان افسانوی حصوں میں زیادہ متوجہ کرتا ہے جن میں داخلی کلامی سے کام لیا گیا ہے۔ عارف اپنے کردار کے حوالے سے باطن کا محشرستان اجاگر کردیتے ہیں۔ بار بار سوال قائم کرتے ہیں۔ بار بار گرہیں الجھتی ہیں۔ بار بار وہ انھیں سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بالآخر وہ سارے جواب اپنے قاری پر چھوڑ دیتے ہیں۔ عارف کے کردار خود اپنا آپ بھی نہیں جانتے۔ ان کی لغت میں گناہ، ثواب، عورت اور مرد کے جنسی رشتے اور جسم کے تقاضے، کے معنی ہی کچھ اور ہیں۔ انسان بظاہر جتنا نظر آتا ہے بہ باطن اس سے کہیں زیادہ روپوش ہے۔ وہ اپنے بارے میں جس قدر فہم کا دعویدار ہے اس سے

کہیں زیادہ وہ عدیم الفہم ہے۔ زندگی کے یہی وہ راز ہیں جو کبھی پوری طرح عیاں نہیں ہوئے۔ نہ خود پر اور نہ دوسروں پر۔ عارف نے بھی تمام توضیحات کے باوجود بہت کچھ صیغۂ راز میں رکھا ہے۔ صیغۂ راز میں رکھا ہے اسی لیے قاری بھی ان رازوں کو کھوجنے میں تخلیقی حظ کے تجربے سے دوچار ہوتا ہے۔ قرات کے تجربے میں اس قسم کے تجربے کی اپنی قیمت ہے۔

> ''خوبصورت مناظر تو دوڑتے ہیں۔ میں اپنی نگاہوں میں دوڑتے مناظر قید کر پاؤں گا؟ جب کہ میں برسوں سے ان ہی مناظر کو قید کرنے کے لیے سفر کر رہا ہوں۔ مگر وہ منظر جسے میں ہمیشہ کے لیے نگاہوں میں قید کرنا چاہتا ہوں کہاں ہیں...... سفر چلتا رہتا ہے...... بے انت...... میں نے یہ کیسے فیصلہ کرلیا کہ میرا سفر بے انت ہی ہے۔ اس کا انت تو ہونا چاہیے...... آشاؤں اور نراشاؤں کا انت تو ہوسکتا ہے...... سفر کا انت بھی ہوسکتا ہے۔ زندگی کا انت بھی ہوسکتا ہے۔ مرنے کے لیے یہ مان لینا ضروری ہے کہ وہ مر جائے گا۔ تب تک وہ زندہ رہتا ہے، میں مانتا ہی نہیں کہ میں مر جاؤں گا۔ کیوں کہ میں منتقل نہیں کیا جاسکتا۔''

عارف خورشید کی یہ داخلی کلامیاں مسلسل سوچ کے کئی جزیرے خلق کرتی چلی جاتی ہیں۔ ہم نفی و اثبات کے کئی مراحل سے گزرتے ہیں۔ شکوک وشبہات کے کئی ثانیے درمیان میں آتے ہیں۔ ہم جسے بدخیال کرتے ہیں عارف خورشید کی میزان قدر میں وہ اتنا بد بھی نہیں ہوتا۔ عورت ہو یا مرد سارے افراد اپنی فطرت میں معصوم ہی ہیں۔ عارف خورشید، اصلاً انسانی روح کے سیاح ہیں۔ وہ اس باطن کی پہنائیوں میں اترنے کے درپے رہتے ہیں جو ہمیشہ غیاب میں رہتا ہے۔ کئی اخلاقی، تہذیبی اور مذہبی اقدار کے پردوں میں دبا سمٹا باطن۔ وہ جو بظاہر دکھائی دیتا ہے وہ صرف سچ کا ایک ایسا چہرہ ہے جو سچ کم جھوٹ زیادہ ہے۔ حقیقی انسان تو اصلاً اندر کا انسان ہی ہوتا ہے۔ جسے ہم بعض مجبوریوں کی بنا پر ہمیشہ چھپائے رہتے ہیں۔ عارف خورشید اس انسان کو بار بار باہر نکالنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ انسانوں کی اصل کہانی تو اندر کی واردات کا نام ہے۔

> ''اکثر میری ضرورتیں، ضرورتوں کی بنجر زمین پر بہہ نکلتیں، کئی باریوں بھی

ہوا کہ ہوس کے سپاہی دوسری حکومت کی سرحدوں میں دور تک چلے گئے۔
مگر ہر طرف خاموشی ہی خاموشی۔ وہی جسم، وہی نشیب وفراز، وہی نغمہ آبشار
مگر سکوت شام کا منظر ٹھہرا ٹھہرا سا، ناز وادا کا نہ کوئی حجرہ، نہ آسیب زدہ
مکان کا بھیانک کمرہ، خالی خالی کمرے میں کوئی کب تک ٹھہرے۔ خود
سے نکل کر منظروں کے گھاؤ سہتا۔ دوسرے مکانوں کی تلاش میں نکل پڑا
اور مایوس لوٹ آیا۔ اب جسم اگر جسم چاہے گا تو وہی جسم یا پھر یہ سرد جسم
جہاں جسم کا نام ونشان بھی نہیں۔"

عارف خورشید کا افسانوی اسلوب شعریت سے مالامال ضرور ہے لیکن شعریت یا شعری لسانی گچھے Linguistic Clusters افسانوی رو پر قدغن نہیں لگاتے بلکہ افسانے کو کچھ زیادہ ہی قرات نواز بنا دیتے ہیں۔ عارف فرد فرد لفظ کے بجائے لفظوں کو گچھوں کے طور پر استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ اس قسم کے لسانی سانچے سب سے پہلے فیض نے اپنی شاعری میں برتے تھے۔ عارف خورشید کی افسانوی نثر میں یہ لسانی زمرے شعر جیسی وضاحتیں کر دیتے ہیں۔ پھر شعر اور نثر کے مابین افتراق کی ہر لکیر محو ہو جاتی ہے۔ ذرا ان لسانی زمروں HAPALLAGES اور نت نئی مشابہتوں کی کچھ مثالیں دیکھیے۔

"ناوابستہ سکون، وابستہ سراغ، بے حسی کا کشکول، ہوس کی زمین، رینگتی
خواہش، جذبات کے جھلستے صحرا، حواس کی زمین، شائستہ درندے،
ضرورتوں کی بنجر زمین، ہوس کے سپاہی، کڑوا اندھیرا، سکون کی زنجیر،
احتیاط کی دبیز تہہ، حواس خمسہ کے دروازے، چاہت کے قلعے، منہ زور
سمندر، تھکن کے نشیب وفراز، بڑھتی عمر کا رکتا چلتا اندھیارا، انتظار کی ندی
، سراب آسا وادی۔"

عارف خورشید کا ذہن بھی فلسفیانہ ہے۔ ان کے اکثر جملوں میں گہری معنی خیزی انھیں اقوال میں بدل دیتی ہے۔ زندگی کے گہرے اور گھنے، کڑوے اور میٹھے تجربات کی کوکھ ہی سے ان کے کلمے پھوٹتے ہیں۔ اس قسم کے فکر پارے، عارف خورشید کے افسانوی اسلوب میں جہاں تہاں نمو پاتے

ہیں ان کے اسلوب کی انفرادیت کو جلا بخشنے میں اس کی بھی خاص اہمیت ہے۔ درج ذیل جملوں اور عبارتوں میں تفکر اور شعریت نے ایک واحدے کی شکل اختیار کر لی ہے۔

''زندگی، زاہد کا زہد ہے۔ عارف کا عرفان، عابد کی عبادت اور گناہ گار کی جنت ہے۔''

''زخموں کا زندہ رہنا ہی کامیابی کی نشانی ہے۔''

''زندگی بہر حال ایک قوت کا عکس نامکمل ہے۔''

''ازل سے ابد تک کا سفر عشق کے دریا کا سفر ہے۔''

''دنیا نے کتنے دیوں کو بجھا کر روشنی کی، اور روشنی کو اخلاقی قدروں کا نام دیا۔''

''غلط راستے تھکن کے احساس کو بڑھا دیتے ہیں۔''

'' کامیابی وقتی ہی سہی، لمحاتی ہی سہی مگر صدیوں کی خوشیوں سے ہم کنار کر دیتی ہے۔ جس طرح پہلی مرتبہ عورت سے لطف اندوز ہونے والا، عورت کو صرف لذت کا سرچشمہ سمجھ لیتا ہے، جس طرح بے وقوف کبھی کبھی عقل مندی کی بات کر کے عقلمندوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ جس طرح الیکشن میں بوگس ووٹنگ سے جیت کر کوئی بڑا لیڈر بن جاتا ہے۔ جس طرح مسلسل پریشانی کے بعد تھوڑی سی خوشی مل جاتی ہے۔ جس طرح نادان کی دوستی کبھی کبھی فائدہ پہنچا دیتی ہے۔''

اس طرح گونا گوں مشابہتوں سے معمور عبارتیں عارف خورشید کے افسانوی اسلوب کی انفرادیت کو چمکانے میں خاص کردار ادا کرتی ہیں۔ عارف خورشید کا افسانوی قماش اپنی مجموعیت میں بے حد مشکل اور بے حد نامانوس بھی ہے۔ نامانوس ہے اسی لیے اس میں تازہ کاری بھی ہے۔ مانوس کو نامانوس بنا کر پیش کرنا ہی اصلاً فن کہلاتا ہے۔ اور عارف خورشید کو یہ فن خوب آتا ہے۔

☆☆☆

کیا ہے ہم نے صحت مند یہ ادب تخلیق

ڈاکٹر غضنفر اقبال سہروردی

کبھی جو فن کی ہمارے کہیں نمائش ہو
ادب کے چاہنے والوں میں گر کسی کو یہاں
ہمارے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش ہو
تو ایک بات ہماری طرف سے کہہ دینا
دیارِ فن کی لہو تھوکتی فضاؤں میں
کراہتی ہوئی فالج زدہ ہواؤں میں
کیا ہے ہم نے صحت مند یہ ادب تخلیق

حضرت قمر اقبال کی یہ نظم بلاشبہ صحت منداور عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ ادب کو دینے والے فنکاروں کے لیے خراج تحسین بھی ہے اور خراج عقیدت بھی۔ اردو شعر و ادب کی ایک ایسی ہی منفرد شخصیت عارف خورشید کی ہے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی میں صحت مند ادب ہی تخلیق و تحریر کیا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں عارفِ ادب ہیں اور اپنے لکھے سے ادب کو خورشید کی طرح منور کیا ہے۔

کیا ہے ہم نے صحت مند یہ ادب تخلیق

عارف خورشید ایک کھلے ذہن کے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں سماجی سچ غالب ہے۔ سماج میں ہونے والی چھوٹی چھوٹی برائیاں ان کے افسانے میں نظر آتی ہیں۔ وہ سماج میں ہونے والے جرائم کا آنکھوں دیکھا حال پیش کرتے ہیں۔ ان کا افسانہ ''پہچان'' انسانی فکر و نظر کی کئی راہیں وا کردیتا ہے۔ اس افسانے میں انسان کی سرشت و فطرت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس افسانے کا اسلوب بھی بڑا تخلیقی اور معانی سے معمور ہے۔ ''پہچان'' میں افسانہ نگار نے ازل سے ابد تک کی زندگی پیش کردی ہے۔

کیا ہے ہم نے صحت مند یہ ادب تخلیق

افسانہ ''ریگستان میں بارش'' میں خود کلامی (Monologue) کی تکنیک پائی جاتی ہے۔ اس افسانے میں خیالات کا ایک سلسلہ ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹ جاتا ہے۔ جب سگریٹ ختم ہو جاتی ہے۔ اس افسانے کے ہیرو کے سر پر لڑکی سوار ہے۔ وہ اس سے دوبارہ ملنے اور پھر شادی کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہے۔ ہیرو کی اسی نفسیاتی اور ذہنی کشمکشوں کے درمیان افسانہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہی ادھورا پن اس افسانے کی ایک بڑی خوبی ہے۔ کیا ہے ہم نے صحت مند یہ ادب تخلیق۔

''السا س'' (Alsatia) عارف خورشید کا وہ افسانہ ہے۔ جس میں انھوں نے مذہبی مقامات میں ہونے والی جنسی بے راہ روی پر کاری ضرب لگائی ہے۔ اس افسانے میں پجاری ہیروئین کا جنسی استحصال کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہیروئین کے مسائل الگ ہوتے ہیں۔ پجاری سے پیدا ہونے والے بچے کو لے کر ہیروئین مندر جاتی ہے۔ اس وقت کی یہ عبارت ملاحظہ کیجیے جس میں افسانہ نگار نے گہری معنویت پیدا کر دی ہے۔ یہ افسانے کا اختتام بھی ہے:

> ''آخری سیڑھی پر جب وہ پہنچی تو دنیا سے لاتعلق گیان دھیان میں مصروف پجاری پر نظر پڑی۔ پوجا کے لیے آگے بڑھتے ہی نگاہوں کے تصادم سے چنگاریاں پھوٹ پڑیں جیسے بجلی کے منفی مثبت تار مل گئے ہوں۔ پلٹ کر اس نے بھگوان داس کی طرف دیکھا، جیسے آتش بازی میں انار چھوٹ رہے ہوں۔ پوجا کے دوران کبھی اس کو پجاری جوان نظر آتا اور کبھی اپنا بیٹا بوڑھا''

عارف خورشید کے افسانوں میں اسلامی فکر کے ساتھ ساتھ متصوفانہ لہریں موجزن ہیں۔ ان کے افسانے ''پہچان''، ''سیپ سے موتی''، ''داستان مرکب ہے'' اور ''قافلے والو سچ کہنا'' میں تصوف کے عناصر نمایاں ہیں۔ ''قافلے والو سچ کہنا'' عارف خورشید کا افسانہ آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔ افسانے کی شروعات ہی اس کی اٹھان ہے۔ ایک قافلہ اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ سالار کارواں گھوڑے پر سوار ہے ایک خستہ حال شخص آ کر اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لیتا ہے اور لگام چھوڑنے کے لیے راضی نہیں ہوتا۔ سالار پوچھتا ہے تو گویا ہے کہ ''مجھے بھی وہاں جانا ہے۔ مجھے بھی وہاں...... مجھے بھی''۔ وہ خستہ حال شخص غائب ہو جاتا ہے۔ سالار کو اپنا ماضی یاد آتا ہے کہ ایک فقیر کی

بددعا کا انجام اس کا باپ بھگت چکا ہے کہ اس کے بچپن میں ایک سائل اس کے دروازے پر آیا تھا تو اس کے باپ نے اس سائل کو جھڑک دیا تھا، جس کے نتیجے میں سائل جلال میں آگیا۔ اس نے اپنی شہادت کی انگلی سورج کی طرف کی اور اس گھر کی طرف اشارہ کرتے ہی آگ لگ گئی۔ گھر جل کر خاکستر ہو گیا۔ سونے کے زیورات بھی ختم ہو گئے۔ سالار کا باپ پاگل ہو گیا۔ سالار اپنے اور اپنوں پر گزرے ہوئے سانحے کو یاد کرتا ہوا ایک انجانی سی دنیا میں گم ہو جاتا ہے۔ اس کا گم ہونا تمام قافلے کے افراد کے لیے باعث تشویش ہوتا ہے لیکن اس حالت میں بھی سالار اپنے ہوش کھوتا نہیں بلکہ قافلے کے افراد کے سوالات کے جواب برابر دیتا رہتا ہے۔ قافلہ اپنی منزل کی جانب گامزن ہے۔ خستہ حال شخص سے پھر سالار کی ملاقات ہوتی ہے وہ اس کو دیکھ کر بے حد حیران ہو جاتا ہے۔ پانی کی شدت سے مسافروں کو پیاس لگتی ہے۔ سالار بڑبڑانا شروع کرتا ہے:

> ''سیاہ وسفید کا امتزاج / اپنا اپنا مزاج / اپنی اپنی اوقات ہے / ایڑیاں رگڑ کر نکل سکتا ہے / زمین کا سینہ چیر کر / اب کہاں وہ آب ہے / کیا آج بچوں کی نہیں / معصوم ایڑیاں / یا پھر ان کے آباواجداد کا گناہ / جو بولتا رہا سر چڑھ کر زندگی بھر / اتر آیا ہے معصوم بچوں کی ایڑیوں پر''

عارف خورشید کا یہی انداز ہے جو یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے۔

رکیا ہے ہم نے صحت مند یہ ادب تخلیق

عارف خورشید کی محولہ بالا نظم کے اقتباس میں افسانہ نگار نے سالار اور اس کے ساتھ گزری واردات کا تذکرہ فلسفیانہ انداز سے کر دیا ہے۔ سالار کا مذکورہ کلام سن کر سب افرادِ قافلہ اپنی اپنی پیاس بھول جاتے ہیں۔ حضرت حسینؓ کی پیاس یہاں گونج بن جاتی ہے۔ ہر سمت سے ایک ہی ندا آتی ہے کہ ''یاد کرو پیاس حسین کی'' تمام افراد آسمان کی طرف دیکھتے ہیں بارش ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ عجیب منظر ہوتا ہے پانی موسلادھار برس رہا ہے لیکن ایک بھی قطرہ زمین پر نہیں گر رہا ہے۔ مسافروں نے سالار سے کہا ''ہم پیاسے ہیں'' اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور پانی زمین پر گرنے لگا۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور وہیں پر وہ اپنے حقیقی خدا سے جا ملتا ہے۔ اس کی نماز جنازہ پڑھائی گئی اور دفن کیا گیا۔ دوسرا سالار چنا گیا پھر قافلہ شور مچاتا وجد و سرور میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوتا ہے۔

افسانہ ''قافلے والو سچ کہنا'' میں قافلہ کا سالار دراصل خوفِ الٰہی سے رحلت کر جاتا ہے۔ اس کی سائیکی میں ایک خوف جاگزیں ہوتا ہے۔ اور اس کی صورت حال بالکل مجذوب یا صوفی کی ہو جاتی ہے۔ وہ اللہ سے لو لگا لیتا ہے اور آخرت کے خوف اور خوف الٰہی سے فوت ہو جاتا ہے۔

نور الحسنین نے اس افسانے پر دو جملے اس طرح سے رقم کیے ہیں:

> ''عارف خورشید کا افسانہ ''قافلے والو سچ کہنا'' زندگی کے کارواں کو کبھی نہ رکنے کا پیغام دیتا ہے۔ اس افسانے کے کرداروں میں سردار اور خود مجذوب کا کردار بہت ہی پاورفل ہے۔''

افسانہ ''قافلے والو سچ کہنا'' معرفت نفس، خود شناسی اور تازگیِ دل کا افسانہ ہے۔ مذکورہ الفاظ تصوف کی منزلیں ہی تو ہیں۔

رکیا ہے ہم نے صحت مند یہ ادب تخلیق

عارف خورشید کے دیگر افسانوں میں ''قضائے عمری''، ''طواف حرم''، ''کھویا ہوا منظر'' عمدہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں عورت مختلف روپ میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ وہ حالؔی کے مصرعے ''اے ماؤ بہنو بیٹیو! دنیا کی عزت تم سے ہے'' پر کاربند نظر آتے ہیں۔ ہر افسانے میں عورت کو انھوں نے کبھی مظلوم، بے بس اور کم زور اور کبھی اپنے ہی جذبوں کی ماری ہوئی بتایا ہے۔ عارف خورشید کے افسانوں میں جنس اور عورت کا تذکرہ بہت ملتا ہے۔ ماضی میں منٹو اور بعد ازاں شموئیل احمد کے افسانے اس کی مثالیں ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ عورت کے ذکر کے بغیر اپنا خیال مکمل نہیں کر پاتے۔ افسانوں میں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی زیادہ ہوا ہے۔ عارف خورشید کے افسانے دراصل معاشرے کی کوکھ سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں زندگی کی داخلی وخارجی سطحوں کو ابھارنے کی بھرپور صلاحیت ہے جو اُن کے افسانوں میں جابہ جا نظر آتی ہے۔ خود کلامی بھی ان کے افسانوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ فطری افسانہ نگار ہیں۔ اس لیے فطرت کے نظارے ان کے افسانوں میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

رکیا ہے ہم نے صحت مند یہ ادب تخلیق

''گناہ کی کیل'' عارف کی خوبصورت تخلیق ہے۔ جس میں انھوں نے دو شادی شدہ جوڑوں کی داستان بیان کی ہے۔ مگر دونوں بھی اپنی جنسی زندگی سے ناآسودہ ہیں۔ ہیروئین اور ہیرو ایک ہوٹل

میں جاتے ہیں اور وہاں اپنی جنسی خواہش پوری کرتے ہیں۔ ہیرو کی بیوی پریشان ہو جاتی ہے کہ اس کا شوہر اس کے ساتھ جنسی خواہش پوری نہیں کر سکا ہے۔ جنسی ناآسودگی کی ایک نوعیت اس افسانے میں بیان کی گئی ہے۔

رکیا ہے ہم نے صحت مند یہ ادب تخلیق

عارف خورشید کا افسانہ ''آکاش بیل'' میں شعور کی رو کی تکنیک کو بڑی خوبی سے برتا گیا ہے۔'آکاش بیل' کی خودکشی کر لینے والی ہیروئین کے جنازے میں راوی موجود ہے اور وہ ایک ہجوم میں ہے اس کے شعور کی رو اس کے ماضی و حال کو بیان کر رہی ہے اور وہ بیک وقت کئی جہتوں پر گفتگو کیے جا رہا ہے۔ وہ مرنے والی کو بھی مخاطب کر رہا ہے۔ قبرستان میں نماز ادا کرتے وقت بھی اس کی خودکلامی کا احساس ملتا ہے جس میں کائناتی فلسفے سے لے کر جسمانی محبتوں اور نفرتوں تک کے مسائل بیان ہوتے جا رہے ہیں۔ عارف خورشید کا یہ افسانہ کئی اعتبار سے متوجہ کن ہے۔

کیا ہے ہم نے صحت مند یہ ادب تخلیق

عارف خورشید کا افسانہ ''طواف حرم'' کردار نگاری کا عمدہ مرقع ہے۔ الطاف اور نیلوفر افسانے کے مرکزی کردار ہیں۔ الطاف کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی بیوی نیلوفر کو اپنے ماضی کی داستان سناتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کو بے بنیاد ہی طلاق دے دی تھی۔ الطاف بیان کرتا ہے کہ اس کے باپ کی عدم موجودگی میں اس کے چاچا اس کی ماں کے ساتھ دست درازی کر رہے تھے لیکن چاچا نے اس کی ماں کے کہنے سے قبل ہی اپنی صفائی ایسی بیان کر دی کہ اس کے باپ کو یقین آ گیا کہ غلطی اس کی ماں کی ہی تھی۔ الطاف نے میڈیکل میں داخلہ لیا تھا وہ Cadavers Room میں ایک نعش کو دیکھ کر ایسا طمانچہ رسید کر دیتا ہے کہ اس کا میڈیکل کالج سے داخلہ منسوخ ہو جاتا ہے۔ مردہ گھر میں رکھی ہوئی نعش کی شباہت اس کے چاچا سے ملتی ہوئی تھی۔ الطاف کا کردار اس افسانے میں مرکزی ہے۔ اس کردار میں اپنے اور اپنی ماں کے ساتھ ہوئے ناروا سلوک کے درد کی جوالا بھڑک رہی ہے۔ کردار طمانچہ رسید کر کے انتقام لیتا ہے۔ اس کردار کے سلوک سے افسانہ نگار نے معاشرے میں ہونے والی بے راہ روی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

رکیا ہے ہم نے صحت مند یہ ادب تخلیق

عارف خورشید نے کئی افسانے تخلیق کیے ہیں مگر کہیں بھی ان کی زبان میں ڈھیلا پن پیدا نہیں ہوا ہے۔ وہ زبان و بیان کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کے جملوں کی بافت و ساخت مضبوط ہے جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ ان کا تعلق اورنگ آباد دکن سے ہے۔ یہاں کی زبان کے اثرات ان کے افسانوں میں محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ وہ افسانہ نگاری کے علاوہ شاعری بھی کرتے ہیں مگر ان کے افسانے شعری ترنم سے دور دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی افسانوی زبان میں نثری آہنگ پایا جاتا ہے۔ افسانہ نگار نے اپنی ہر تخلیق میں افسانوی زبان ہی استعمال کی ہے۔ ان کے یہاں ذخیرہ الفاظ کی بھرمار ہے۔ وہ اچھے الفاظ میں عمدہ افسانہ تخلیق کرتے ہیں۔ زبان کی سطح پر تبدیلیوں کو بھی محسوس کرتے ہیں جس کے نتیجے میں عارف خورشید کا اسلوب منفرد بن گیا ہے۔

کیا ہے ہم نے صحت مند یہ ادب تخلیق

عارف خورشید کا فن افسانہ حضرت قمر اقبال کی نظم کے ہر لفظ اور ہر حرف کی صداقت پیش کرتا ہے۔ یہی صداقت ایک معتبر اور معبر افسانہ نگار کی ہے۔ کیوں کہ عارف خورشید، فخر سے یہی کہتے ہیں:

کیا ہے ہم نے صحت مند یہ ادب تخلیق

☆☆☆

عارفِ افسانہ

فاروق شمیم

الیاس احمد گدی نے لکھا ہے:

"...... دراصل کہانیوں میں بعض ایسے مقام بھی آتے ہیں جہاں لکھنے والوں کے ہاتھوں میں رعشہ آجاتا ہے۔ قلم جلنے لگتا ہے اور سب کچھ ایک دم ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ اکثر اس سے گھبرا کر لوگ کہانی کو کوئی اچانک موڑ دے کر یا کسی خیال انگیز نکتے پر لاکر ختم کر دیتے ہیں ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جو اس آگ کے دریا سے گزرنے کا حوصلہ کر پاتے ہوں......" (بغیر آسمان کی زمین)

عموماً جب کوئی نو آموز تخلیق کار کہانی لکھتا ہے یا کوئی شعر کہتا ہے تو اس سے اس کا مقصد محض شعرا اور افسانہ نگاروں کی صف میں جگہ پانا ہوتا ہے۔ اس وقت تو شائد اسے یہ شعور بھی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے شعر میں کوئی پیغام دینا چاہتا ہے اور نہ اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کوئی شاہکار کہانی تخلیق کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اکثر لکھنے والے اسی منزل سے ہو کر آگے بڑھے ہیں۔

عارف خورشید کے اولین افسانوی مجموعہ کے مطالعہ سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے کہ وہ اپنی ذات میں چھپے کہانی کار کی تلاش میں ہیں۔ انھوں نے ابتدائی دور میں دو ایک کہانیاں روایتی محبت کے موضوع پر لکھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کا قلم فنی شعور سے آشنا ہوتا گیا۔ شعور کی آنکھ جب بیدار ہوتی ہے تو سماجی ناہمواری ایک لمحہ نہیں جچتی۔ عارف خورشید کا قلم سماج کی ان ناہمواریوں کے خلاف بے تکان رواں نظر آتا ہے۔ کہانی کی روایت کی اعترافی توسیع میں عارف خورشید کے پاس یکسانیت سے گریز کا عمل ملتا ہے۔ کہیں وہ کرداروں کے مکالموں سے ترسیل کی راہیں نکالتے ہیں، کہیں صرف بیانیہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ کہیں واحد متکلم اپنی سوچوں میں اتنا گھرا ہوتا ہے کہ یادداشتوں میں مکالمے بھی ضروری

ہو جاتے ہیں۔کمال یہ ہے کہ جس تکنیک کو اپنایا ہے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔سماجی ناہمواری ایک رخی کیفیت کا نام نہیں۔اس سے بھی کئی شاخیں پھوٹتی ہین۔اخلاقی گراوٹ معاشی بدحالی، رشتوں کے تقدس کی پامالی، اقدار کا زوال ان سب کو عارف خورشید نے اپنی کہانیوں میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

افسانہ کا رشتہ انسان کی ذات کی تاریخ ے جڑا ہوا ہے۔حساس افسانہ نگار ہر سانس ایک کہانی محسوس کرتا ہے۔جو کہانیاں گرفت میں اپنی جگہ بنا لیتی ہیں۔صفحۂ قرطاس پر پھیل جاتی ہے جو گرفت میں نہیں آتیں۔حافظہ میں کہیں نہ کہیں جگہ بنا لیتی ہیں۔فن کار خالی لمحوں میں ٹٹول ٹٹول کر ان کی صورت گری کرتا ہے۔''سنہری رت کا فریب'' ایسی ہی ایک کہانی ہے جو بمبئی سے حیدر آباد تک پھیلی ہوئی ہے۔کہانی بظاہر بیانیہ ہے لیکن کہیں کہیں مکالموں سے بھی کام لیا گیا ہے، خصوصاً اس کا اختتامیہ قاری کو چونکا دیتا ہے۔جب عشرت فیصلہ کن آواز میں اشفاق کی تجویز ٹھکرا دیتی ہے۔یہ کہانی عورت پر مرد کی بالادستی کے خلاف بھرپور احتجاج ہے۔نسوانی نفسیات کے مثبت پہلو کو بڑی کامیابی سے پیش کیا گیا ہے۔

''یہ شام بھی کہاں ہوئی'' کی کہانیاں حساس جذبات کی عکاسی کرتی ہیں۔ان کہانیوں میں کہیں خود کلامی ہے۔کہیں بیانیہ۔کہیں کہانی ڈائری کے صفحوں کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ان میں ''ٹیلی پیتھی'' زیادہ متاثر کرتی ہے۔کہانی کے انجام پر قاری کو پھر ایک بار چونکنا پڑتا ہے۔''خوشبو کا سفر'' محبت کے لطیف جذبات کی لطیف داستان ہے۔تہ میں بے پناہ اضطراب، بظاہر پر سکون۔کہانی کی بُنت میں کافی محبت کی گئی ہے۔اس کا بھی اختتام عام ڈگر سے ہٹ کر ہے۔

ایک بات جو عارف خورشید کو دیگر افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی کہانیوں کا غیر معمولی اختتامیہ ہے۔یہ محض ذہنی تلذذ مہیا نہیں کرتا بلکہ اس سے آگے سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

مجموعہ ''احساس کا زخمی مجسمہ'' تک آتے آتے ان کے قلم کی کاٹ اور گہری ہوتی چلی گئی ہے۔اس مجموعے میں انیس کہانیاں شامل ہیں۔بیشتر کہانیوں میں راوی خود واحد متکلم ''میں'' ہے۔حسب ضرورت غائب ''وہ'' سے بھی مدد لی گئی ہے۔کہانیوں کا موضوع پھر ایک بار سماجی نابرابری، جبر، استحصال اور معاشرتی ناہمواری ہے۔کہانیاں خارج میں شروع ہوتی ہیں لیکن بندھی ہوئی ''میں'' سے رہتی ہیں۔یہ ''میں'' پوری کہانی میں فعال اور متحرک رہتا ہے۔ظاہر ہے سارے واقعات و نتائج اسی

کے کھاتے میں جاتے ہیں۔ عارف خورشید کا ایک ہی مقصد ہے کہ اس ٹوٹ پھوٹ کی ذمہ داری کسی مخصوص کردار پر عائد نہ ہو کر خود ان ہی کے سر ہے۔ ممکن ہے کہانی پڑھ کر قاری کو کہانی کار سے ہمدردی نہ رہے لیکن عارف خورشید کا حوصلہ دیکھیے کہ پھر بھی اپنی بات قاری تک پہنچانے پر مصر ہیں۔

''سفر سفر زندگی'' شعور کی رو کو تھامے آگے بڑھتی ہے۔ پلیٹ فارم، ٹرین، ٹکٹ، روشن استعارے بن کر کہانی کا ساتھ دیتے ہیں۔ اسٹیشن پر موجود آوازیں کردار کو شعور کی رو سے چھٹکارا دلا کر زمینی ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔ اس عمل میں اسٹیشن پر موجود کچھ ذیلی کردار بھی معاون بنتے ہیں۔ قلم کار ایک ایک لحظہ کے لیے ماحول میں سانس لے کر پھر شعور کی رو کا سرا تھامے نکل پڑتا ہے اس سفر سفر زندگی کا جواز خود انہی کے الفاظ میں سنیے:

> ''...... میں نام بدلتا رہتا ہوں۔ میں ہر کہانی کا کردار ہوں۔ جب تک روئے زمین پر کہانیاں جنم لیتی رہیں گی، میں سفر کرتا رہوں گا۔ میرا سفر ازل کی پرنور وادیوں سے شروع ہوا ہے۔ گپھاؤں کے اندھیرے میرے سفر میں رکاوٹ ڈال نہیں سکتے۔ اس لیے میرا سفر ایک بے انت سفر ہے......''

یہ بے انت سفر محض سفر ہی نہیں۔ زندگی کے تمام حل طلب مسائل کو سمیٹتے ہوئے چلتے رہنا ہے۔ عدم منزل کا احساس بھی ہے۔ وسائل سے محرومی بھی ہے۔ رشتوں کی دھند بھی ہے۔ شعور کی رو مسلسل گردش میں ہے، سانسیں زمین سے جڑے ہونے کا احساس دلا رہی ہیں۔ کہانی میں کئی پڑاؤ ہیں۔ زندگی ان سے ایسے گذرتی ہے جیسے ٹرین مناظر کو پیچھے چھوڑتی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جو پیچھے رہ گیا وہ قلم کار کے لیے ماضی کا اثاثہ ہے اور منزل۔؟ جستجو، مصالحت، انحراف، سمجھوتہ؟ یہ فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ افسانہ بے مثال ہے۔ عارف خورشید کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جگ بیتی کو آپ بیتی کے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہ مقام بڑی ادبی ریاضت کے بعد ہاتھ آتا ہے۔

''شب خون'' ایک عمدہ نفسیاتی کہانی ہے۔ رشتوں کے بکھراؤ کو فنی مہارت سے سمیٹا گیا ہے۔ یاس اور محرومی کرداروں کا مقدر ہے پھر بھی سارے کردار متحرک ہیں اس بکھراؤ کا حاصل کیا ہے؟

عارف خورشید لکھتے ہیں:

''اپنے آپ کے بکھرنے کا شمار کون کرے گا جب وہ خود شمار کنندہ ہو نسب نما اگرچہ تھکن سے نا آشنا اپنی تقسیم کا ذریعہ بنتا رہا مگر عمر کی کسر کے برسوں بعد بھی اعداد کا اضافہ ناگزیر ہو گیا اور میں شمار کنندہ بنا نسب نما کی خواہش کی تکمیل میں تقسیم ہوتا رہا اور میری کسر کھو گئی۔''

• ریاضی کی اصطلاحوں میں تلاش ذات کے اسرار آشکار کرنا کھیل نہیں۔ رشتوں کے آپسی تصادم کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں اور ایک نا قابلِ قیاس اختتامیہ تک لا کر چھوڑ دیتے ہیں اور قاری سوچتا رہ جاتا ہے کہ کیا واقعی زندگی بتانا آسان ہے؟

''زخم چاہے نشان چھوڑے یا نہ چھوڑے زخمی ہونے کا احساس ساری زندگی پیچھا کرتا رہتا ہے۔ ساتھ چھوڑ جاتی ہیں تو لکیریں جو قسمت کے دھاگوں نے الجھائی ہیں جن کا سرا تلاش کرنا انسان کے بس کی بات کہاں......؟''

مندرجہ بالا خوبصورت اقتباس کہانی ''احساس کا زخمی مجسمہ'' سے لیا گیا ہے۔ عارف خورشید کی نظر میں آج کا انسان ایک چلتا پھرتا احساس کا زخمی مجسمہ ہے۔ پورا افسانہ تجسیم اور زخم کی حسیت سے عبارت ہے۔ اس بحث میں کہانی پن ہر سطر اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔ ہر کردار کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔ کہانی دفعتاً ختم نہیں ہوتی بلکہ جانے بوجھے انجام تک پہنچتی ہے لیکن یہ انجام قاری کی آنکھیں کھول دیتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ کیا ایسا بھی ممکن ہے؟ اسی ممکن کی بازیافت اس کہانی کا جواز بھی ہے۔

''قافلے والو سچ کہنا'' میں شامل کہانیاں بقول سلیم شہزاد سچ کہنے والے افسانے ہیں۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے عارف خورشید کا شعور مزید بیدار، زبان و بیان پر گرفت مضبوط، مشاہدہ تیز اور عصری حسیت سے مکمل آگاہی نظر آتی ہے۔ ''الساس'' اور ''منظر کی گواہی'' ایک دوسرے سے قریب افسانے ہیں۔ کرداروں کے نام اور بدلتے منظر نامے سے انہیں ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں، موضوع موجودہ نسل اور نئی نسل کا درمیانی فاصلہ ہے۔ ''الساس'' میں پوجا کے دوران کبھی پجاری جوان نظر آتا ہے اور کبھی بیٹا بوڑھا۔ ''منظر کی گواہی'' میں خود کلامی کہانی میں ڈھل گئی ہے۔ عارف خورشید شاعری کی زبان

سے بھی واقف ہیں تبھی تو نثر میں جگہ جگہ لفظوں کے ایسے نخلستان نظر آتے ہیں۔

''چونکہ میری آنکھوں میں سارے مناظر مطالعے اور سوچ کے سب در آئے ہیں اس لیے میں اضطراب کا پیکر بن گیا ہوں اور سورج غروب ہوتے ہی سمندر نہا کے نکلا...... میں نے پوچھا مجھے کس نے ڈبویا تو آواز آئی، نیکیوں نے......''

عارف خورشید نے ایک جگہ لکھا ہے ''جو خاموش ہوتا ہے وہ بہت پر شور ہوتا ہے'' عارف بظاہر خاموش نظر آتے ہیں۔ ان کی ساری پر شوری کہانیوں میں کھلتی ہے ''منظر کی گواہی'' کا اختتامیہ بھی حیرتناک ہے کہ موجودہ نسل کا نمائندہ آنے والی نسل کے نمائندے کے تیز لہجے میں بات کرنے سے سہم جاتا ہے۔ یہیں غم ذات اور غم کائنات کی آزمائش ہوتی ہے اور یہ المیہ شخصی نہ رہ کر پوری نسل کا المیہ بن جاتا ہے۔

''آکاش بیل'' شعور کی رو کے سہارے پروان چڑھی تخلیق ہے۔ بے مثال کہانی ہے۔ گھر سے قبرستان تک کی کہانی۔ لیکن کئی موڑ ہیں۔ کئی زاویے ہیں جن سے ہوتے ہوئے اپنے اختتام تک پہنچتی ہے۔ یہاں سوچوں کا لامتناہی سلسلہ اچانک ٹوٹ جاتا ہے اور ذہن خالی محسوس ہونے لگتا ہے۔

''قافلے والو سچ کہنا'' اور ''مکبر الصوت'' قدرے پیچ دار اور قدیم اسلوب پر مبنی کہانیاں ہیں۔ اگرچہ لفظیات نئی ہیں لیکن مافی الضمیر کی ادائیگی راست نہیں ہو پاتی اس کے لیے کئی وادیاں قطع کرنی پڑتی ہیں۔ موضوع لاکھ شفاف ہو، مفہوم تک لے جانے والے متون اگر پُر پیچ راہوں سے گزرتے ہوں تو قاری کا ذہن تھک ہی جاتا ہے۔ 'مکبر الصوت' ایک اعتبار سے علامتی کہانی ہے۔ عارف خورشید نے علامتوں کے سہارے تہذیبی رموز و اسرار بیان کردیے ہیں۔

''آئینہ خانہ'' پر بھی علامتی رنگ غالب ہے۔ عارف خورشید کے نزدیک کہانی زندگی ہے اور زندگی......؟ وہ جواب دیتے ہیں۔

''دوست زندگی بجائے خود ایک آئینہ خانہ ہے کہ ہزار رنگ رکھتی ہے، ہزار جلوے دکھاتی ہے، ہر جلوے میں کتنے ہی روپ بدلتی ہے۔''

اور انسان جو یہ زندگی کرنے کا حوصلہ اور جذبہ رکھتا ہے اس کے بارے میں عارف خورشید

کہتے ہیں۔

''جب انسان کھو جاتا ہے تو اصل میں کھوتا نہیں وہ اپنا آپ پا جاتا ہے
کھو جانے سے اس کی پہچان مٹتی نہیں بلکہ اس کی شناخت قائم ہوتی ہے۔''

اصل میں انسان اور زندگی ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ایک کی موت دوسرے کا خاتمہ ہے اس کے باوجود انفرادی طور پر دونوں کتنے خانوں میں تقسیم ہیں۔حاصل تقسیم کہانی کا حاصل ہے۔

''کھویا ہوا منظر'' زندگی کی بازیافت کی روداد ہے۔کہانی کا حسن کہانی کا اختصار ہے۔کفایت لفظی کی داد دینی ہوگی۔ایک لفظ بھرتی کا نہیں اور نہ ایک لفظ کم کیا جا سکتا ہے۔آغاز اس طرح ہے۔

''خاموشی کھڑی چلا رہی ہے۔اجالا اندھیرے کا منتظر ہے۔اس ٹھہرے منظر کو بکھیرنے کی کوشش میں وہ برسوں سے ایک لمحے کی تلاش میں کتابیں پڑھ رہا ہے۔اسے ہر کتاب میں سوچے سمجھے جملے ہی ملے۔زندگی سے جڑا ،دھوپ میں پڑا، بارش میں بھیگا جملہ اسے ملا ہی نہیں لیکن مطالعے نے اس کے اندر اعتدال کی ایک راہ بنائی، ایک روشنی دکھائی۔''

اور اعتدال کی اس راہ پر اس روشنی میں کردار پر انکشاف ہوا کہ اس کی زندگی ہے اور نہیں کے درمیان معلق ہے۔اسے اپنے وجود کی تلاش ہے جو کھوئے ہوئے منظر میں پرچھائیں کی طرح تحلیل ہو گیا ہے۔اس کھوئے ہوئے منظر کی بازیافت دراصل زندگی کی مراجعت اور وجود کی واپسی ہے۔کہانی میں دو تین واقعاتی موڑ بھی ہیں۔

''اس نے الماری میں جمی کتابیں پڑھنا شروع کر دیں مگر اسے جواب نہیں ملا بلکہ وہ سوال بھی کہیں کتابوں میں گم ہو گیا۔''

سوال کا گم ہونا ذات کے سفر کے اختتام کا اعلان ہے۔یہ کہانی ایک عمدہ نثر پارہ کہلانے کی مستحق ہے۔تجسس اور تلاش کا جذبہ اسے قبر کے ملبے سے اٹھا کر کھڑا تو کر دیتا ہے لیکن یہ وجود کہاں، محض ایک پرچھائیں ہے جو وجود کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔

عارف خورشید کی حالیہ کتاب ''وقت کے چاک پر'' میں چار افسانے، ایک تبصرہ، چار خاکے

اور باون افسانچے ہیں۔ یہاں گفتگو صرف افسانوں سے متعلق ہے۔

''وقت کے چاک پر'' کی پہلی کہانی ''شجر ممنوعہ'' ہے۔ کہانی میں بظاہر میاں بیوی دو ہی کردار ہیں لیکن ایک تیسرا کردار جو کم طاقتور نہیں شبینہ کا ہے۔ غازی کے ذہن کے اسکرین میں قید ہے، آنکھیں دراصل خارج سے تعلق قائم کرنے کا ذریعہ ہیں۔ لیکن ذہن پر اگر کوئی نقش مرتسم ہو تو وہی خدوخال خارجی وجود میں نظر آسکتے ہیں۔ یہی تجربہ اس کہانی کا موضوع ہے۔ سیاحتی مقامات سے گزرتے ہوئے بھی ذہن میں نقش تصویر سے پیچھا چھڑانے میں ناکام رہتا ہے۔ تنہائی میں یادوں کا عذاب جھیلنا آسان ہے لیکن کسی کے ساتھ ہوتے ہوئے فاصلوں کا تسلسل ناقابل برداشت عذاب ہے۔ لمحہ لمحہ سلگتے الاؤ کا یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس نفسیاتی مسئلہ کو پیش کرنے میں خود کلامی، شعور کی رو اور منظر نامہ سبھی سے کام لیا ہے اور اپنی پیشکش میں کامیاب رہے ہیں۔

''سات چاند'' اور ''داستان مرکب ہے'' بھی نفسیاتی پیچیدگیوں کی گرہ کشائی کرتی کہانیاں ہیں۔ ''سات چاند'' کی اساس اس نظریہ پر ہے کہ ''دوسری عورت کی جو چیز آپ Enjoy کر لیتے ہیں وہ آپ کی بیوی میں کم ہو جاتی ہے۔'' اسی تناظر میں انھوں نے جو کہانی بنی ہے لاجواب ہے۔ کہانی تو دو جملوں میں بھی مکمل ہو سکتی تھی، اور سچ تو یہ ہے ان دو میں بھی ایک جملہ اضافی ہے لیکن عارف خورشید نے ساڑھے چار صفحات میں کہانی کو جو پھیلایا ہے، ان کی فنی کاریگری کا کمال ہے۔

''داستان مرکب ہے'' کا بنیادی کردار ''وہ'' ہے یعنی غائب۔ پورا افسانہ ایک رات کی داستان ہے جب وہ ساری روشنیاں بجھا کر مکمل تاریکی میں اپنے دامن پر ایک ایک گناہ کے دھبے کو دیکھتا ہے اور اس سے وابستہ یادوں کی چنگاریوں پر کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ کہانی میں ایک اور کردار ''مخاطب'' بھی ہے۔ یہ غالباً اس شخص کا ضمیر ہے۔ جو بیچ بیچ میں اسے ٹوک کر اسے پرسکون کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کہانی میں راوی کا کہیں وجود نہیں یا پھر شاید ضمیر ہی راوی بھی ہے۔ جب کہانی کا کردار اپنی سب گھناؤنی حرکتیں ایک ایک کر کے یاد کر چکا تو ضمیر نے ضرب لگائی۔

''......تم کو کیا معلوم کہ کس جرثومے کو تمھارے وجود کا حکم ملا اور تم، تم ہو گئے ورنہ بے شمار تمھارے ساتھی ضائع ہو گئے، اور تم یہاں تک آ گئے۔ کیسے آئے کون لایا۔ اس لیے اپنے آپ کی حفاظت کرو ورنہ تاریخ تمھیں اسی

طرح پچھاڑتی رہے گی اور تمھارے شکوے صدیوں پر محیط ہو جائیں گے۔
دیکھ سکو تو سب کچھ دکھائی دے گا۔ نہیں دیکھ سکو گے تو بینائی خالی پن سے
ٹکرا کر تنہا ہو جائے گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوئی ساتھ رہ کر بھی تنہا
کر دیتا ہے۔ اسے تم دیکھ پاتے ہو؟ اسی طرح ہم اپنے ساتھ ہوتے ہیں
اور خود کو پہچان نہیں پاتے تو ہم اکیلے ہو جاتے ہیں......"

عارف خورشید نے جہاں اعتراف گناہ کرواتے ہوئے اپنے کردار سے ایسی باتیں بھی کہلوادی ہیں جنھیں سن کر طبیعت ابا کرتی ہے وہیں کہانی میں پھیلی ایسی تمام کراہتوں کا ازالہ مندرجہ بالا اقتباس سے کر دیا ہے۔ ضمیر کی یہ تلقین نفسانی خواہشات کے پیچھے آنکھیں بند کیے بھاگ رہے تمام کرداروں کے لیے ہے۔

"بے آواز شہادت" کہنے کو حسن خدمت پر سبکدوشی کے سلسلے میں وداعی جلسہ کا بیان ہے۔ افسانہ واحد متکلم کے سہارے آگے بڑھتا ہے۔ سوچوں کے دائرے جب پھیلنے لگتے ہیں تو غم ذات کے ساتھ غم کائنات بھی شامل ہو جاتا ہے۔ معاشی عدم توازن، استحصال، لیاقت اور عدم لیاقت کی تمیز کا فقدان، انتظامی بے ضابطگیاں غرض کبھی کچھ اس افسانے میں سمو دیا گیا ہے۔ عارف خورشید سے کبھی کبھی ایک سہو ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ لہجہ کی صداقت کے اظہار کے لیے قریب سے کوئی بات اٹھا لیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کہانیاں زمین ہی پر جنم لیتی ہیں اور زمین ہی سے اٹھائی جاتی ہیں لیکن قریب کی بات اٹھانے سے شکایتوں کے دروازے کھلنے کا خدشہ لاحق رہتا ہے۔ اس افسانے سے کچھ سطریں کم کر دیں جاتیں تو مجموعی تاثر پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن چونکہ ان کے بارے میں مشہور ہو چکا ہے کہ وہ کفایت لفظی سے کام لیتے ہیں، اس لیے مزید اختصار پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اس افسانے کا سب سے جذباتی وہ حصہ ہے جہاں ایک طالب علم کو کاپی نہ لانے پر وہ چھڑیاں لگاتے ہیں۔ دوسرے دن پھر وہ طالب علم کاپی نہیں لاتا اور چھڑیاں کھاتا ہے۔ تیسرے دن بھی جب وہ کاپی نہیں لاتا تو یہ سوال کرتے ہیں کہ آخر کیوں کاپی نہیں لاتے۔ تب وہ لڑکا جواب دیتا ہے کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا ہے اور ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ راوی کا یہ جواب سن کر استاد نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور گلے لگا کر کہا۔ بیٹے کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہنا۔ راوی کا بیان ہے اس لڑکے کی آنکھوں سے اس وقت آنسو نکلے اور وہ زار و قطار رو دیا

تھا۔ یہاں کئی سوال سر اٹھاتے ہیں۔ وہ لڑکا کون تھا؟ محض ایک غریب طالب علم؟ استاد کا کوئی رشتہ دار؟ یا خود عارف خورشید؟ اور یہیں یہ گتھی سلجھتی نظر آتی ہے کہ استاد اور شاگرد کا رشتہ کیا ہوتا ہے۔ آنسو صرف لڑکے کی آنکھوں میں نہیں تھے خود استاد کی آنکھیں چھلک پڑی ہوں گی اور کہانی کا یہ حصہ پڑھتے ہوئے خود حساس قاری بھی اپنی آنکھوں میں نمی محسوس کر سکتا ہے۔

عارف خورشید جو اپنی کہانیوں کے اختتامیہ پر خاص توجہ دیتے ہیں اس روداد نما افسانے کے اختتام پر بھی قاری کو چونکانے سے نہیں چوکے۔ کہانی کے آخری لمحوں میں جب تقریر کا موقع آیا تو انھوں نے ایک جملہ پر اکتفا کیا ہے۔

''ہم بچھڑنے کا غم تو مناتے ہیں، ملنے کی خوشی کیوں بھول جاتے ہیں، ملے تھے تبھی تو بچھڑے......''

یہ افسانہ جتنا تہ دار ہے اتنی ہی چابکدستی سے رقم ہوا ہے۔ یہ تھیں عارف خورشید کے افسانوی سفر کی چند جھلکیاں۔ مکمل محاسبہ تو اہل علم ہی کریں گے۔

وہ جو شروع میں الیاس احمد گدی کی کہانی سے اقتباس نقل کیا گیا ہے، ایک عمومی صورت حال کا نقیب ہے۔ جہاں تک عارف خورشید کا تعلق ہے نہ ابھی ان کے ہاتھ رعشہ زدہ ہوئے ہیں، نہ قلم جلنے لگا ہے اور نہ وہ کہانی کو کوئی اچانک موڑ دے کر کسی خیال انگیز نکتے پر لا کر ختم کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ ان لوگوں میں شامل ہیں جو اس آگ کے دریا سے گزرنے کا حوصلہ کر پاتے ہیں۔

☆☆☆

عارف خورشید کا افسانوی سفر

قمر جمالی

آزادی کے بعد

اردو افسانے کے موضوع اور اسالیب دونوں میں رجحانات کے اعتبار سے بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ یہ رجحانات بے حد توانا رہے اور ایک عصر کو اپنی گرفت میں لیے افسانہ نگاروں کے ذہنی ارتقا کو جھنجھوڑتے رہے۔

نتیجتاً

افسانہ نگار جہاں سیاسی اور معاشرتی ادھیڑ بُن کی وجہ سے خارجی دباؤ سے پریشان رہے، وہیں داخلی شکست وریخت کا شکار ہوئے۔

مگر

اس شکست وریخت کے نتیجے میں بڑا توانا عوامی ادب تخلیق ہوا کیونکہ توڑ پھوڑ کا عمل اکثر مثبت نتائج درآمد کرتا ہے۔ حیاتِ انسانی اپنی بقاء کے لئے ہمیشہ ایسی ہی فضا کی مرہونِ منت رہی کہ اس میں پنپنے کی صلاحیت خوب ہوتی ہے۔

لہذا

آزادی کے بعد کی بے چینیوں نے قلم کاروں میں نئی جان پھونک دی جس کے نتیجے میں اردو افسانے کا منظرنامہ بے حد توانا ہو گیا اور،

افسانہ نگار

نڈر، بیباک اور سفاک ہو گیا۔

یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ افسانہ ہمیشہ سے فرد اور سماج کی کشمکش سے اٹھنے والی خارجی اور داخلی احساسات کو قلم بند کرنے کا وسیلہ رہا ہے۔ مگر

آزادی کے بعد اس میں متنوع الابعاد کیفیات پیدا ہو گئیں۔

لفظیات بدل گئیں۔

افسانہ نگار کے اندر ایک جوش اور ولولہ پیدا ہوا۔

آپ اسے ترقی پسند تحریک کی دین بھی سمجھ سکتے ہیں۔ کیونکہ ''ترقی پسندی'' آزادیِ اظہار، اسالیب کے تنوع اور تکثریت کا اتنا ہی احترام کرتی جتنا کہ کوئی بھی روشن ضمیر انسان کر سکتا ہے۔ رجعت پسندی، عصبیت، نامساوات اس فکری اساس کے لیے لعنت ہیں۔

اس لیے

میری نظر میں ہر ایماندار قلمکار ترقی پسند ہے۔

لہٰذا افسانے کے موضوعات محض عشق اور اس کی واجبات کی گرفت سے آزاد ہو گئے ...... اور عام انسانی مسائل در آئے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ تخلیق عشق و محبت کے جذبوں سے عاری ہو گئی۔

کیونکہ......

کوئی بھی تخلیق محبت کے جذبات سے عاری ہو کر فن پارہ نہیں بن سکتی۔ تخلیق ......تو محبت کے کوکھ سے جنم لیتی ہے۔

اس کائنات کی اساس ہی محبت ہے۔

وجہ تخلیق کائنات......خود محبت ہے۔

انسان سے انسان کا ٹکراؤ......محبت ہی ہے۔

اور

جب تک محبت کا یہ فسوں سر چڑھ کر جنون نہیں بنتا......تخلیق ناممکن ہے۔

لیکن......

بدلتے وقت نے محبت کی افہام و تفہیم کو اتنی وسعت بخشی کہ،

قاری

اور قلمکار......دونوں بالغ ہو گئے۔

انھیں بالغ النظر افسانہ نگاروں میں جناب عارف کا شمار ہوتا ہے۔

عارف خورشید، دکن کے مردم خیز خطہ اورنگ آباد کی پیداوار ہیں جہاں محبت کی داستانیں سنگی لبادے میں جانے کتنی صدیوں سے آباد ہیں اور نہ جانے کب تک باقی رہیں گے۔ ویسے اورنگ آباد کا نام آتے ہی ذہن میں جہاں ایلورہ اجنتا کا خیال آتا ہے یا پھر مولوی عبدالحق اور ان انجمن ترقی اردو کی تاریخ کا خیال آتا ہے...... وہیں اس گہوارۂ ادب سے اٹھنے والے نثر نگاروں میں رفعت نواز، محمد شکیل، نورالحسنین اور عارف خورشید کے ہونے کا احساس بھی ہوتا ہے۔ دکن کے اس مردم خیز علاقے سے کچھ بڑی بڑی ہستیاں بھی اٹھیں مگر یہاں ہم بات کو صرف نثر نگاروں تک محدود رکھتے ہیں۔

عارف خورشید آزادی کے بعد اردو کے منظرنامے پر ابھرنے والے نہایت زود قلم قلمکار ہیں۔ ان کی قلمروئے تخلیق میں نظم و نثر دونوں شامل ہیں۔ مگر...... ان کی نثر، نظم پر غالب ہے۔

بلکہ،

یہ کہنا درست ہے کہ ان کی نثر پر نظم کا گمان ہوتا ہے۔

کچھ دن قبل عارف خورشید صاحب نے فون پر بات کی اور خواہش ظاہر کی کہ ''عالمگیر ادب'' کے ''عارف خورشید نمبر'' کے لیے کچھ لکھوں۔ میں نے ''ہاں'' تو کر دی مگر ایک تذبذب میں رہی کہ عارف خورشید میرے ہمعصر ہیں، کیا ہمعصر کے بارے میں اظہار خیال ممکن ہے؟

ایک ہمعصر، دوسرے ہمعصر کا آئینہ ہوتا ہے۔''

میرے دل نے کہا۔ کیونکہ اس میں نہ تو بزرگانہ پند و نصائح ہوتے ہیں اور نہ استادانہ تنقید۔ میں نے اپنی لائبریری سے عارف خورشید صاحب کی ساری کتابیں ڈھونڈ نکالیں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً مجھے عنایت کی تھیں۔

فی الحال میرے ہاں جناب عارف خورشید کے اکتالیس افسانے اور ایک افسانچوں کا مجموعہ ہے جو کسی بھی فنکار کے اسلوب کو سمجھنے کے لیے بہت کافی ہیں۔ ویسے ''وقت کے چاک پر'' کے پچھلے ٹائٹل پر مصنف کی (۱۵) کتابوں کے نام درج ہیں جن میں (۶) افسانوی مجموعے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عارف خورشید ایک Versatile رائٹر ہیں۔ ان کے ادبی سرمایے میں افسانوی، غیر افسانوی اور شاعری کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہے۔ اظہار کی بے چینی انھیں خاموش رہنے نہیں دیتی۔ اپنی کتاب ''قافلے والو سچ کہنا'' کے پیش لفظ میں انھوں نے خود اعتراف کیا ہے:

''طبیعت میں تعلیٰ نہیں ہے لیکن خود کے ہونے کا احساس ہے جس کو میں
ابھی تک رد نہیں کر سکا۔ میری یہ خواہش پوری طرح سے پوری نہیں ہو رہی
ہے۔ میں اپنی تصویر دیکھ کر حیران ہوں کہ یہ وہی ہے جو سوچتا ہے کہ روح
درد بھی محسوس کرتی ہے، جسم لذت بھی، آنکھیں دیکھنا بھی جانتی ہیں اور
کان سننا بھی، ناک سونگھنا اور ہاتھ چھونا بھی، مجھے نسیم دہر کے لمس یاد
آ گئے۔''

عارف خورشید کے اس اعتراف نے میری مشکل آسان کر دی اور مجھے انھیں سمجھنے میں سہولت ہوئی۔ ان کے سبھی افسانے جو میرے ہاں موجود ہیں میں نے پڑھے۔ موصوف کے فن میں بلا کا ارتقا ہے۔ عارف خورشید کا قلم اشہب سوار ہے، مگر یہ لگام تھامنا بھی خوب جانتے ہیں۔

عارف خورشید کا پہلا افسانوی مجموعہ ''یہ شام بھی کہاں ہوئی'' دراصل تین دوستوں کا مخلوط مجموعہ ہے جس میں عارف خورشید کے سات افسانے موجود ہیں۔ اس مجموعے کا پہلا افسانہ ''دھواں'' اس بات کی گواہی دیتا ہے ہے عارف خورشید ابتداء ہی سے ایک بالغ نظر فنکار ہے۔

ابتدائی تحریروں کو پڑھ کر شگفتگی کا احساس ہوتا ہے لیکن جوں جوں ان کا قلم جوان ہوتا گیا تحریریں بیباک ہوتی گئیں۔

عارف خورشید نے عشق کو اپنا مسلک بنایا۔

اور

عشق سے متعلق سارے جذبات محبت، اطاعت، ایثار، وصال، نفرت، رقابت

اور

خوشی اور غم، سے نبرد آزما ہوئے۔

یہ سچ ہے کہ ادیب اپنے مشاہدے اور قوت ادراک سے اپنے موضوعات طے کرتا ہے۔ وہ کیسا ادب تخلیق کرتا ہے یہ اس کی قوتِ تخیل، ندرتِ فکر، فنی دسترس اور قوتِ اظہار پر منحصر ہے۔ عارف خورشید کے ساتھ بھی معاملہ یہی ہے۔ موصوف اپنے موضوع کے انتخاب میں بڑے سخت ہیں۔

کیونکہ،

انھوں نے صرف ایک ہی موضوع کو جو زن وشو کے داخلی معاملات سے متعلق ہیں، بڑے تنوع سے پیش کیا ہے۔تقریباً سبھی کہانیاں کائنات کے اُس رمز کے اطراف گردش کرتی ہیں جس کے لئے خدائے بزرگ و برتر نے یہ کائنات تخلیق کی۔

یعنی......

تخلیق آدم۔

اور

پھر

یہ ساری نسل انسانی۔

جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً " اوراللہ کی نشانیوں میں یہ ہے کہ اُس نے تمھارے لئے تمھاری جنس سے جوڑے بنائے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرسکو اور تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی۔

(سورۃ الروم۔آیت ۲۱)

عورت اور مرد کے نجی جذبات عارف خورشید کے افسانوں کی بنیاد ہیں۔اسی لیے ان کے افسانے نے کھلے آسمان سے زیادہ گھر کی چاردیواری میں کسی بند کمرے کی فضا میں پنپتے ہیں۔

عارف خورشید نے ادب میں اُس لہجے کی توسیع کی ہے جو برسوں پہلے، یا یوں کہیے کہ ایک صدی پہلے عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی نے شروع کیا تھا۔انھوں نے اپنے موضوعات ایک محدود دائرے میں کافی تنوع کے ساتھ چنے ہیں جو ایک کمال کی بات ہے۔ان کے ہاں ''درد'' زمانے کے دیے ہوئے زخموں سے نہیں بلکہ عورت و مرد کے داخلی جذبوں کی شکست و ریخت سے اٹھتا ہے۔

لیکن......

اس درد میں ایک دھیماپن بھی ہے جو قاری کے لیے تسلی کا باعث ہے۔

عارف خورشید نے اکثر افسانے صیغۂ واحد متکلم میں لکھے ہیں۔اس سے بیانیہ مضبوط ہوجاتا

ہے اور قاری کردار کے پس پردہ قلمکار کو ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اس وسیلے میں افسانوی اظہار سفرنامے کی صورت اختیار کر لیتا ہے تخلیق کار مسافر کی صورت اپنی داستانِ سفر بیان کر رہا ہوتا ہے،

اور قاری

سن رہا

اس اظہار میں قاری کو فنکار کے تجربے میں ردو قبول کی گنجائش کم ہو جاتی ہے۔

کیونکہ

غائبانہ طور پر قاری اُس پورے Scinario میں بذاتِ خود موجود رہتا ہے۔ عارف خورشید کا یہی اعترافی لہجہ انھیں قاری سے قریب کرتا ہے۔

نامور ترقی پسند نقاد جناب قمر رئیس (مرحوم) اپنے ایک مضمون ''معاصر افسانہ کا منظر اور پس منظر'' میں مولانا شبلی نعمانی کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ:

شعر کے لئے دو چیزیں لازمی ہیں۔

(۱) محاکمات اور

(۲) تخیل

محاکمات کی تعریف وہ اس طرح کرتے ہیں کہ کسی چیز، کسی حالت یا کسی کیفیت کا اس طرح ادا کرنا کہ اس کی تصویر آنکھوں میں بھر جائے۔ اس لحاظ سے افسانہ بھی شاعری ہے

لیکن

شاعری میں محاکمات کا عمل اکثر تشبیہ و استعارہ کا محتاج ہوتا ہے،

جبکہ

افسانہ بیانیہ کی قوت سے ہی محاکمات کا کمال دکھاتا ہے۔

عارف خورشید ''بیانیہ'' کے دھنی ہیں۔ صفحات پر صفحات پڑھتے جایئے، کہیں بوریت کا احساس نہیں ہوتا، باوجود اس کے کہ کہیں کہیں ان کے افسانوں میں کہانی پن کی غیر موجودگی کھلنے لگتی ہے۔ پھر بھی...... قاری کا ساتھ نہیں چھوٹتا۔

کسی بھی افسانے کی کامیابی اس کی بافت، یعنی بنت پر منحصر ہوتی ہے۔ عارف خورشید کو اس

پر ملکہ حاصل ہے۔ تانے بانے میں ایک سوت کا فرق نہیں کہانی لفظ لفظ پیکر تراشتی ہے۔

عارف خورشید کے فن کا ایک اور خاصہ ان کا ''ایجاز'' ہے جو فن افسانہ نگاری کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ دراصل یہی ایجاز، افسانے کو افتخار بخشتا ہے۔ یہ بڑے سے بڑے معاملے کو دو لفظوں میں مکمل کر لیتے ہیں۔ مثلاً:

''مست آنکھوں سے شراب پی کر میں باہر نکلا ہی تھا کہ پیاسی نظروں کی زد میں آ گیا۔ میرے اندر ہوس کا طوفان موجیں مارنے لگا تو میں انکار نہ کر سکا۔'' (افسانہ: آتش فشاں۔ مجموعہ احساس کا زخمی مجسمہ)

''میں نے اس کے جسم کی لذت میں اپنے فراغ کی گرمی محسوس کی۔ اس نے سکون وچین کی بانسری پر تین گیت گانے کی اجازت دی۔''

(افسانہ: گناہ کی کیل۔ مجموعہ احساس کا زخمی مجسمہ)

''صبح ساری تھکن بستر سے ہو کر حمام تک پہنچی۔''

(افسانہ: شجر ممنوعہ۔ مجموعہ: وقت کے چاک پر)

ان اقتباسات کو پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ مزید کچھ کہنے سننے یہ اقتباسات خود اپنی بطن میں چھپی پوری روداد سناتے ہیں۔

ادب کی تخلیق میں تحریکیں بڑا جاندار رول ادا کرتی ہیں۔ عارف خورشید بھی اوروں کی طرح جدیدیت کے ابہامی رویے سے متاثر نظر آتے ہیں۔ سخن گسترانہ بات تو یہ ہے کہ یہ ابہام ان کی تحریروں میں مثبت طریقے سے اثر انداز ہے۔ اس افسانے میں اشاریت کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور معنی کو جہت عطا ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف جب بڑے بیباک انداز میں جنس پر گفتگو کر رہے ہوں تو قاری، بالخصوص خواتین، کو جھینپ کا احساس نہیں ہوتا بلکہ معنی کی جہتیں کھلتی محسوس ہوتی ہیں۔

انسان اصل میں اپنے اندر بسے خیر و شر سے ہمیشہ متصادم رہتا ہے۔ اپنے لاشعور میں بھٹکنے والی جبلی آرزوؤں، اس کی فطری خواہشات اور جنسی معاملات اُس پر کیسے اثر انداز ہوتی ہیں؟

اور

باوجود اپنی حیوانی خواہشات کے احتجاج پر کیسے وہ ان پر قابو پاتا ہے؟

اور

کب تک خود کو سالم رکھ سکتا ہے؟

کیا اپنے، اشرف المخلوقات ہونے کا حق ادا کرتا ہے؟

یا پھر

عارف خورشید کے ہاں ''یا...... پھر؟'' جیسا کوئی مفروضہ در نہیں آتا۔ باوجود اس کے کہ عارف خورشید کے ہاں ''گناہ'' کی تاویل بڑی مختلف ہے۔ انھوں نے اپنے اشرف المخلوقات ہونے کو فراموش نہیں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''وقت کے چاک پر'' کے افسانے پڑھتے ہوئے ایک طرف تو یہ احساس ہوتا ہے

کہ

کاش! یہ اپنے اطراف پھر دان ہی کھینچ لیتے۔

تو

دوسری طرف یہ احساس بھی رہا کہ ان کے ہاں گناہ کی جو بھی تاویل رہی ہو یہ ان کے تنہا شریک ہیں۔ اپنے گناہوں میں دوسروں کو شریک ہونے کی دعوت نہیں دیتے۔ اس لحاظ سے عارف خورشید اپنے لہجے کے منفرد افسانہ نگار ہیں۔

عارف خورشید کے ہاں گناہ کی جو بھی تاویل رہی ہو، یہ بات قطعی نہیں ہے کہ موصوف گناہ وثواب ،حرام وحلال میں فرق نہیں کرتے بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر کہوں تو راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ اسلامی اصولوں پر کاربند، مجموعی طور پر موصوف کی شبیہ قاری کے ذہن پر ایک پیراڈاکس (paradox) کی شکل میں ابھرتی ہے۔

کبھی کبھی تو اسلامی اصولوں کے مطابق حق زوجیت سے استفادہ کرتے ہیں تو ایک تسلی کا احساس ہوتا ہے کہ خدا نے عورت کی تخلیق ہی اس لیے کی ہے کہ وہ مرد کو جنت کی بشارت دے سکے۔

اور اگر

یہ اپنی جنت میں محوخرام ہیں...... تو کسی کو کیا اعتراض

مگر

دوسرے ہی لمحے
یہ اپنی تاویل کی نفی کرتے نظر آتے ہیں۔
مثلاً:

''میں میلوں پیدل چلا ہوں۔ مگر جب سے یہ ملی ہے دو قدم چل کر تھک جاتا ہوں۔ شاید غلط راستے تھکن کے احساس کو بڑھا دیتے ہیں۔ منزل کا پتہ ہو تو ذہن میں پہنچنے کا سرور تھکن پر غالب آجاتا ہے۔ یہ قانونِ فطرت بالکل ایسا ہے جیسے حق زوجیت ادا کرنے میں سکون ...... اور زنا میں احساس جرم۔'' (افسانہ: آتش فشاں۔ مجموعہ: احساس کا زخمی مجسمہ)

کبھی خوفِ خدا سے ان کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ مثلاً:

''بس ٹھہرا رہا تو وہ لمحہ جب تم بھی اور میں بھی ...... ایک دوسرے کی آگ، ایک دوسرے میں انڈیلتے رہے۔ اس لمحہ میں بڑی سرعت سے تم سے الگ ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ لمحہ وہیں ٹھہر گیا اور آج تک وہیں ہے اور پھر گناہ کا دہکتا آتش دان خوفِ خدا کے ابر رحمت سے ٹھنڈا ہو گیا۔'' (لہولہو آرزو۔ ناولٹ)

کسی بھی افسانہ نگار کا مطمحِ نظر، کسی نہ کسی بشری معاملات یعنی Human situation کے متعلق ہوتا ہے۔ یہ بشری صورتحال فطری طور پر انسانی تجربات کی غماز ہوتی ہے۔ چاہے اظہار کے لیے کوئی بھی وسیلہ اپنائے۔ چاہے تنکا وفور واحد متکلم کی صورت میں، یا راوی غائب کی صورت میں خواہ راوی انسان ہو کہ جانور جیسے پریم چند کا بیل وغیرہ۔ بہر کیف وہ انسانی زندگی کی کہانی ہی سنا رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا اظہار میں فنکار بشریت کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا ...... خواہ وہ کردار کی خوبی بیان کر رہا ہو یا خامی:

انسان برا ہے تو وہ دانستہ نہیں ہے
ہوتے ہیں میاں کچھ تو تقاضے بشری بھی

(فاروق شکیل)

عارف خورشید کے ہاں یہ بشری تقاضوں کے محاکمات اتنے طاقتور ہیں کہ لفظی پیکر بار بار سر اٹھا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

''ابھی اجالا نہیں ہوا۔ ابھی لوگ سکون کی نیند سو رہے ہیں۔ ابھی موذن کی 'نیند سے بہتر' کی آواز کسی نے نہیں سنی۔ آواز کے پاؤں ہوتے تو گاؤں کے ہر دروازے پر دستک دیتی۔ آواز تو چھتوں کے اوپر سے نکل جاتی ہے۔ بغیر دستک کے کون جاگتا ہے۔''

(افسانہ: شام سے صبح کاذب تک۔ مجموعہ: احساس کا زخمی مجسمہ)

عارف خورشید بہت سی باتیں جو وہ قاری کے ساتھ share کرنا چاہتے ہیں۔ بین سطور کہتے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کی شعور کی روان کی تحریروں میں فلسفیانہ انداز پیدا کرتی ہے۔ جیسے:

''جب آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تو اصل میں کھل جاتی ہیں۔ وہ سب کچھ روشن ہو جاتا ہے جو بتایا نہیں جا سکتا۔''

(افسانہ: بے آواز شہادت۔ مجموعہ: وقت کے چاک پر)

عارف خورشید اپنے گناہوں کے خود محتسب بھی ہیں۔ کبھی کبھی یہ اپنے دامن میں جھانک کر گناہوں کا اعتراف بھی کرتے ہیں:

''ہجوم میں ایک بڑھیا بھی دکھائی دی تو اسے یاد آیا کہ یہ وہی بڑھیا ہے جو لاج کے کمرے میں تھی اور اس کے احتجاج کی بے احتیاطی نے اس کی ہمت بڑھا دی تھی۔ پھر بڑھیا نے وہ پینترے دکھائے کہ اس کے ہوش ٹھکانے آگئے اور وہ یہ تمام تجربے جوان جسموں پر آزمانے کی خواہش میں کمرہ بند کر کے سو گیا۔''

(افسانہ: داستان مرکب ہے۔ مجموعہ: وقت کے چاک پر)

''اپنے ہم جماعت کو دیکھ کر وہ خوش ہو گیا۔ اپنی حرکت یاد آئی تو شرمندگی ہوئی۔ خیال آیا کہ نادانی میں کیسا غیر فطری کام کر گیا۔''

(افسانہ: داستان مرکب ہے۔ مجموعہ: وقت کے چاک پر)

زندگی کی سفاکیوں پر عارف خورشید کا دل جل اٹھتا ہے۔ اس معاملے میں ایک منصف کی طرح وہ سزا کا تعین بھی کر لیتے ہیں۔

''اگر امی کی موت کے وقت میں اتنا سمجھدار ہوتا تو ابا کو اس طرح زہر دے کر ختم کر دیتا جس طرح انھوں نے بڑی پھوپھو جان کو جائیداد میں اپنا حصہ طلب کرنے پر دیا تھا۔''

(افسانہ: روح کی ہجرت۔ مجموعہ: احساس کا زخمی مجسمہ)

کچھ دن قبل نوید اپنی بڑی لڑکی کے ساتھ آیا تو جانے کیوں اُس وقت شاذیہ نے سوچا کہ اس لڑکی کا جسم بھی کانچ کے ٹکڑوں سے لہولہان ہو جائے۔ کوئی اس کے بستر پر بھی کانچ کے ٹکڑے بکھیر دے۔

آج وہ مطمئن ہوئی جب اسے پتہ چلا کہ کالج کے ایک لڑکے کے ساتھ نوید کی لڑکی دو دن غائب رہی اور وہ لڑکا اسے لاج کے کمرے میں چھوڑ کر فرار ہوگیا۔'' (افسانہ: کانچ کے ٹکڑے۔ مجموعہ: یہ شام بھی کہاں ہوئی)

عارف خورشید ایک منفرد لب و لہجے کے افسانہ نگار ہیں۔ اظہار بیان کے لیے جس وسیلے کو اپنایا ہے وہ فکر و لہجہ نیا تو ہیں...... لیکن ان میں آگہی کی قدرت...... اور لذتِ گناہ سے زیادہ احساس گناہ اور خدا سے عفو و درگذر کی توقع انھیں، ان کے قبیل کے افسانہ نگاروں میں ممیز کرتی ہے۔ ان کی فکری اساس صرف تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ آگہی بھی ہے۔ ملاحظہ کیجیے خود انہی کی زبانی:

''کہانیاں میرے اندر تحریر شدہ کرب کی علامتیں ہیں۔ کہانی خود کو زندہ رکھنے کی خواہش ہیں۔ کہانی خود آگہی ہے۔ کہانی تفریح کا سامان ہیں۔ حالات و واقعات کا منظر نامہ ہے۔ جس سے مورخ اگر چاہے تو بہت کچھ آثار اخذ کر سکتا ہے۔

میں بھی ایک کہانی کہنے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔''

عارف خورشید اپنی نوع کے افسانے کا ایک جاندار اور بیباک نام ہے۔ انھوں نے پچھلی روایت کے مطابق جنسی موضوعات کے اظہار کے لیے کسی طوائف یا بازاری عورت کا سہارا نہیں لیا۔ عورت ان کے ہاں بس ایک عورت ہے۔ یہ عورت کے تقدس کا احترام بھی کرتے ہیں اور خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے دھڑلے سے استفادہ بھی کرتے ہیں۔ ہاں مگر ادب میں ''ادب'' ملحوظ رکھنا اور کچھ معاملات کی پردہ داری بھی ایک ضروری اور مستحسن عمل ہے۔

شخصی طور پر میں عارف خورشید صاحب سے صرف ایک بار ملی ہوں وہ بھی بہت ہی چھوٹی اور مختصر سی ملاقات میں۔

کب......کہاں......؟

یاد نہیں۔

ان کی تحریروں کو پڑھ کر مجھے ان کے اندر ایک نیک اور راسخ انسان نظر آتا ہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھے اپنا مجموعہ ''احساس کا زخمی مجسمہ'' عنایت کرتے ہوئے اس کتاب کے پہلے صفحے پر لکھا تھا:

''محترمہ قمر جمالی صاحبہ و محترم بھائی صاحب!

چھوٹی سی ملاقات میں تفصیلی بات چیت نہیں ہو سکی۔ مگر مختصر سی بات چیت سے بھی اندازہ ہوا کہ آپ لوگ ادب کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں ورنہ یہ اثاثہ بھی کم لوگوں کے پاس رہ گیا ہے۔ بقول بشر نواز:

ریختہ آج سنائیں تو سنائیں کس کو
میرؔ و غالبؔ کی زباں جاننے والے کتنے؟

افسانوی مجموعہ حاضر خدمت ہے۔ قطعاً میں تبصرے کی خواہش، شہرت یا فن کی تعریف و توصیف کے لیے نہیں بھجوا رہا ہوں میں نے تو کہا ہے:

ایسی باتوں سے مجھ کو کیا لینا
دل میں غم ہے تو فن سلامت ہے

فن کی سلامتی کے لیے کسی تعریف کی ضرورت نہیں۔ آخر تک متحرک سانس لیتا رہا تو بہت ہے۔

خیر اندیش

عارف خورشید''

میں عارف خورشید صاحب کے خیال سے متفق ہوں۔ فنکار طبعی عمر جی کر چلا جاتا ہے۔ مگر فن سلامت رہتا ہے۔ اس لیے فنکار کو نہیں فن کو بولنا چاہئے۔

میں نے مقدور بھر کوشش کی کہ عارف خورشید کے فن کو سمجھوں جو سمجھا وہ لکھا۔

پھر بھی

دعا کرتی ہوں کہ منٹو کی طرح انھیں بھی کوئی ممتاز شیریں ملے جو عارف خورشید کو عارف خورشید کا صحیح مقام دلا سکے۔ ☆☆☆

ہمہ جہتی ادبی شخصیت

عبدالقدیر خان سیفی

عارف خورشید اورنگ آباد کے منفرد فنکار ہیں جنھوں نے نثر میں افسانہ نگاری، افسانچہ نگاری، خاکہ نگاری اور شاعری میں نعت گوئی غزل گوئی اور تثلیث گوئی میں طبع آزمائی کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قلمکاروں کو کئی اصناف میں طبع آزمائی کرنے کی نعمت عطا کی ہے۔ انہی فنکاروں میں عارف خورشید شامل ہیں۔ خالق کائنات نے انھیں افسانہ نگاری، افسانچہ نگاری، خاکہ نگاری اور شاعری میں قدرت اور مہارت عطا کی ہے۔

افسانہ نگاری: عارف خورشید کی افسانہ نگاری میں کہانی کے پلاٹ ایسے ہوتے ہیں جو سماجی زندگی اور مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں اردگرد کے ماحول، اور دنیا کے واقعات کے مشاہدات سے اخذ کیے جاتے ہیں اور منظر نگاری کے الفاظ دلنشیں ہوتے ہیں اور افسانوں کے کردار بھی مافوق الفطرت نہیں ہوتے ہیں۔ ہماری زندگی کے جز ہوتے ہیں اور موضوعات زندگی کی صداقتوں اور حقیقتوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ سماجی زندگی کی شکست و ریخت اور عدم سماجی مشاورت کا اظہار ہوتے ہیں۔ اردو کے عظیم افسانہ نگار منٹو کے جنسی موضوعات کی جھلک بھی نظر آتی ہے، لیکن عارف خورشید کا اسلوب بیان انفرادی ہے، افسانہ ''شجر ممنوعہ'' جس کی مثال ہے۔ یہاں کئی افسانوں کے نام ذہن میں ہیں مگر طوالت کے لحاظ سے نظر انداز کرتا ہوں۔ انسانی نفسیات، احساسات، رومانی معاملات کے بھی عارف خورشید کے افسانے عکاس ہوتے ہیں اور شاعری کی طرح ان کے افسانے عصری آگہی کے ترجمان ہوتے ہیں۔

ان کے کئی افسانوں کے مجموعے اہمیت رکھتے ہیں اور عارف خورشید کے افسانچے بھی قارئین کو متوجہ کرتے ہیں اور متاثر کرتے ہیں۔ کم لفظوں میں فکر انگیز بات کہنے کا عارف خورشید کو بہتر سلیقہ ہے۔ فکر پاروں کی طرح عارف خورشید کے افسانچے کلائمکس پڑھنے کے بعد دعوت فکر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر عظیم راہی اپنی کتاب میں مضمون ''مہاراشٹر میں افسانچہ کی روایت'' میں رقم طراز ہیں:

''اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ مراٹھواڑا میں آج افسانچہ انھیں

(عارف خورشید) کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔"

ڈاکٹر عظیم راہی کے مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ مرٹھواڑا میں ہی نہیں برصغیر اور تمام ہندوستان میں عارف خورشید کی بحیثیت افسانچہ نگار شناخت ہے۔

'احساس کا زخمی مجسمہ'، 'سنہری رات کا فریب' اور 'یادوں کا سائباں'، 'آتشیں لمحوں میں'، عارف خورشید کے ناقابل فراموش افسانوی مجموعے ہیں اور ایک ناولٹ 'لہولہو آرزو' بھی اہمیت رکھتا ہے جو آرزوں کی ناکامی اور خون تمنا کے جذبات کا اظہار ہے۔

'قافلے والو سچ کہنا' اور 'کچھ بھی نہیں کہانی میں' جیسے افسانوی مجموعے قابل ذکر ہیں، جنھیں کوئی نقاد نظر انداز نہیں کر سکتا۔ افسانوں میں اور افسانچوں میں عارف خورشید نے سچ کو بیان کیا ہے اور افسانچوں میں 'چلہ'، 'اللہ کا گھر'، 'سبک بار'، 'بخشش'، 'ضابطے کی تکمیل'، 'اللہ اکبر' اور 'سکہ بند' جیسے افسانچے عارف خورشید کی حق بیانی کے ترجمان ہیں جس میں موصوف نے سماج کی برائیوں کو بے نقاب کیا ہے۔

عارف خورشید کی افسانہ نگاری ہو یا افسانچہ نگاری ہو، فکر انگیز ہوتی ہے۔ قارئین سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، حالانکہ کئی قارئین یہ تنقید کرتے ہیں کہ وہ جنسی موضوعات کو افسانے یا افسانچے کے موضوعات بناتے ہیں لیکن اس سے قطع نظر عارف خورشید کے افسانوں اور افسانچوں میں زندگی کی حقیقتیں، زبان و بیان کی جدت پائی جاتی ہے۔

خاکہ نگاری: خاکہ نگاری اردو ادب کی اہم صنف سخن ہے حالؔی سے لے کر کئی تحریکات رومانیت کی تحریک، ارباب ذوق تحریک، ترقی پسند تحریک، جدیدیت کی تحریک تک کئی ادیبوں نے ادبی اور غیر ادبی شخصیتوں پر خاکے رقم کیے ہیں۔ جو ان شخصیات کی زندگیوں، حالات، کوائف، خصائل، واقعات اور خوبیوں اور خامیوں کو واضح کرتے ہیں۔

اورنگ آباد میں نور الحسنین کی کتاب خوش بیانیاں اور کئی خاکے اور عارف خورشید کی خاکہ نگاری کی کتابیں "تنظیم کثیر رنگی" اور "رنگ امتزاج" اہمیت رکھتی ہیں اور عارف خورشید کی کتاب "وقت کے چاک پر" میں تبصروں کے علاوہ اور افسانچوں کے علاوہ قاضی سلیم، حمید سہروردی، جاوید ناصر اور رشید انور وغیرہ جیسی شخصیات پر لکھے ہوئے خاکے اہمیت کے حامل ہیں۔ 'تنظیم کثیر رنگی' میں اور 'رنگ امتزاج' میں شاہ حسین نہری، خان شمیم اور محسن احمد وغیرہ کے بارے میں خاکے قارئین کو ان شخصیات کی حیات، خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ کرتے ہیں۔

عارف خورشید کی خاکہ نگاری کی خصوصیت یہ ہے کہ موصوف جس شخصیت پر خاکہ رقم کرتے ہیں اس شخصیت کے خصائل، عادات، خوبیوں اور خامیوں کا نقشہ اس طرح واضح کرتے ہیں کہ شخصیت قارئین کے تصور میں نمایاں ہو جاتی ہے۔ افسانہ نگاری اور افسانچہ نگاری کی طرح خاکہ نگاری میں عارف خورشید کا اسلوب بیان منفرد ہے۔

تبصرہ نگاری: عارف خورشید نے تبصرہ نگاری بھی کی ہے کتاب 'رنگ امتزاج' میں ڈاکٹر عصمت جاوید اور میر ہاشم کی اور کئی کتابوں پر تبصرے کیے اور 'وقت کے چاک پر' میں سلیم احمد کی کتاب پر تبصرہ کیا ہے۔ عارف خورشید نے کئی کتابوں پر تبصرے کیے ہیں اور اس میں مبصر کے علاوہ نقاد کے فرائض بھی انجام دیے ہیں جیسے متین قادری کے افسانوں کے مجموعے پر تحریر کردہ تبصرہ اس کی مثال ہے۔

شاعری: عارف خورشید بحیثیت شاعر بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ عارف خورشید کا شعری مجموعہ ''ٹوٹا ہوا آئینہ'' غزلوں کے علاوہ آزاد نظموں اور نثری نظموں پر مشتمل ہے۔ ''دھول کی شال'' خالص نثری نظموں کا مجموعہ ہے اور ''سوچ کے جزیرے'' عارف خورشید کی غزلوں اور ثلاثی کا مجموعہ ہے۔ اس طرح مذکورہ بالا کتابیں عارف خورشید کو قادر الکلام شاعر ثابت کرتی ہیں۔ افسانوں اور افسانچوں کی طرح عارف خورشید کی غزلوں، نظموں اور تثلیثات میں زندگی کی حقیقتوں اور صداقتوں کا پتہ چلتا ہے۔ لفظی کاریگری کے علاوہ معنی آفرینی بھی ان کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ کسی بھی تحریک سے وابستہ نہ ہوتے ہوئے روایتی اور جدت پسند شاعری کی ہے۔ ''ٹوٹا ہوا آئینہ'' میں غزلوں کے علاوہ آزاد اور نثری نظمیں ہیں۔

''سوچ کے جزیرے'' عارف خورشید کی ثلاثیوں اور غزلوں کا مجموعہ ہے، جو چھیانوے صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں دو نعتیں، ایک سو نو ثلاثیاں (تثلیثات) ہیں۔ صفحہ نمبر چھیالیس سے صفحہ چورانوے تک اڑتالیس غزلیں ہیں اور صفحہ نمبر پچانوے پر شاہ حُسین نہری کا قطعہ تاریخ ہمیں متوجہ کرتا ہے۔ عارف خورشید کی تثلیثات میں یہ تثلیث متاثر کرتی ہے. جس میں ماں کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے۔

ہے دُعا کا عکس ممتا میں
ماں ہے اس کائنات کی عظمت
ہے خدا کا عکس ممتا میں

زخم مُندمل ہونے کے بعد بھی زمانے کے ستم کی وجہ سے زخم ہرے ہو جاتے ہیں اس بات کو غزل کے اس شعر میں عارف خورشید یوں بیان کرتے ہیں۔

زخم تھا مُندمل جو عارفؔ کا
پھر سے تازہ دِکھائی دیتا ہے

جس طرح افسانوں اور خاکوں میں زندگی کی حقیقتوں کو عارف خورشید طنزیہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔اسی طرح اس تثلیث میں پارسائی کی نمائش کے بارے میں گہرا طنز کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

یہ نصیحت بھی اب نمائش ہے
ہم گنہگار ہی سہی یارو
پارسائی بھی اب نمائش ہے

درجہ ذیل ثلاثی میں کسی کی یاد کو تشبیہ اِستعارے اور تمثیل کے ذریعے عارف خورشید یوں بیان کرتے ہیں۔

یاد اس طرح تیری آتی ہے
اس پیالے میں ذہن کے جیسے
شہد کی بوند ٹپکی جاتی ہے

غم اردو شاعری کا ہی اہم موضوع ہی نہیں ہے بلکہ کئی شعرا نے غم کو زندگی کا لازمی جز قرار دیا ہے۔میرؔ، غالبؔ سے لے کر آج تک کئی شعرا نے غم کو حیات کہا ہے۔عارف خورشید بھی اس ثلاثی میں یوں کہتے ہیں:

چاہے خوشیوں کو کم سلامت رکھ
تجھ سے بس ہے یہی دعا یارب
میرے سینے میں غم سلامت رکھ

عارف خورشید نے غزل کے بارے میں لکھا ہے کہ غزل تخیل اور لفظوں کے شہد کی طرح ہوتی ہے جو دل و دماغ میں سرایت کرتی ہے۔اسے عروض کے پیمانوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ عارف خورشید کی شاعری میں زندگی کی حقیقتوں کے علاوہ جمالیاتی ذوق کے احساسات پائے جاتے

ہیں اور حالی کے مطابق تخیلات کی بلندی، مطالعہ کائنات اور رومانیت داخلیت اور عصری حسیت کا پتہ چلتا ہے۔

غزل کی داخلیت میں یاد کا موضوع اہم موضوع ہے۔''یاد'' کے موضوع پر شاعر نے مختلف انداز میں خامہ فرسائی کی ہے۔عارف خورشید محبوب کی یادوں کو گلاب کی پتیوں کے بکھرنے اور یادوں کو خوابوں کے بکھرنے سے تشبیہ دیتے ہیں۔

پتی پتی گلاب بکھرے ہیں
اس کی یادوں کے خواب بکھرے ہیں

یہ شعر رومانیت اور داخلی کیفیات کا اظہار ہے۔عارف خورشید ولیؔ کی زمین میں یہ خوبصورت مقطع کہا ہے۔

بات پہنچی ولیؔ کی عارفؔ کوں
''سنگ دل کا فراق بھاری ہے''

اس شعر میں محبوبہ کو سنگ دل قرار دے کر اور اس کے فراق کو بھاری بتا کر ولیؔ کی زبان میں شعر کہہ کر قدیم استاد شعرا کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

ولیؔ اورنگ آبادی کے بعد سراجؔ اورنگ آبادی کے طرحی مصرعے پر بھی عارف خورشید کی پوری غزل ہمیں متوجہ کرتی ہے۔

آج کے حالات، محنت کشوں، مفلسوں کی بھوک کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں۔

اجرت ملی تو دانۂ گندم گراں ہوا
تحفے میں بھوک دے کے گئیں جانفشانیاں

سراجؔ کی زمین میں عصری آگہی کو بھوک، اخلاص، محنت اور جانفشانیوں کو بیان کرتے ہیں۔ آج کل انساں نظر نہیں آتے۔انسانیت عنقا ہوگئی ہے۔اس بات کو عارف خورشید نے یوں بیان کیا ہے۔

سنتے ہیں کل کے دور میں انساں تھے بہت
تاریخ ہے اداس کہ انسان اب کہاں

عارف خورشید کی نظموں اور تثلیثات میں زندگی کے حقائق اور صداقتیں پائی جاتی ہیں۔ عصری آگہی اور عصری حسیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ☆☆☆

کیا عارف خورشید میرے لیے شجر ممنوعہ ہے

ڈاکٹر محبوب راہی

کارپوریشن لائبریری کا ثقافتی ہال اورنگ آباد ادب دوستوں، ادب نوازوں اور شائقین شعر و ادب سے کھچا کھچ بھرا ہے۔ متین قادری کی کہانیوں کے اولین (اور آخری بھی) مجموعے ''فاصلوں کا ہم نشین'' کی تقریب رونمائی ہے۔ شرکاء کی غیر معمولی تعداد صاحب کتاب کی مقبولیت اور پروگرام کی کامیابی کی پیشگی ضمانت ہے۔ صاحب کتاب اور متعلقین کے چہروں سے مسرت کی پھواریں چھوٹ رہی ہیں۔ تہنیت و تبریک، تحسین اور آفرین و ستائش کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ مبالغے کی حدوں سے گزر کر زمین و آسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں۔ اعتدال پسند حضرات قلمکار کے محض روشن مستقبل کی پیشین گوئی پر اکتفا کر رہے ہیں۔ مجھے بھی سب کچھ حسب توقع اچھا لگ رہا ہے کہ ایسی تقریبات کا انعقاد عموماً جن مقاصد کی تکمیل کے لیے کیا جاتا ہے یہاں ان کی من و عن تکمیل ہو رہی ہے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے کہ پروگرام کے اختتامی حصے میں اچانک عارف خورشید کو دعوت سخن دی جا رہی ہے۔ نام رسائل و جرائد میں موصوف کے منفرد اور تیکھے لب و لہجے والی اشاعت پذیر شعری و نثری تخلیق کے وسیلے سے خاصا جانا پہچانا ہے۔ میانہ قامت، پروقار متانت، پرشکوہ وجاہت کے ساتھ چہرے پر بشاشت کے ساتھ جھلکتی ہوئی ذہانت اور قدرے شوخی و شرارت لیے داستان سے کہانی شروع ہو کر افسانچے تک پہنچنے، کہانی کے لیے پلاٹ، کردار اور وقت و مقام کے از حد ضروری ہونے اور افسانچے کی جانچ کے لیے عنوان، موضوع، زبان و بیان، پلاٹ، مرکزی خیال، اختتامیہ اور مجموعی فنی گرفت ان سات لوازمات کے ضروری ہونے جیسے معلومات بخش کلمات سے عالمانہ انداز میں آغاز کلام کرتے ہوئے کتاب میں افسانوں کے عنوانات واوین میں لکھے جانے پر واوین کے مروجہ استعمالات کے علاوہ کسی اور استعمال سے اپنی لاعلمی کو طنزاً اپنی جہالت سے تعبیر کر رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ کتاب کا سطر در سطر جراحانہ انداز میں پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے زبان و بیان کے اغلاط، معیار کی پستی، بافت کے ڈھیلے ڈھالے پن، جمالیاتی حس کے فقدان، اظہار کی بے بسی، بیانیہ کے غیر فطری پن وغیرہ کی برجستہ

مثالیں پیش کرتے ہوئے نیز ان تمام اسقام کی موجودگی کے لیے متین قادری کے احباب کی غلط رہنمائی کو جوابدہ قرار دیتے ہوئے جس تلخ و ترش، تیکھے، نکیلے اور کٹیلے انداز میں ان پر بے خطا وار کر رہے ہیں۔ برائے اکتساب لطف یا برائے سبق آموزی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

''ایک فنکار کے سینے میں جو دل دھڑکتا ہے وہی دل متین قادری کے سینے میں بھی ہے مگر اظہار کے لیے زبان کے استعمال یا زبان سے کھیلنے کے فن سے واقف نہیں، اسی لیے ان کے احباب ان سے کھیل رہے ہیں۔''

''یہ فنکار اپنے سے کم معیار کے چند احباب کی تعریف و توصیف سے مطمئن ہیں۔''

کتاب میں در آئی اغلاط سے احباب کے صرف نظر کیے جانے پر......

''یہ چشم دید گواہ اتنے رحم دل ہیں کہ قاتل کو سزا سے بچانے کے لیے خاموش ہیں یا کوئی ایسا خدشہ لاحق تھا کہ متین قادری کی ناراضگی ان کو نقصان پہنچائے گی، یا انھوں نے جان بوجھ کر نظر انداز کیا، یا یہ منصوبہ بند طریقے سے متین قادری کو مذاق بنانا چاہتے ہیں۔''

اور افسانہ نگار کے وضاحتی طرز اظہار پر عارف خورشید کا یہ دلچسپ استعاراتی ریمارک بھی دیکھیے:

''افسانہ نگار کو تو ایک شارپ جملے میں اشارہ کر کے آگے نکل جانا چاہیے۔ اگر وہ اپنے ہی جملوں کو سمجھاتا رہے گا تو کہانی ہاتھ سے نکل جائے گی اور یہ حرافہ ایک مرتبہ ہاتھ سے نکلی تو سمجھو گئی!! نہ اسے طلاق کی ضرورت اور نہ حلالہ کی حاجت نہ نان نفقہ کا جھگڑا۔ بس حوالے ہی حوالے کبھی اِس کے کبھی اُس کے۔''

اور آخری مثال:

''کتاب کے Back پر متین قادری کی تصویر دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جن احباب نے تعریف و توصیف کے بعد فاصلوں کا ہم نشین کو منظر عام پر لانے کی بیحد جدوجہد کی متین قادری ان کی خاموش رہنمائی کا کرب جھیل رہے ہیں۔''

محفل کا رنگ بدل گیا ہے بلکہ اڑ گیا ہے کہنا زیادہ مناسب ہے۔ ان اچانک اور غیر متوقع جارحانہ جملوں نے متعلقین پر گویا سکتہ طاری کر دیا ہے۔ خود میں بھی دم بخود ایک ایک چہرہ دیکھ رہا ہوں۔ متین قادری غم وغصہ کے مارے سرخ اور پسینہ میں شرابور ہو رہے ہیں۔ عظیم راہی ان کے دل کے مریض ہونے پر تشویش ظاہر کر رہے ہیں۔

متین قادری کا دل بیمار تو خیر سے یہ جھٹکے برداشت کر گیا لیکن صحت مند ذہن بر سر محفل ہونے والی اپنی اس ہتک کو سہن نہیں کر پایا۔ لہٰذا ردعمل کے طور پر متین قادری نے اپنی نو بیاہتا تخلیق ادب کو تین طلاق دے کر نکال گھر باہر کیا۔ نتیجتاً ہندوستان بھر سے جاری کردہ کم وبیش چھوٹے بڑے اردو رسائل موصوف کی اعانت سے محروم ہو گئے۔ آئے دن انعقاد پذیر جن ادبی ہنگاموں پہ ان کے گھر رونق موقوف تھی وہ سب یکلخت کالعدم ہو کر رہ گئے۔ چونکہ یہ سارا کچھ وقوعہ میرے خود ساختہ ادبی موقف یا زاویۂ نقد ونظر کے قطعی خلاف ہوا کہ میں اردو شعروادب کے رواں دواں بہاؤ میں خارج ہونے والی اس قسم کی غیر ضروری جارحانہ اور منفی تنقید کو قطعی غیر مناسب سمجھتے ہوئے ناقدانہ فیصلوں میں بڑی حد تک مروتوں کی گنجائش کا اور معیارات کے ناپ تول اور کھرے کھوٹے قطعی فیصلوں کو آنے والے وقت کے حوالے کرنے کا قائل ہوں۔ ممکن ہے یہی وجہ رہی ہو میرے عارف خورشید کے کثیر الجہات اور قابل قدر ادبی کارناموں کی، کسی جہت پر تا ہنوز کچھ نہ لکھنے کی لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ مجھے (سوائے دخل در معقولات کے) موصوف کی کسی تحریر میں کوئی فنی سقم، فکری ٹیڑھ یا غیر ادب جیسا کچھ نظر آیا ہو۔ موصوف کی متذکرہ بالا تحریر بھلے ہی میرے ادبی موقف کی نفی کرتی ہو لیکن اس کی اور اس کے علاوہ ان کے دیگر جتنے بھی مضامین میری نظروں سے گزر چکے ہیں ہر سطر اور ہر جملے میں رواں دواں تنقیدی بصارت اور بصیرت کے سرچشموں، ادبیت کی چاشنی، علمیت کی گہرائی وگیرائی، زبان کی شگفتگی، بیان کی طرفگی، محاوروں کی برجستگی، تشبیہات واستعارات کی مرصع کاری اور بالخصوص طنز کی کاٹ اور مزاح کے چٹخارے جیسے فنی اوصاف سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا، ایسی صورت میں طنز خود میرے ہاں میری ہر تحریر میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھنے کی بناء پر طنزیہ اسلوب خود مجھے بے حد مرغوب بھی ہے اور محبوب بھی۔ تو کیا عارف خورشید پر میرے کچھ نہ لکھنے کا سبب ان کی بیشتر کہانیوں میں جنسیت کا...... بیباکانہ اور بے حجابانہ اظہار ہو سکتا ہے کہ مجھے ان باتوں کی پردہ دری بوجوہ مناسب نہیں لگتی، جن کی پردہ پوشی خود فطرت

کرنا چاہتی ہے۔ایک زمانے میں بالغوں کو دکھائی جانے والی فلم میں جذبات کو مشتعل اور احساسات کو برانگیختہ کرنے والا کوئی منظر واضح طور پر دکھلانے کے بجائے محض چند ثانیوں کے لیے روشن گل کر دی جاتی تھی۔گھپ اندھیرے میں کیا ہو رہا ہے ہر بالغ اپنی باطنی بالغ نظری کے وسیلے سے سب کچھ دیکھ لیتا سب کچھ سمجھ لیتا تھا۔

عارف خورشید کی فلموں (افسانچوں) کا محض ایک منظر ملاحظہ کیجیے۔

''شاہ رخ دس پندرہ حسیناؤں کے ساتھ ناچ رہا تھا۔

ان کے جسم پر برائے نام جانگیہ اور چولی تھی۔''

مولانا نے آنکھیں بند کر لیں ''انشاءاللہ میں بھی حوروں کے ساتھ'' (حور)

مذہبی شخصیات اور عقائد پر یہ سیدھا حملہ لطف اندوزی کے باوصف میری ناگواری کا سبب ہو سکتا ہے لیکن اس حد تک بھی نہیں کہ مجھے عارف خورشید کے ان فنی کمالات اور ان کی عالمانہ ہنرمندیوں پر اظہار خیال سے یکسر روک دے جن کا فکشن کے کئی معتبر اور موٴخر ارباب نقد و بصیرت کھل کر اعتراف کر چکے ہیں۔(مثالیں پیش کرنے سے دانستہ گریز کر رہا ہوں)

ویسے چند مختلف کتابوں پر تحریر کردہ عارف خورشید کے جو تبصرے میرے مطالعے میں آئے ہیں ان کی جارحیت اور تبصرہ نگاری میں اپنے بامروت اور حوصلہ افزاء موقف کی بناء پر مجھے باز رکھنے کا موجب ہو سکتے ہیں باوجود اس کے کہ موصوف میرے ساتھ غالباً مروت برتتے ہوئے تا حال میری کسی بھی کتاب پر تبصرہ کرنے سے گریزاں رہے۔لہٰذا اب بھی میرے نہ لکھنے کی وجہ پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک عارف خورشید کی شاعری کا معاملہ ہے موصوف کی پندرہ مطبوعات کی دستیاب فہرست میں تین شعری مجموعوں ''ٹوٹا ہوا آئینہ''، ''دھول کی شال'' اور ''سوچ کے جزیرے'' کے علاوہ تین شاعروں کا مشترکہ شعری مجموعہ ''لمحوں کی صلیب'' کے نام شامل ہیں۔(بشمول تین افسانہ نگاروں اور تین افسانچہ نگاروں کے مشترکہ مجموعوں کے) شعری تصانیف میں مجھے صرف ''سوچ کے جزیرے'' مل پایا ہے لہٰذا حتمی طور پر بتا نہیں سکتا کہ عارف خورشید کی شاعری میرے ان پر نہ لکھنے کے فیصلے پر کس حد تک اثر انداز ہوئی جبکہ دستیاب کلام کی روشنی میں موصوف کی انفرادیت پسندی، لہجے کی صلابت، رنگ و آہنگ کی ندرت کے ساتھ فنی رکھ رکھاؤ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اب رہ جاتی ہے خاکہ نگاری جس میں عارف خورشید کو یدطولیٰ حاصل ہے اور جو انھیں دیگر قلمکاروں کے اژدہام میں ایک ممتاز و ممیز مقام و مرتبہ عطا کرنے کا موجب ہے اس موضوع پر مجھے یقیناً کچھ ملنا چاہیے تھا۔ لاکھ یہاں بھی ان کی اظہار کی بیباکی جب کسی کا خاکہ اڑانے آتی ہے تو کسی قسم کی مصلحت ان کا قلم نہیں روک پاتی اور وہ بیباکانہ، بے حجابانہ اور کبھی کبھی بے مروتانہ انداز میں اپنے قلم کی زد پر آنے والی شخصیت کے خاکے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ممکن ہے میرے لاشعور کے خوف و اندیشے نے مجھے عارف خورشید کے منفی انداز فکر و نظر پر رائے زنی سے باز رکھا ہو کہ کہیں جوابی ردعمل میں مجھے ہدف بنا کر میرا خاکہ اڑانے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ ظاہر ہے یہ میرا محض وہم ہو سکتا ہے قطعی اور حتمی وجہ نہیں کہ ان خاکوں میں انداز تحریر کی شگفتگی، دلکشی اور دلربائی کچھ اس درجہ ہوئی ہے کہ صاحب خاکہ اپنی ہیئت کذائی پر آگ بگولہ ہونے یا چڑنے کی بجائے، گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا کے مصداق خود بھی ہنس پڑے یا کم از کم زیر لب مسکرا کر رہ جائے۔

پھر آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے عارف خورشید جیسے جاندار و شاندار، ہمہ رنگ اور ہم صفات و ہمہ جہات قلمکار پر میری خامہ فرسائی نہ کرنے کی بالخصوص اس تناظر میں کہ خالق حقیقی نے مجھے ہر موضوع پر ادب تخلیق کرنے کی حسب مقدور استطاعت عطا کر رکھی ہے جس کو مسلسل بروئے کار لاتے ہوئے ہر اُس موضوع اور ہر اُس شخص پر لکھنے سے قطعی گریز نہیں کیا جو اتفاقاً میری قلم کی زد میں آ گیا۔ نتیجتاً بے شمار مضامین انبار در انبار میری الماریوں میں جمع ہو گئے۔ انھیں ٹھکانے لگانے بیٹھا تو چار مجموعہ جات میں تقریباً ایک سو مضامین کام آ گئے۔ کم و بیش اتنے ہی اپنی باری کے منتظر ہیں۔

ایسے میں کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی جسے عارف خورشید پر نہ لکھنے کا جواز قرار دے سکوں۔
اب جو ادارۂ عالمگیر ادب کے اراکین اسلم مرزا اور سحر سعیدی پر کتابی سلسلہ عالمگیر ادب کے دستاویزی نوعیت کے دو شمارے منظر عام پر آ جانے کے بعد عارف خورشید پر شمارہ ترتیب دینے کی باری آئی تو بالخصوص ڈاکٹر عظیم راہی کے اصرار پر اللہ اللہ کر کے گذشتہ برس جبراً و قہراً طبیعت کو کچھ لکھنے پر آمادہ کیا تو اچانک عارضۂ قلب میں مبتلا ہو کر مہینوں صاحب فراش رہا۔ قدرے افاقہ ہوا تو گزشتہ چار ماہ سے Herpis (ناگن) نامی انتہائی تکلیف دہ مرض کے شکنجے میں گرفتار ہو کر ایک آنکھ ضائع کر کے، دوسری پر صبر شکر کیے بیٹھا ہوں۔ عارف صاحب کی عنایت کردہ ان کی اپنی محض دو کتابیں ''رنگ امتزاج'' اور

''وقت کے چاک پر'' میری لائبریری میں تھیں۔ میرے مطالبے کی تکمیل کرتے ہوئے عظیم راہی نے اپنی ذاتی لائبریری سے موصوف کی چار تصانیف ''تنظیم کثیر رنگی''، ''قافلے والو سچ کہنا''، ''اور کچھ بھی نہیں کہانی میں'' اور ''سوچ کے جزیرے'' مجھے بذریعہ رجسٹری ڈاک ارسال کیے۔ اسے بھی عذر لنگ کے علاوہ کوئی معقول جواز قرار نہیں دیا جاسکتا، اگر میں عرض کروں کہ عارف خورشید کی جملہ پندرہ مطبوعات میں سے صرف چھ کی روشنی میں مضمون لکھا جانا ناممکن یا مشکل ہے جبکہ ماقبل کئی ایسے قلمکاروں پر بھی طول طویل مقالے لکھ چکا ہوں جن کی ایک بھی کتاب شائع ہیں ہوئی یا اگر ہوئی بھی ہو تو مجھے حاصل نہ ہوسکی۔

ثابت ہوا کہ عارف خورشید، گلستان شعروادب کا یہ سدا بہار شجر ثمر بار میرے لیے شجر ممنوعہ ہرگز نہیں ہے اور یہ کہ میرے اس پر نہ لکھنے کی کوئی معقول یا نامعقول وجہ میرے علم وادراک میں نہیں ہے۔ اگر کوئی وجہ ہوگی بھی تو اس کے انکشاف اور ایک طویل مفصل اور...... مضمون کی تکمیل میں کوئی حدِ فاصل نہیں رہے گی۔ انشاءاللہ

☆☆☆
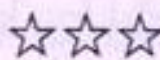
عارف خورشید کی ثلاثیاں

مختار ٹونکی

موجودہ دور کی شعریات کا اگر جائزہ لیا جائے تو بخوبی واضح ہوگا کے اردو شعرا پر ان دنوں سہ مصرعی اصناف کا جادو سر چڑ کر بول رہا ہے۔ کچھ شعرا جاپانی اصفاف سخن ہائیکو اور سین ریو پر زور سخن صرف کررہے ہیں تو کچھ سخنور پنجابی ماہیا کے ذریعے اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کررہے ہیں۔ ایک طرف ترویني نے آکر اپنے شعری پاؤں پسار رکھے ہیں تو دوسری طرف ثلاثی نے دھوم مچارکھی ہے۔ سہ مصرعی نظمیں بھی منظر عام پر آرہی ہیں مگر اس طرح کی تمام اضاف سخن میں ''ثلاثی'' کو یک گونہ اہمیت حاصل ہے۔ تین مصرعوں کی اس مختصر اکائی میں پہلا اور تیسرا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے اور تینوں مصرعے ایک بحر کے پابند ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ'' ثلاثی ایسی تین مصرعوں والی صنف ہے جس کا کوئی بھی ایک مصرع حذف کرنے پر فکر میں عدم تکمیل کا احساس ہو اور جو بحر خفیف مسدس فاعلاتن مفاعِلن فَعِلن۔ فَعْلُن فعلان فعلان پر وزن میں لکھی جائے اور جس میں قافیہ بندی کا التزام الف ب الف ہو۔''

تاریخی اعتبار سے ثلاثی اور اورنگ آباد لازم وملزوم نظر آتے ہیں۔ عارف خورشید ثلاثی کے اسی خوبصورت سلسلے کی ایک اہم کڑی ہیں جنھوں نے ''سوچ کے جزیرے'' میں اس صنف سخن کا کماحقہ' حق ادا کیا ہے۔

عارف خورشید ویسے تو دنیائے شعر ادب میں اچھی طرح معروف ومتعارف ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ ناول نویس ہیں اور تبصرہ وخاکہ نگار بھی۔ مختلف موضوعات اور جہات میں ان کی ایک درجن سے زیادہ تصانیف منظر عام پر آکر مقبول ہو چکی ہیں، وہ ایک ایسے قلم کار ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو شعر وادب کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ ''سوچ کے جزیرے'' شعری مجموعے میں ثلاثی کا معتد بہ حصہ قاری کی توجہ اس امر کی جانب منعطف کرتا ہے کہ اس صنف پر ان کی گرفت ہے اور طبع آزمائی میں وہ بہر صورت کامیاب نظر آتے ہیں۔

عارف خورشید نے اسی خیال کو مدنظر رکھ کر ثلاثی سے اپنا رشتہ جوڑا ہے اور تین مصرعوں میں ایک مکمل خیال کو منظوم کیا ہے۔ لیکن حمایت علی شاعر کی طرح وہ ثلاثی کو کسی بھی بحر میں کہنے کے روادار نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنی سبھی ثلاثیاں مذکور الصدر بحر میں کہی ہیں۔ ان کی ثلاثیوں کی خوبی یہی ہے کے وہ تینوں مصرعے خیال کے پابند کر دیتے ہیں کسی بھی ایک مصرعے کو اگر اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو نفسِ مضمون کالعدم ہو جائے گا اور خیال کا بھی فقدان نظر آئے گا۔ اس ضمن میں چند ثلاثی ملاحظہ ہوں۔

ہے عجب اپنے آپ سے دوری
جستجو میں ہیں ہم ہرن کی طرح
اپنے اندر ہے اپنی کستوری

اپنی فطرت ہی مضطرب ٹھہری
پیاس آنکھوں میں ہے بہت لیکن
سوچ ساگر سے بھی ہے کچھ گہری

کب وہ احساں کسی کا لیتا ہے
پیڑ جلتا ہے سوکھ جانے پر
سبز جب تک ہے چھاؤں دیتا ہے

ٹھوکروں نے ہمیں سنبھالا ہے
کس کو خطرات سے ڈراتے ہو
ہم کو خود حادثوں نے پالا ہے

عارف خورشید کی ثلاثیاں مختلف النوع موضوعات اور کیفیات کے حامل ہیں اور غزلوں کے شعروں کی طرح لطف و سرور سے ہم آغوش کرتی ہیں۔ اگر ان کے ثلاثیاں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو ان میں غزل گو شعراء جیسی کلاسیکیت، داخلیت اور رومانیت کا حسین امتزاج ملے گا۔ انھوں نے جیسا کچھ مشاہدہ کیا اور بذات خود محسوس کیا، انھیں محسوسات اور مدرکات کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ بلاشبہ وہ ثلاثی کے آرٹ اور کرافٹ سے واقف ہیں۔ ان کا تخلیقی شعور اور فنی بالیدگی کا ظہور جا بجا دیکھا

جاسکتا ہے۔جذبہ واحساس کے ساتھ جب فکر آفرینی عود کر آتی ہے تو شراب دو آتشہ کا مزا دیتی ہے۔ عارف خورشید کو شعر کہنے کا سلیقہ ہے اور وہ جہاں ''حسنِ بیان'' پر توجہ دیتے ہیں وہیں ''حسن معنی'' سے بھی بے اعتنائی نہیں برتتے۔خیال اور معنی کی کئی جہتیں روشن کرنے والے یہ ثلاثیاں بغور دیکھیں:

ہے دعا کا بھی عکس ممتا میں
ماں ہے اس کائنات کی عظمت
ہے خُدا کا بھی عکس ممتا میں

پتے شاخوں پہ ساتھ رہتے ہیں
ہم سے پہلے نہ ٹوٹ کر گرنا
سب یہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں

کیا بتائیں تمھیں کہ کیسے تھے
ریزہ ریزہ بکھر گئے ورنہ
ہم بھی ایک دن چٹان جیسے تھے

فکر کو اپنی پاش کرتا ہوں
مل رہے ہیں جہاں زمین و فلک
میں کسی کو تلاش کرتا ہوں

لفظ کو وار سے نہ کم سمجھو
میرے ہاتھوں میں ہے قلم دیکھو
اسکو تلوار سے نہ کم سمجھو

موت پُر جوش ہوتی جاتی ہے
روئیں اعمال سسکیاں لے کر
نبض خاموش ہوتی جاتی ہے

عارف خورشید کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ اظہارِ خیال میں کسی طرح کی پیچیدگی پسند نہیں کرتے۔اپنے طرز بیان میں وہ اظہار کو ابہام نہیں بناتے بلکہ سلیس انداز میں اپنے مطمح نظر کو واضح کر دیتے ہیں۔ترسیل ان کے لیے کوئی دقت نہیں ہے۔ان کی ایک غزل کا مقطع ہے:

یہ جان کر بھی کہ مضمون تازہ بند ہوا
یہ عارف اپنا ہے دل کی کتاب کھولے گا

ثلاثیوں میں بھی انھوں نے دل کی کتاب کھولی ہے۔سیدھی سادی زبان اور ہلکے پھلکے شیریں لفظوں میں وہ اپنے تخلیقی بصیرت کے جادو اور شاعرانہ مخاطب کے خوشگوار پہلو سے دلی کیفیت اور قلبی واردات کو ثلاثی کے پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔جمالیاتی ثلاثی میں انھوں نے قلزم فکر کے موتیوں کو جذبہ واحساس کے صاف و شفاف پانی میں اس طرح دھویا ہے کہ ان کی چمک دمک ذہن ودل کو بھی جگمگا دیتی ہے۔مستزاد یہ کہ ان کی انفرادیت سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔اپنی شاعرانہ مہارتِ فن سے انھوں نے ثلاثیوں کو حد درجہ خوبصورت بنا دیا ہے۔مندرجہ ذیل ثلاثیوں کی دل آویزی اور دیدہ زیبی ملاحظہ کریں:

یاد اس طرح تیری آتی ہے
اس پیالے میں ذہن کے جیسے
شہد کی بوند ٹپکی جاتی ہے

کرب کی دھوپ ہے زمانے میں
چند لمحے کہ میں ٹھہر جاؤں
تیری پلکوں کے شامیانے میں

سطح پر جھیل کی ہے حسن محل
بھیج کوئی سکون کا پیغام
جل پری بن کے پانیوں سے نکل

عہد ماضی نچوڑ کر دیکھا
تیری زلفوں کی یاد میں ہم نے
پھول ہر روز توڑ کر دیکھا

جب بھی اس سے نگاہ ملتی ہے
کھلنے لگتے ہیں بس کنول دل کے
مجھ کو پانی میں راہ ملتی ہے

ڈالی ڈالی یہ پھول کھلتے ہیں
دیکھ کر شرم اس کو آتی ہے
جب بھی بھنورے گلوں سے ملتے ہیں

کوئی سیاحت پسند قاری اگر ''سوچ کے جزیرے'' میں جا کر گلگشت کرے تو اس قسم کی ثلاثیاں اُسے جا بجا بکھرے ملیں گا اور اس کی مشامِ جاں کو معطر کریں گی۔ ایک جگہ انھوں نے کہا ہے کہ:

آج تک شاعری سے کیا پایا
چند غزلیں ثلاثیاں قطعات
عمر بھر کا یہی ہے سرمایہ

لاریب یہ سرمایۂ سخن ایک دولتِ وافر کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے ثلاثی جیسی صنفِ سخن کو جو تابانیاں بخشی ہیں یقیناً اس سے خزینۂ شاعری میں بھی زبردست اضافہ ہوا ہے۔ انھوں نے حمایت علی شاعرؔ اور قمر اقبالؔ کی کاوشوں کو زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ علامہ اقبالؔ کے لفظوں میں کہہ دوں کہ:

گماں بر کہ بپایاں رسید کارِ مغان
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

☆☆☆

لفظوں کی جادوگری جگانے والا فنکار

معین الدین عثمانی

سرزمین اورنگ آباد تاریخی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ ادبی اعتبار سے بھی اس کا اپنا ایک مقام ہے۔ تعلیم وتہذیب اور ثقافت کے ساتھ ادب بھی اسے ورثہ میں میسر آیا جس کی آبیاری آج بھی جاری ہے۔ ولؔی اور سراؔج کی ادبی روایتوں کی پاسداری کرنے والوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ کئی نام ایسے ہیں جن کے نقوش سے ادبی خزانہ لبریز ہے۔ ادب کا کون سا میدان ہے جہاں پر ان ہستیوں کی چھاپ نظر نہیں آتی۔ موجودہ فن کاروں کی اس بھیڑ میں ایک نمایاں نام عارف خورشید کا بھی ہے جو ہر فن مولا کی طرح اقلیم ادب میں وارد ہوئے اور ادب کی معروف اصناف میں طبع آزمائی کر کے اپنی قلم کاری کے جھنڈے گاڑ دیے ہیں۔

شاعری سے متعلق جب بھی تذکرہ ہوگا عارف خورشید کی غزلیات اور تثلیثات کی گفتگو ناگزیر ہوگی۔ گمان غالب ہے کہ تثلیثات کا خمیر سرزمین دکن سے اٹھا ہے اور آج یہ ادب کی مقبول صنف سخن کے طور پر تسلیم کر لی گئی ہے۔ اس بساط ادب پر پیر جمانے میں عارف خورشید نے جو نمایاں کارکردگی انجام دی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ خاکہ نگاری میں بھی عارف خورشید نے اپنے قلم کے جوہر دکھلائے ہیں۔ خاکہ نگاری ادب کی معروف صنف ہے۔ اس میں طبع آزمائی ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ شخصیت کو پیش کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ انسان اچھائی اور برائی کا مرقع ہوتا ہے۔ قاضی سلیم اور حمید سہروردی کے خاکوں کے مطالعہ سے ہر دو حضرات کی تصویر کشی اس طرح ہوئی ہے، مانو صاحب خاکہ ہمارے سامنے بیٹھے اپنی آپ بیتی ہمارے گوش گزار کر رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

”قاضی سلیم شاعری کی وجہ سے وکالت نہیں کر سکے۔ منسٹری نہیں ملی۔
اندرا گاندھی نے غالباً یہ سوچ کر کہ شاعر ہے اسے کیا منسٹر بنائیں،
نظر انداز کیا۔

اپنے بارے میں ایک دن انھوں نے کہا۔ وکالت نہیں کر سکا اس لیے
ابا جان نے خاندان بھر میں مجھے نالائق ٹھہرایا۔ اس نالائقی کے لیبل کو
ہٹانے کے لیے سیاست میں داخل ہوا تو گھر میں عزت ہوئی۔ شاعری کی
وجہ سے Nomination ہوا تھا اس لیے ابا جان نے میری شاعری پر
اعتراض کرنا بند کر دیا اور سمجھا کہ شاعری سے بھی فائدہ ہو سکتا ہے۔"

حمید سہروردی سے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

"ان کی شخصیت میں یہ کمال میں نے محسوس کیا کہ میں جتنی بار ملا ملنے کی
خواہش اور بڑھی۔ میں بار بار ملنے کے باوجود ملنے کی خواہش رکھتا ہوں۔
آپ بھی ملیے اور فیصلہ کیجیے کہ جو کچھ میں نے کہا وہ صحیح ہے یا غلط ہے۔"

یہ اور اس قبیل کا انداز تحریر ظاہر کرتا ہے کہ وہ بات کو گھما پھرا کر کہنے کے قائل نہیں۔ ان کا بیباکانہ اندازِ تحریر قاری سے قریب تو کر دیتا ہے مگر متعلقہ شخصیت کے ناراض ہونے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ مصلحت پسندی سے دور دوٹوک بیانیہ کا ان کا یہ انداز انھیں اوروں سے الگ کرنے کے لیے کافی ہے۔ ظاہری بات ہے کہ تبصرہ نگاری کا باب بھی ان عناصر سے خالی کیونکر رہ سکتا ہے۔ سلیم احمد کا افسانوی مجموعہ "اندھے سفر کا مسافر" کو جب ان کی عینک گزیدہ آنکھوں نے گھور کر دیکھا تھا تو بے چارہ وہ مسافر بینا سفر سے بھی باز آ گیا ہوگا۔ عارف خورشید کے اس بیان سے شاید ہی کوئی کافر بھی انکار کر سکتا ہے۔

"افسانہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔ اکثر افسانہ نگاروں کے زعم سے میں
پوچھنا چاہتا ہوں۔ عورت کے لیے لڑکا پیدا کرنا مشکل اور لڑکی پیدا کرنا
آسان کیسے ہو سکتا ہے۔ افسانہ نگار ہے تو افسانہ اس کے لیے مشکل کیسے ہوا
اور شاعر ہے تو شاعری آسان کیسے ہوئی؟ فن کار کے لیے اس کا فن مشکل
نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کے لیے مشکلیں پیدا کر دیتا ہے۔"

تبصرہ نگاری سے متعلق یہ فہم روا ہے کہ محاسن اور معائب کی نشاندہی کرنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ صادر کیا جائے۔ مگر ان دنوں قارئین کا مزاج ہی بدل گیا ہے، محاسن کی طرف دیکھنے کی کسے فرصت

ہے۔ معائب کو اچھالنا ہنر مندی کہلانے لگی ہے۔ بہر حال عارف خورشید نے خلوص دل سے اپنے موقف کو اپنے انداز سے واضح کیا ہے، جو بڑی بات ہے۔

مقام مسرت ہے کہ ڈاکٹر عظیم راہی کی پروردہ صنف افسانچہ میں عارف خورشید کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ حالانکہ یہ صنف ابھی پوری طرح سے ردّ و قبولیت کی سرحد کو عبور نہیں کر سکی ہے۔ مگر آج کی بھاگتی دوڑتی مشینی زندگی نے اسے ایک درجہ دوام عطا کیا ہے، جس کے سبب اس بونشرائے کی شاخوں پر جگہ جگہ پرندے چہچہانے لگے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ادب کی آندھی کب تک یہ شور و غوغا برداشت کرتی ہے۔ اگر اتفاق سے طوفان آ کر خیریت سے گزر جائے تو پھر افسانچے پر بہار ہی بہار ہوگی اور خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

عارف خورشید نے جس طرح ثلاثی میں اپنے جوہر دکھلائے اسی طرح افسانچہ بھی ان گہری سوچ اور وسعت نظری کا مظہر ہے۔ اختصار، اختصاص، اجمال، لفظی دروبست کے ساتھ فنی لوازمات کی ہر جگہ عرق ریزی اس طرح دکھائی دیتی ہے کہ افسانچہ افسانچہ ہی رہا۔ رپورٹ، خبر، نثری نظم سے کوسوں دور۔

بطور تمثیل ملاحظہ فرمایئے:

بری عادتیں

اس نے پہلے شراب چھوڑی۔ پھر جوا چھوڑا۔ گانجا چھوڑا۔ سگریٹ چھوڑی پھر پان چھوڑا اور سوچنے لگا اب چھوڑنے کو کیا بچا ہے۔ اس کی نظر سامنے رکھے ہوئے گلوب پر پڑی۔"

افسانوی ادب میں جنس عارف خورشید کا پسندیدہ موضوع ہے۔ حالانکہ جنس پر طبع آزمائی کرنے پر منٹو کا جو حشر ہوا وہ اظہر من الشمس ہے۔ شموئل احمد بھی اسی راہ کے مسافر ہیں۔ چونکہ جنسیات بھی زندگی کا اٹوٹ حصہ ہے اس لیے اس سے فرار ناممکن ہے۔ مذہبی صحائف اس سے متعلق راہ نمائی سے بھرے پڑے ہیں۔ سنجیدگی سے غور فرمائیں تو سارا معاملہ سمجھ میں آسکتا ہے۔ منٹو کے تعلق سے سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی۔ اس نے معاشرے کی عکاسی کی تھی۔ سماج کی ترجمانی کی تھی۔ ادب میں غلاظت نظر کے دھوکے سے آتی ہے۔ معاشرہ ستھرا ہو جائے تو ادب بھی نکھرا ہوا تخلیق ہوگا۔ جنس شجر ممنوعہ ہرگز نہیں

ہے۔ مگر معاشرہ کی عائد کردہ پابندیاں بھی ضروری ہیں ۔ اگر ادب پڑھنے والا ہی فحش زدگی کے الزام میں تحریر کورد کردے تو تخلیق بے معنی ہو جاتی ہے۔

افسانہ نگاری عارف خورشید کا میدان خاص ہے۔ انھوں نے جنسیات کو برتا ہے۔ مگر لکشمن ریکھا کو پار نہیں کیا ہے۔ جس کے سبب ان کی تحریریں اپنے آپ کو پڑھوانے میں کامیاب رہی ہیں۔

''دن اور رات، رات اور دن ایک دوسرے سے اس قدر لپٹے ہوئے تھے کہ رات بیزار ہوگئی تھی اور دن کے چہرے پر نور تھا۔ دن جتنا تھکتا اتنا تروتازہ نظر آتا۔ رات جتنی سوتی اتنی تھکن سے چور ہوتی۔'' (شجر ممنوعہ)

''اندھیرا زار وقطار رو رہا تھا۔ زمین کے ذرے ذرے سے پھوٹتی روشنی اس کے اندر سرایت کر رہی تھی۔ کمرے میں کسی کا تصور اس کے اطراف سایہ بن کر منڈلا رہا تھا۔ (داستان مرکب ہے)

انسانی زندگی بے پناہ مسائل سے عبارت ہے۔ دیکھنے والی آنکھیں ان دیکھی چیزوں میں بھی افسانے کا موضوع تلاش کر لیتی ہیں۔ ویسے ان کے یہاں افسانوی لوازمات کا استعمال بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ زبان وبیان کی باریکیوں سے وہ خوب واقف ہیں۔ موضوع کا حق بھی ادا ہوتا ہے۔

☆☆☆

ست رنگی شخصیت

ملک بزمی

عارف خورشید گزشتہ زائد از تین دہائیوں سے ادبی سفر میں مسلسل رواں دواں ہیں۔ نظم ونثر اوراس میں بھی مختلف اصناف سخن کے وہ ایسے راہی ہیں جن سے ادب کا ہر قاری پوری طرح واقف وآگاہ ہے۔ جتنے رنگ اور شیڈ ان کے قلم سے نکلتے ہیں، اس سے یوں لگتا ہے کہ وہ ہر میدان میں کامیاب ہیں اور اتنے مختصر عرصے میں بھی ان کی خاصی کتابیں لائبریریوں اور باذوق قارئین کے خزانے کی زینت بن چکی ہیں۔ یہاں ہم ان کی شائع شدہ کتابوں کی فہرست دے رہے ہیں۔ وہ نہ صرف افسانہ نگار ہیں بلکہ ناول نگار، افسانچہ نگار، مبصر، ناقد، شاعر اور اب ناشر و مدیر بھی ہیں۔

۱)	ٹوٹا ہوا آئینہ	(شعری مجموعہ)
۲)	دھول کی شال	(شعری مجموعہ)
۳)	سوچ کے جزیرے	(ثلاثیاں اور غزلیں)

افسانوی مجموعے:

۱)	سنہری رُت کا فریب	(افسانوں کا مجموعہ)
۲)	یادوں کے سائباں	(افسانچوں کا مجموعہ)
۳)	آتشیں لمحوں میں	(افسانچوں کا مجموعہ)
۴)	احساس کا زخمی مجسمہ	(افسانوں کا مجموعہ)
۵)	قافلے والو سچ کہنا	(افسانوں کا مجموعہ)
۶)	اور کچھ بھی نہیں کہانی میں	(افسانچوں کا مجموعہ)
۷)	تنظیم کثیر رنگی	(خاکے)
۸)	رنگِ امتزاج	(تبصرے اور خاکے)
۹)	لہو لہو آرزو	(ناولٹ)

مختلف کتابیں:

۱) لمحوں کی صلیب (تین شاعروں کے کلام کا مجموعہ)

۲) یہ شام بھی کہاں ہوئی (تین فن کاروں کے افسانوں کا مجموعہ)

۳) آنکھوں کی زبان (تین فن کاروں کے افسانوں کا مجموعہ)

۴) وقت کے چاک پر (افسانے، تبصرہ، خاکے اور افسانچے)

اور

سب سے اہم کتابی سلسلہ۔عالمگیر ادب۔بحیثیت مدیر

(۱) اسلم مرزا۔فن اور شخصیت جولائی ۲۰۱۱ء

(۲) ڈاکٹر سحر سعیدی۔فن اور شخصیت جنوری ۲۰۱۲ء

مخدوم محی الدین نے کہا تھا۔

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

عارف خورشید مخدوم کے مذکورہ بالا شعر پر پوری طرح کاربند ہیں۔چنانچہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر انھوں نے ''لمحوں کی صلیب'' (تین شاعروں کا شعری مجموعہ) ترتیب دیا۔اسی طرح ''یہ شام بھی کہاں ہوئی''۔تین فن کاروں کے افسانوں کا مجموعہ اور پھر تین افسانچہ نگاروں کا مجموعہ ''آنکھوں کی زبان'' ترتیب دیا۔

عارف خورشید نے جو بھی لکھا، جب بھی لکھا، پوری محنت اور دیانتداری سے لکھا۔جو دیکھا، جو محسوس کیا اسے الفاظ کا جامہ پہنا کر قارئین اور سامعین کے روبرو پیش کر دیا۔لوگ کیا کہیں گے؟ ان کا ردعمل کیا ہوگا؟ اس کے چکر میں وہ کبھی نہیں الجھے۔ایک سچے فن کار کی طرح بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنی شاعری کے حوالے سے یا نثر کے پہلو سے انھوں نے صحت مند ادب کی تخلیق کو اولیت دی۔

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

اور مجروح سلطانپوری کے ہی اس دوسرے شعر کی مانند وہ منزل کی طرف گامزن رہے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

چنانچہ ان کے اس کارواں میں جہاں اسلم مرزا، شاہ حسین نہری، ڈاکٹر سحر سعیدی، نورالحسنین ، ڈاکٹر عظیم راہی، قاضی رئیس اور ساحر کلیم۔ نہ صرف شامل ہوئے بلکہ ان لوگوں کو لے کر عارف خورشید نے ایک گروپ بھی ''عالمگیرادب'' سے قائم کردیا۔ افسوس کہ چند ماہ قبل قاضی رئیس انتقال کر گئے۔ اللہ انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

اردو ادب از اول تا ایں دم ترقی کی اونچائیاں سر کر رہا ہے، مگر ہمارے ہی چند ناعاقبت، بزعم خود اپنے آپ کو میرو غالب کے ہم پلہ گرداننے والے، خود کو اردو کا باوا آدم کہنے والے ہی دراصل اردو کو نچلی سطح تک پہنچانے کے ذمہ دار ہیں۔ ایسے ہی نام نہاد ''اردو والوں'' سے بزبان سرشار سیلانی۔ عارف خورشید کہتے ہیں:

اندھیری رات، طوفانی ہوا، ٹوٹی ہوئی کشتی
یہی اسباب کیا کم تھے کہ اس پر ناخدا تم ہو

پتہ نہیں درج ذیل شعر کس شاعر کا ہے اس نے اسے کس تناظر میں کہا تھا۔ مگر ہم تو اسے اردو کے لیے استعمال کریں گے۔

یا ترا تذکرہ کرے ہر شخص
یا کوئی ہم سے گفتگو نہ کرے

ان دنوں مختلف رسائل ادبی شخصیات پر گوشے ترتیب دے رہے ہیں اور اردو ادب کی خدمت اور ترقی و ترویج کا غلغلہ بلند کر کے اپنی جھولیاں بھر رہے ہیں۔ جبکہ اس سلسلے میں ہلکی پھلکی شخصیات کی بے نام اچھائیاں اور خوبیاں گنوا کر انھیں مصنوعی ہیروشپ سے نوازا جا رہا ہے۔ عارف خورشید نے اپنے ساتوں ساتھیوں سے مشورہ کر کے 'عالمگیرادب' کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے اپنے دوستوں کو ہی جو خیر سے اردو کے سچے عاشق و شیدا ہیں، جن کا اردو میں بہترین کام ہے، ان پر بڑے خوبصورت اور اچھوتے انداز میں 'عالمگیرادب' کے شمارے شائع کرنے کا نہ صرف عزم کیا ہے بلکہ اب تک اس کے دو شمارے، نہ صرف ترتیب دے کر شائع کیے ہیں بلکہ ان کا گیٹ اپ، کاغذ، کتابت، ضخامت اور مواد، ہر

چیز اعلیٰ پیمانے کی ہے، کہ جس نے دیکھا، دیکھتا رہ گیا۔ پہلا شمارہ جو، جولائی ۲۰۱۱ء میں اشاعت پذیر ہوا، ''اسلم مرزا۔فن اور شخصیت'' پر، بھاری بھرکم (۳۳۶) صفحات پر مشتمل ہے۔''یادوں کا آبشار'' کے تحت تصویری البم بھی خاصے کی چیز ہے۔ کلام شاعر بخطِ شاعر بھی خوب ہے اور اس گوشے میں شریک قلمکار ہندوستان گیر شہرت کے مالک ہیں۔

اسی طرح دوسرا شمارہ، جو جنوری ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا ہے۔ وہ ''ڈاکٹر سحر سعیدی۔ شخصیت اور فن'' کی بہتر نمائندگی کرتا ہے، اور پہلے شمارے سے بہتر ہے۔ اسی طرح آئندہ جو شمارے آئیں گے۔ وہ بھی ہر طرح خوب سے خوب تر کی راہ پر چلیں گے، انشاءاللہ۔

عارف خورشید نے اپنے ساتھیوں کی اس رائے سے اتفاق کیا کہ ان کا دورانیہ چھ ماہ کا ہو۔ یعنی ایک سال میں صرف دو ہی شمارے شائع کیے جائیں اور یہی بمشکل ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ ایک شمارے کا کام ختم ہوتے ہی دوسرے شمارے کی تیاریاں کرنی ہوتی ہیں۔ مضامین حاصل کرنا، انھیں ترتیب دینا، ڈی۔ٹی۔پی کروانا۔ پروف ریڈنگ، کاغذ کا بندوبست کرنا۔ دراصل چھ ماہ کا عرصہ بھی کم ہی لگتا ہے، کیونکہ جس انداز میں اسے سجا سنوار کر پیش کیا جاتا ہے، دن رات ایک کرنا پڑتا ہے، پسینہ بہانا پڑتا ہے، یہ کوئی معمولی کام نہیں، جو کرتا ہے وہی جانتا ہے کہ قطرے کو گہر بننے کیا کچھ سہنا پڑا۔

کچھ دیگر لوگوں نے دریافت کیا کہ مذکورہ بالا سبھی شخصیات پر گوشے ترتیب دیے جائیں گے۔ ''ہاں۔ضرور۔'' عارف خورشید کا عزم سے بھرپور جواب تھا۔ ہمیں ایسے میں ڈاکٹر مظفر حنفی کا یہ شعر بے ساختہ یاد آ گیا:

اب کہہ دیا تو بات نبھائیں گے عمر بھر
حالانکہ دوستی کا زمانہ تو ہے نہیں

یوں بھی عارف خورشید نہ شکوہ شکایت کے قائل ہیں نہ کسی بات سے کم ہمت ہو جاتے ہیں۔ شاید سکندر علی وجد کے مندرجہ ذیل اشعار انھیں حوصلہ دیتے ہیں:

یہ اندھیرے کے تذکرے کب تک
دوستو روشنی کی بات کرو
پھول مرجھا گئے تو کیا غم ہے

کھلنے والی کلی کی بات کرو
کل کی باتیں کریں گے کل والے
وجدؔ تم آج ہی کی بات کرو

'عالمگیر ادب' سلسلے کی دونوں کتابوں نے ساری اردو برادری میں خوب نام کمایا ہے۔ کئی اہل قلم حضرات چاہتے ہیں کہ ان پر بھی کتاب شائع ہو۔ مگر عارف خورشید کا یہ کہنا ہے کہ پہلے تو وہ مزید پانچ شمارے ڈاکٹر عظیم راہیؔ، شاہ حسین نہری، نورالحسنین، ساحر کلیم اور خود عارف خورشید پر شائع کریں گے۔ اس کے بعد بہت ممکن ہے ایسی ادبی شخصیات پر بھی نظر کرم ہوگی جن کا واقعی ادب میں کوئی مقام ہو اور جو خود بھی اردو کاز کے لیے تن من دھن سے جٹے ہوں، کیونکہ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ بعض ادبی شخصیتیں کوئے یار سے نکل کر سوئے دار نہیں بلکہ سوئے بار چل پڑتی ہیں۔

بہر حال ابھی پانچ شمارے اور نکلنے ہیں اس طرح لگ بھگ سال ۲۰۱۴ء کا نصف حصہ گزر جائے گا۔

عارف خورشید اپنے کام میں ظاہر ہے کوئی کوتاہی اور کمی نہیں کریں گے۔ ان کی یہ پانچ منزلیں اور خوب روشن رہیں ایسی میری توقعات ہیں اور میں دعا گو بھی ہوں۔ ہنستے کھیلتے عارف خورشید کامیاب اور سرخرو اس مشکل مرحلے کو بھی با آسانی پھلانگ جائیں گے۔

ان کی توانائی اور بے مثال کامیابی کے لیے میری نیک تمنائیں اور دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ وہیں اس چھوٹے سے مضمون کے آخر میں مجروحؔ سلطانپوری کے اس شعر، اس خوبصورت شعر پر اپنی بات ختم کروں گا۔

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

☆☆☆

تم کیوں لکھتے ہو؟

م۔ناگ

عارف خورشید عمر کے اکسٹھویں ویں سال میں ہیں۔انھوں نے خاکے اور افسانے لکھے، تبصرے اور افسانچے لکھے۔شاعری بھی کی اور پورے ٹھسّے کے ساتھ کی۔صنف میں اپنے نقش چھوڑے، ہر صنف میں کتابیں لکھیں، بارہ پندرہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ان کی زیادہ تر کتابیں (۱۵۰) صفحات سے بھی کم ضخامت کی ہیں۔اس طرح اگر دیکھا جائے تو انہوں نے چھپے ہوئے پندرہ سو کتابی صفحات لکھے لیکن معیار کا دھیان رکھا۔اپنی کتابوں کی اشاعت کے لئے انھیں ادھر ادھر نہیں بھاگنا پڑا۔خود کا پبلشنگ ادارہ قائم کیا اور اپنی کتابیں چھاپیں، دوستوں کی بھی چھائیں۔ان کی شہرت افسانہ نگار کی حیثیت سے ہوئی۔ان کے افسانوں کے کردار طبقہ اشرفیہ سے متعلق ہیں۔انھوں نے جنسی نفسیات پر خوب لکھا ہے۔ان کے افسانے پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے وہ چوڑیوں کے رنگین ٹکڑوں کا بیری اسکوپ گھما گھما کر الگ الگ ڈیزائن بنا رہے ہیں۔کسی زمانے میں یہ الزام بھی لگا تھا کہ ان کی زمین محدود ہے لیکن بعد میں قافلے والوں سچ کہنا، پہچان، کھویا ہوا منظر، مکبر الصوت، آئینہ خانہ لکھ کر انھوں نے الزام تراشوں کا منہ بند کر دیا۔عارف خورشید نے تصوف پر لکھا، انسانی رشتوں کی پامالی پر لکھا، ان کی تحریروں میں بے باکی اور بے ساختگی ہے۔

عارف خورشید نے لکھنا شروع کیا تو جیسا کہ ہوتا ہے ہے انداز رومانی تھا لیکن بہت جلد اس فضا سے نکل آئے۔قمر اقبال ان کے اندر کے شاعر اور محمود شکیل ان کے اندر کے افسانہ نگار کو ٹٹول رہے تھے۔عارف اپنے افسانوں میں لاشعور طور پر بھی انھوں نے معلمات کا پیکر اپنی نفسیات کے ساتھ طرح طرح سے ابھارا اور برقعے سے نظر آتی صرف دو آنکھوں کے علاوہ بھی انھوں نے بہت کچھ دکھایا جس پر پہلے کسی کی نظر نہیں گئی تھی۔زمانہ کہتا ہے کہ عورت ایک طرح کی ہوتی ہے یعنی ایک عورت میں جو کچھ جہاں ہے دوسری میں بھی وہ سب وہیں ہے، لیکن عارف کی کہانیوں میں یہ سوچ ابھرتی ہے کہ ہو کوئی عورت ایسی جو ساری عورتوں سے الگ ہو، تلاش کرنے پر وہ سب وہاں نہ ہو، جہاں دنیا کہتی ہے تو کتنا

مزا آئے۔ وہ اپنی کہانیوں میں ایسی ہی کسی ایک عورت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ وہ جس جی داری اور پیار سے عورت کا کردار پینٹ کرتے ہیں اس کا میں دلدادہ ہوں، کیونکہ ان کے یہاں عورت پہلے ہے، رشتے بعد میں...... عارف خورشید محفل کے آدمی ہیں۔ ان سے گپ بازی کرنے میں مزا آتا ہے۔ لطیفے، چٹکیاں، چائے کی چسکیاں اور اب تو حقے کی گڑ گڑ بھی ہے۔ بڑی کہانیوں کے ساتھ انھوں نے افسانچے بھی لکھے ہیں۔ ان کے افسانچے اچار کا سا مزا رکھتے ہیں، افسانچوں میں مذہب کی آڑ میں خرافات، روزمرہ میں جنس کے رنگ، رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ، اقدار کی شکست و ریخت پر انھوں نے مؤثر انداز میں ضرب لگائی ہے۔ افسانچے کیا ہیں، ایک کوڑا ہیں، ایک ضرب ہیں جو وہ زندگی کی ننگی پیٹھ پر گلا رہے ہیں...... خاکہ نگاری میں تو وہ افسانوں، افسانچوں میں بھی آگے نکل گئے ہیں......

یہ سوال مجھے پریشان کرتا ہے کہ وہ پہلے کیا ہیں، افسانہ نگار، افسانچہ نگار یا خاکہ نگار۔ خاکہ نگاری کا فن مشکل ہے، جس شخصیت پر خاکہ لکھا ہو اس کا اندرون و بیرون جاننا ضروری ہے۔ خاکہ وقت اور ریاضت چاہتا ہے۔ شخصیت کی خامیوں اور خوبیوں میں توازن چاہئے۔ واقعات میں شخصیت کی خصلت چھن کر آنی چاہئے۔ خاکہ نگاری مشکل ہے اسی لیے تو گنے چنے خاکے شہ پارے بنے ہیں۔ عارف خورشید نے افسانہ نگاری اور افسانچوں میں وہ گوہر نہیں پایا جو انھوں نے خاکہ نگاری میں پالیا ہے۔ بلاشبہ ان کے خاکے اردو کے بہترین خاکوں میں شمار کیے جائیں گے۔

اب ''عالمگیر ادب'' کے نام سے انھوں نے کتابی سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس کے دو شمارے اسلم مرزا اور سحر سعیدی کے فن اور شخصیت پر نکل چکے ہیں۔ فنکاروں کے وسیع فن اور شخصیت کے مختلف گوشوں کو سمیٹ کر کتابی شکل دینے کا یہ کام انوکھا بھی ہے اور دستاویزی بھی۔ تیسرا شمارہ خود عارف خورشید پر آرہا ہے۔ دیکھنا ہے وہ اس کوزے میں اپنے آپ کو کیسے سمیٹتے ہیں۔

عارف خورشید سے میری پہلی ملاقات نورالحسنین نے کرائی تھی۔ عارف خورشید تب کٹ کٹ دروازے پر رہتے تھے۔ یہ بڑا دروازہ جس کو مضبوط لکڑی کے گیٹ تھے، جب ہوا چلتی تھی تو ایک ذرا سا آگے پیچھے ہوتا تھا جس سے کٹ کٹ کی آواز آتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے اس کا نام کٹ کٹ دروازہ رکھا گیا ہے۔ جب میں عارف سے پہلی بار ملا تو وہ گھر سے باہر کے چبوترے پر المونیم کے بدھنے سے پانی لڑھکا کر وضو کر رہا تھا۔ ایک منٹ پہلے ہی اذان ہوئی تھی، وہ نماز شاید گھر پر

ہی پڑھتا تھا یا ہمارے آنے کی وجہ سے مسجد نہیں گیا...... وہ اندر گیا اور بہت دیر تک وضو کا پانی بہتا رہا اور ہوا کی وجہ سے دروازہ کٹ کٹ کی آواز کرتا رہا...... اورنگ آباد، بلکہ مراٹھواڑہ نے ولی، سراج، وجد، قاضی سلیم، قمر اقبال، بشر نواز کے وسیلے سے اپنی شناخت قائم کی لیکن اب وہ نورالحسنین، عارف خورشید، اسلم مرزا، نہری صاحب اور عظیم راہی کے حوالے سے اپنی نئی پہچان بنا رہا ہے۔

گول مول بات نہ کریں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ عارف خورشید کی کہانیاں مجھے اس لیے پسند ہیں کہ وہ ان کی زبان سادہ ہوتی ہے، علامتیں سمجھ میں آتی ہیں، زبان صحیح لکھتے ہیں، بیانیہ موثر ہے، افکار میں تازگی اور نیا پن ہے، نگارشات تہہ دار ہوتی ہیں۔ کہانی کی بنت کا تانا بانا جب ماجراتی ردا اوڑھتا ہے تو ان کا بیانیہ پورے رچاؤ کے ساتھ مرتکز ہوتا ہے۔ وہ تکنیک میں تجربات کر کے نئے رنگ بھرتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کو اپنے سے لگتے ہیں۔ آخر وہ مرحلہ آتا ہے جب قاری کہانی پڑھنے کے بعد ویسا نہیں رہتا جیسا کہانی پرھنے سے پہلے تھا۔ عارف خورشید آس پاس کی ایسی تاریخ رقم کرتے ہیں جس میں جہاں و مکاں کو لانگھنے کی قوت ہے اور ان کی تاریخ صرف بادشاہوں کی نہیں، غلاموں کی بھی ہے۔ وہ غلام جسے بازار میں بیڑی پہنا کر برہنہ کھڑا کر کے نیلام کیا جاتا ہے۔ تاریخ اپنی باندی کی بھی ہوتی ہے جسے سونے کے ہار کی چوری کے الزام میں جانچ کے بہانے الف برہنہ کر کے چیک کیا جاتا ہے اور بعد میں پتہ چلتا ہے کہ ہار تو چیل لے گئی تھی۔

کیا عارف خورشید نے کہانی کا گوہر پالیا ہے؟

کیا کہانی ان سے کہتی ہے کہ ”آ مجھے لکھ“

کیا راہ کے پتھر انھیں کہانیاں سناتے ہیں؟

یہ سوالات بڑے گہرے ہیں۔ ان سوالوں کے جواب دیانتداری سے تلاش کرنا چاہیے۔ عارف آج بھی لکھ رہے ہیں۔ جب تک ان کی مکمل تحریروں کی چھان پھٹک نہیں کی جاتی تب تک گول مول باتیں ہوتی رہیں گی۔ عارف خورشید کے فن کا Neuclious تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔ کیا کوئی پی ایچ ڈی کرنے والی لڑکی اس Neuclious کو تلاش کرے گی؟

عارف خورشید نے شاعری بھی کی۔ ثلاثیاں اور غزلیں کہیں۔ ایک مختصر سا ناول بھی لکھا۔ اپنی رائٹنگ میں وہ رشتوں کو نئے انداز سے Define کرتے ہیں۔ عورت کے استحصال پر احتجاج

درج کرتے ہیں۔ وہ بامحاورہ زبان لکھتے ہے۔ افسانوں میں خودکلامی کا سا اندازہ زیادہ تر کردار ''وہ'' اور ''میں'' ہوتے ہیں۔

میں اپنے اور کئی دوستوں کی طرح عارف خورشید کو عزیز رکھتا ہوں۔ وہ بلا کے مہمان نواز واقع ہوئے ہیں۔ ان کی مہمان نوازی سے میں گدگدر ہتا ہوں۔ میں سنڈے رائٹر ہوں، عارف خورشید کی نگارشات پر لکھنا آسان نہیں ہے۔ اسی لیے اس تحریر کو سرسری سمجھا جائے۔ مروجہ اور سکہ بند الفاظ کا استعمال بھی میری مجبوری ہے کیونکہ لغت میں نئے الفاظ نہیں اور جو ہیں وہ معنی کھو چکے ہیں۔ یعنی میری مجبوری ہے کہ میرے پاس تیشہ ہے لیکن اس میں دھار نہیں ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ دو چار اور کتابیں پڑھ لوں، بصیرت اور گہری ہو جائے تو عارف خورشید کی تحریروں کے ساتھ انصاف کر سکوں گا، اس لیے مجھے معاف رکھا جائے۔ سعادت حسن منٹو کی تلاش میں نکلے شمس الحق عثمانی نے اپنے انٹرویو میں کہا تھا کہ تم صرف دیانتداری کے ساتھ اتنا بتا دو کہ ''تم کیوں لکھتے ہو'' تو میں کسی حد تک تمھیں تلاش کر لوں گا۔

☆☆☆

ایک خط - ایک مضمون

ڈاکٹر (اعزازی) نذیر فتح پوری

عارف خورشید صاحب!

سلام مسنون۔

آپ کا خط آیا ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ اپنے تعلق سے مضمون لکھنے کی دعوت دی۔ دراصل مجھے خدشہ تھا کہ ایک دن آپ کی جانب سے اس سلسلے میں خط ضرور آئے گا اور میں مضمون نہیں لکھ پاؤں گا۔ حالانکہ مجھے آپ کے فکر وفن پر ہر حال میں مضمون لکھنا چاہیے۔ آپ ایک اچھے شاعر ہیں۔ شاعری میں آپ نے اپنے طور پر نئے رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے آپ کے افسانے بھی پڑھے ہیں، جنھیں میں بہت زیادہ نہیں سمجھ سکا۔ اس لیے کہ میں اپنے طور پر آپ کے افسانوں کو یکسوئی اور توجہ سے نہ پڑھ سکا۔ اکثر افسانوں میں آپ نے عریانیت کو ہوا دینے کی کوشش کی ہے۔ میں اسے کوشش ہی کہوں گا۔ ایسی کوشش آپ کے دوسرے ہم عصر اہل قلم نے بھی کی ہے۔ لیکن کسی کی بیل مونڈے نہیں چڑھی۔ یہ فن منٹو نے پیدا کیا تھا وہ ہی اپنے ساتھ لے گیا۔ سیکس کے ذریعہ منٹو نے جس طرح نفسیاتی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کی ہے اس طرح کوئی اور نہ کر سکا۔ آپ میں تخلیقی صلاحیت بے پناہ ہے۔ جو ادب میں سچائیوں کو تسلیم کرے گا وہ آپ کی صلاحیتوں کا بھی برملا اعتراف کرے گا۔ آپ کی افسانوی تحریروں میں ایک جادو ہے، ایک کشش ہے۔ ایک طرح کی انفرادیت بھی ہے۔ آپ چاہتے تو اپنے لیے الگ راستہ بنا سکتے تھے۔ چلی ڈگر پر چلنے سے رفتار اپنے معانی کھودیتی ہے۔ لکیر پیٹنے سے لکیر کا حلیہ بگڑ جاتا ہے اور پیٹنے والے کی طاقت گرد بن کر ہوا میں منتشر ہو جاتی ہے۔

پچھلے دنوں ایوان اردو، دہلی میں آپ کے افسانچے پڑھے۔ لیکن میں ایک افسانچہ بھی سمجھ نہیں سکا۔ اس کا مجھے اس لیے افسوس ہے کہ میں نے اپنا قیمتی وقت ان افسانچوں کی تفہیم میں صرف کر دیا۔ یہاں مجھے اپنی بے بسی بھی نظر آئی۔ ظاہر ہے کہ ایوان اردو کے مدیر نے سوچ سمجھ کر ہی وہ

افسانچے شامل کیسے ہوں گے۔ بہر حال آپ کی افسانوی نثر نے یہاں بھی خوش کیا۔

مجھے ہر حال میں آپ کے فکر وفن پر مضمون لکھنا چاہیے تھا، کیوں کہ کسی زمانے میں جب آپ اتنے مشہور نہ تھے اور میں بھی اپنے طور پر اپنی شناخت بنانے میں لگا تھا۔ آپ نے ایک مقامی اخبار 'مفسر' میں مجھے خاص طور پر نمایاں کرنے کی کوشش کی تھی۔ اچھی خاصی ادبی سوغات میرے تعلق سے آپ نے شائع کی تھی۔ لیکن ایک شوخی اور شرارت کا کام یہ بھی کیا تھا کہ کسی سوٹ اور ٹائی والے جسم پر میری گردن بٹھا دی تھی۔ تصویر دیکھ کر میں دیر تک اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ تب تک میں آپ کو ایسا شوخ اور مزاح پسند نہیں سمجھتا تھا۔ ویسے مزاح، شوخی، طنز، ظرافت یہ سب ادب کا حصہ ہیں۔ میں بعد میں اپنی تصویر دیکھ کر اندر ہی اندر مسکرا دیا تھا۔ حالانکہ مسکراتے وقت میں آئینے کے روبرو نہیں تھا پھر بھی میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری مسکراہٹ میں کوئی طنزیہ عنصر نہیں تھا۔ بلکہ آپ کی ذہانت کی شوخی پر میں مسکرایا تھا۔ وہ مسکراہٹ آج بھی میرے ہونٹوں پر رکھی ہے اور میں اس کا تصور کر کے آج بھی لطف اندوز ہوتا رہتا ہوں۔

ان دنوں جب گوشوں کا ایسا عام چلن نہیں تھا۔ میں نے آپ کے فکر وفن پر ایک وقیع گوشے کی اشاعت کا ڈول ہی نہیں ڈالا تھا بلکہ وہ ڈول کنویں کی تہہ تک پہنچنے کے لیے دو چار ہاتھ باقی تھا۔ بہت سے صفحات کتابت ہو چکے تھے۔ میں نے کاتب کا حق محنت بھی ادا کر دیا تھا لیکن چاہنے کے باوجود وہ گوشہ شائع نہیں ہوا۔ کیوں نہیں ہوا اس کا جواب خود مجھے آج تک نہیں ملا۔ شاید آپ کو یہ بدگمانی ہوئی کہ کسی اور کی مداخلت کی وجہ سے گوشے کی اشاعت منسوخ ہوئی۔ لیکن یہ سچ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کیا سچ ہے مجھے آج تک معلوم نہ ہو سکا۔ ان دنوں آپ کی تین چار کتابیں آ چکی تھیں۔ آپ کے فنی اور فکری زاویوں نے اپنی سمت و رفتار کے تعین کا اعلان کر دیا تھا۔ اہل نظر حضرات نے آپ کے فکر وفن پر کثرت سے مضامین لکھے تھے۔ آپ کی تخلیقاتِ نظم ونثر کو سراہا جانے اور اعتراف کرنے والے موسم کی ہوا چلنے لگی تھی۔

کہانیاں تو بہت ہیں۔ شوخیوں سے بھری، شرارتوں سے لدی۔ ہنگاموں میں گھری، حوصلہ شکن، ہمت کی پیٹھ پر حملہ کرنے والی اور ذہنی طور پر مجھے آپ سے دور کرنے والی۔ سب سے دلخراش حادثہ متین قادری صاحب کی کتاب کے اجراء پر پڑھا جانے اولا آپ کا منفی مضمون ہے۔ بھاری بھرکم جسم رکھنے والے مخلص انسان کے دل پر اس وقت کیا گزری۔ اس کا احساس کر کے دیکھیے۔

ممکن ہے آپ کی بات غلط نہ ہو لیکن وقت غلط تھا۔ فن کاری کے لیے موقع محل کا انتخاب بہت ضروری ہے۔ غزل کے مشاعرے میں افسانہ نہیں سنایا جاسکتا۔ افسانے کی محفل میں غزل بیگم کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ سلیقہ مندی بھی باہنر ہونے کی دلیل ہے۔ آج متین قادری نہیں رہے۔ ممکن ہے آپ بھی وہ باتیں بھول چکے ہوں۔ لیکن میں اپنے دل کو کہاں لے جاؤں۔ آپ جیسی تخلیقی صلاحیتوں کا حامل جیالا فن کار، شاعر، افسانہ نگار اور بے مثال خاکہ نگار، اپنے ایک ساتھی پر ایسا رکیک حملہ بھی کرسکتا ہے، یہ بات نہ جانے کیوں مجھے بھلائے نہیں بھولتی، حالانکہ آپ نے میرا کبھی کوئی نقصان نہیں کیا، بلکہ جہاں تک مجھے احساس ہے، مجھے لگتا ہے آپ نے میری عزت ہی کی ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ ہر فن کار اپنے ہم عصر فن کاروں کی عزت کرے۔ ہاں ادبی تنازعہ ہو یا فنی مباحثہ ہو تو اختلاف رائے کا حق سبھی کو ہے۔ لیکن مقابل کی عزت نفس کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔

میں چاہتا تو کم از کم آپ سے متعلق ایک توشیحی نظم ہی لکھ سکتا تھا۔ جیسی نظم اسلم مرزا کے لیے لکھی تھی۔ اسلم مرزا سے میری ادھر چند برسوں کی ملاقاتیں ہیں، لیکن ان ملاقاتوں میں میں نے ان کو کچھ کچھ سمجھا ہے اور اسی کچھ کچھ نے مجھے ان کے لیے توشیحی نظم لکھوائی۔ آپ ایک اچھے شاعر ہیں میری نظم آپ کو پسند آئی ہوگی۔ کیوں کہ اسلم مرزا آپ کے شب و روز کے ساتھی ہیں۔ آپ مجھ سے زیادہ ان سے واقف ہیں۔ ان کی تخلیق، ان کی تحقیق اور تدوین کو آپ نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں نے صرف محسوس کر کے لکھا ہے۔ ان پر توشیحی نظم لکھ کر میں واقعی خوش ہوا تھا۔ اسی طرح آپ کے فکروفن پر لکھ کر خوش ہونا چاہتا تھا، لیکن یہ خوشی میرے حصے میں نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگوں کے حصے میں بہت سی چیزیں نہیں آتی ہیں۔ بندے کو ہر حال میں صبر کرنا چاہیے میں بھی صبر کر لیتا ہوں۔ آپ بھی صبر کریں۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

مجھے خاکہ نگاری نہیں آتی لیکن آپ کے خاکوں پر تو ایک مضمون لکھ سکتا ہوں۔ میں ثابت کرسکتا ہوں کہ آپ بہت اچھے خاکہ نگار ہیں۔ بڑی فراخ دلی سے آپ لوگوں کے خاکے اڑاتے ہیں۔ زبان، بیان، استعارے، تمثیلیں، جس پر خاکہ لکھتے ہیں اس کی شخصیت کے پور پور کو نمایاں کردیتے ہیں۔ صاحب خاکہ کی شخصیت کا رواں رواں آپ کے لفظوں میں ڈھل کر زندگی پالیتا ہے۔ بھلا ایسے خاکوں پر کون نہیں لکھے گا۔ میں بھی لکھ سکتا ہوں اور مجھے لکھنا چاہیے۔ آخر مجھے لکھنے سے کون روک سکتا

ہے اور میں کسی کے روکے سے رک سکتا ہوں اور مجھے آپ پر لکھنے کے لیے آج تک کسی نے روکا بھی نہیں اور ٹوکا بھی نہیں۔ یہ ظلم بھی آپ ہی نے کیا ہے۔ عرصہ ہوا ڈاکٹر عصمت جاوید سے متعلق آپ کی چند باتیں مجھے بہت ناگوار گزری تھیں۔ اپنی ناراضگی کا اظہار میں نے آپ کے نام ایک خط میں کر دیا تھا۔ لیکن آپ نے میرے خط کا جواب نہیں دیا۔ میں نہیں کہتا کہ آپ مجھ سے ڈر گئے تھے۔ آپ تو میر اور مرزا سے بھی نہیں ڈرتے اور ڈرنا بھی نہیں چاہیے۔ وہ اپنے وقت کے امام تھے، آپ اپنے وقت کے اہم قلم کار ہیں۔ مثبت اور منفی رویوں سے قطع نظر آپ اپنی مستحکم رائے رکھتے ہیں اور اپنی رائے کے تحفظ کے لیے لب کشائی کا آپ کو پورا پورا اختیار ہے۔ آدمی میں کمی ہو سکتی ہے، کجی بھی ہو سکتی ہے لیکن مرحوم عصمت جاوید اردو ادب کی اہم شخصیت تھے۔ ہم سب کو ان کا احترام کرنا چاہیے۔ احترام کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم کسی معتبر شخص کا بت بنا کر اس کی پرستش کرنے لگیں۔ ویسے ہر فن کار خود پسندی کے خطرناک مرض میں مبتلا ہے، یہاں تک کہ اپنے آپ کو باون گزی سمجھ کر اپنے آپ ہی کی پرستش کرنے لگتا ہے لیکن آپ کے یہاں یہ رجحان مجھے نظر نہیں آیا۔ ہمارے یہاں قاضی مشتاق احمد پائے جاتے ہیں ان کی نرگسیت کا یہ عالم ہے کہ ان کی ہر تحریر ''میں'' سے شروع ہوتی ہے اور ''میں'' پر آ کر ختم ہو جاتی ہے اور اگر تلاش کریں تو درمیانی سطور میں بھی میں، میں اور صرف میں ہی نظر آئے گا۔ ان پر اگر آپ نے خاکہ لکھا تو وہ بہت سچا خاکہ ہو سکتا ہے۔ ایسے لوگوں پر بھی خاکے لکھنے کے لیے موڈ بنائیں۔ لیکن ماہنامہ 'بے باک' میں شائع شدہ آپ کے ایک خط کے جواب میں جو ردعمل ہوا تھا وہ تحریریں بھی میں نے پڑھی تھیں۔ اس خط میں اگر آپ حضرت عتیق احمد عتیقؔ کا ذکر نہ کرتے تو اتنی مخالفت نہ ہوتی۔ قاضی مشتاق احمد کے لیے آپ نے جو فقرہ لکھا تھا وہ غلط نہیں تھا۔

اکثر میرا اورنگ آباد آنا ہوتا ہے لیکن کبھی دل نہیں چاہا کہ آپ سے ملوں۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں کبھی نہ آئی۔ آپ کے لیے میرے دل میں کوئی نفرت کا جذبہ قطعی نہیں ہے۔ میں نفرت اور تضحیک پر کبھی ایمان نہیں رکھتا۔ آپ کسی سے خفا ہیں، یا کسی کے شاکی ہیں یا ادبی طور پر کوئی فن کار آپ کو پسند نہیں آیا یا متاثر نہ کر سکا، تو اس سلسلے میں آپ کو اظہار خیال کا پورا حق حاصل ہے۔ یہ حق آپ کو کسی نے بخشا نہیں ہے بلکہ قدرتی طور پر آپ کو یہ حق حاصل ہے، لیکن ادب میں سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ویسے بھی ان کی تحریریں ادب کم اور بازاری زیادہ ہیں۔ بلکہ ادب قطعی نہیں۔

آپ کی شاعری میں، افسانوں میں، افسانچوں میں، خاکوں میں تو بہت سا ادب ہے بلکہ بہت زیادہ ادب ہے۔ جب میں اس بات کو تسلیم کر رہا ہوں کہ آپ کے یہاں بہت سا ادب موجود ہے تو پھر میں اس ادب پر لکھنے سے دامن کیوں بچا رہا ہوں۔ مجھے کم از کم آپ کی غزل پر تو ضرور لکھنا چاہیے کہ افسانوں کے مقابلے میں غزل پر اظہار خیال نسبتاً آسان ہے۔ میں چاہوں تو لکھ سکتا ہوں کہ آپ غزل کے کامیاب شاعر ہیں۔ آپ عصری حسیت کا نہ صرف ادراک رکھتے ہیں بلکہ اپنی شاعری میں اس کا اظہار خوبی کے ساتھ کرتے ہیں۔ آپ کو ایک حد تک کلام پر قدرت ہے۔ زندگی کے بدلتے منظر نامے کو کامیابی کے ساتھ اشعار میں پیوست کر کے پیش کرنے کا ہنر آپ کو میسر ہے۔ تخلیقی طور پر قدرت کی طرف سے آپ کو بڑی فراخ دلی اور فیاضی کے ساتھ عطا ہوا ہے۔ تھوڑے سے شخصی توازن کی ضرورت ہے۔ بڑوں کی عزت افزائی اور چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کے جذبے کی ضرورت ہے۔ ایک ذرا سی قدغن۔ ایک ذرا سا بریک۔ ایک ذرا سا رفتار شکن سے بھی یارانہ کر لیں۔ یہ مشورہ نہیں میں اپنے دل کی بات کہہ رہا ہوں۔ ممکن ہے یہاں کہیں آس پاس آپ کے لیے کوئی محبت کا جذبہ انکور کی صورت میں موجود ہو۔ اور یہ پودا بننے کی خواہش اپنے آپ میں پال رہا ہو۔

☆☆☆

گہرے، دھندلے رنگ

محمد تقی

جس طرح روح کا جسم سے اٹوٹ تعلق ہے، اسی طرح ادب کا انسانی نفسیات سے گہرا تعلق ہے۔ کسی بھی فن پارے کو پرکھنے سے پہلے اس کے خالق کے ذہن میں جھانکنا لازمی ہے۔ تخلیق کار کی ذہنی کیفیت، نقطۂ نظر، جذبات، احساسات، خیالات، پسند ناپسند، ذوق وشوق، فن پارے کے تشکیلی عمل پر یکساں اثر انداز ہوتے ہیں۔ کسی فن پارے پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے قبل نقاد کو تخلیق کار کی مندرجہ بالا ذہنی اور دلی کیفیات کو سمجھنا لازمی ہوتا ہے، ورنہ وہ فن پارے سے انصاف نہیں کر سکے گا اور اس کی رائے سطحی ہو کر رہ جائے گی۔ اصنافِ ادب بالخصوص ناول، افسانہ، ڈرامہ، خاکہ اور قصیدہ گہرے نفسیاتی مطالعے اور تیز مشاہدے کے متقاضی ہوتے ہیں کیونکہ ان پانچوں اصنافِ ادب میں فن کار کو انسانی کرداروں سے بحث کرنی پڑتی ہے۔ ناول نگار، ڈرامہ نگار اور خاکہ نگار کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے کرداروں کی شخصیت کی خوبیوں، خامیوں اور اس کے روزمرہ کے برتاؤ سے کماحقہ طور پر واقف ہو۔ مذکورہ بالا چاروں اصناف نثر میں خاکہ نگاری مشکل اور نازک صنف ہے، جو تخلیق کار سے گہرے انسانی نفسیاتی مطالعہ کا تقاضا کرتی ہے ورنہ خاکہ بے جان، بے رنگ و بے کیف ہو کر رہ جائے گا اور قاری اس سے لطف اندوز ہونے کے بجائے ذہنی الجھن اور اکتاہٹ محسوس کرے گا۔ اس سے پہلے کہ ہم خاکہ نگاری پر گفتگو کریں، انسانی نفسیات کیا ہے اور ان کا مطالعہ کس طرح کیا جائے، اس پر سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

نفسیات (Psychology) انسانی کردار یا برتاؤ کے مطالعے کا علم کہلاتا ہے۔ انسان ایک مخصوص سماجی، معاشرتی، مذہبی، سیاسی ماحول میں زندگی گزارتا ہے۔ یہی مخصوص ماحول اس کی شخصیت سازی پر مؤثر ڈھنگ سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کی ذہنی کیفیات اور روزمرہ کے برتاؤ میں ایسے مخصوص ماحول کے ساتھ اس کے منفرد جذبات واحساسات کا عکس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شخص کے برتاؤ کا مطالعہ شخصیت کی قدر کے تعین میں مفید ومعاون ثابت ہوتا ہے۔ اگر کوئی ناول نگار اپنے ناول کے

کرداروں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے تو ہی وہ ان کرداروں میں جان ڈال سکتا ہے اور یہ کردار لافانی بن جاتے ہیں۔ یہی معاملہ افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور خاکہ نگار کو بھی درپیش ہوتا ہے۔ لیکن صرف انسانی نفسیات کے مطالعے کے سہارے کوئی تخلیق کار اپنی تخلیق کو شاہکار نہیں بنا سکتا ہے۔ تخلیق کار کا ویژن، طرزِ نگارش، اسلوب، فنی مہارت اور ذہانت فن پارے کو معتبر اور عمدہ بناتے ہیں۔ ایک اچھا خاکہ نگار اپنے ممدوح کی شخصیت کے اندر اتر کر شخصیت کے جذبات واحساسات کو ٹٹولتا ہے اور اپنے متاثر کن اندازِ بیان سے شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ کرتا ہے۔ ''علم نفسیات میں تحلیل نفسی کے نظریے کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔'' بقول ڈاکٹر مغنی تبسم:

> ''جب سے تحلیل نفسی کے نظریے کو فروغ ہوا ہے، فن کاروں کی تخلیقات کے لاشعوری محرکات کا مطالعہ بھی ایک دلچسپ مشغلہ بن گیا ہے۔''

نظریہ تحلیل نفسی، شخصیات کے لاشعوری محرکات اور اس کی خرابیوں اور خوبیوں کی بہترین تشریح سے بحث کرتا ہے۔ ناول، افسانہ، ڈرامہ، رپورتاژ کی طرح خاکہ بھی انگریزی ادب سے اردو میں آیا ہے۔ خاکہ کے لیے انگریزی میں Sketch کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ خاکہ کی مختصر ترین تعریف ''شخصیت کی عکاسی'' ہے۔ وہی خاکہ بہت زیادہ مقبول عام ہوتا ہے جس کے کردار یا کرداروں کے بارے میں قارئین کی معلومات بہت زیادہ ہوتی ہے یا وہ ان سے شخصی طور پر واقف ہوتے ہیں۔ خاکہ میں مختصراً زندگی کے ہر گوشے پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم رقم طراز ہیں:

> ''خاکہ کا فن بہت مشکل اور کٹھن فن ہے۔ اسے اگر نثر میں غزل کا فن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جس طرح غزل میں طویل مطالب بیان کرنے پڑتے ہیں، ٹھیک اسی طرح خاکے میں مختصر الفاظ میں پوری شخصیت پر روشنی ڈالنی پڑتی ہے۔''

دکن کی پرانی دلّی اور اردو زبان وادب کے ایک اہم مرکز اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے، پلے بڑے اور ادب کے افق پر ابھرنے کی مسلسل کوشش میں سرگرداں عارف خورشید بڑی خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ بڑی حیرت کن خوشی کی بات ہے کہ وہ ادیب، افسانہ نگار، شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے خاکہ نگار بھی ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں ان کے خاکوں کا ایک مجموعہ ''تنظیم کیثر رنگی'' شائع ہو چکا ہے اور ادبی حلقوں میں موضوع بحث رہا ہے۔ ۲۰۰۳ء میں شائع ان کے

مضامین کے مجموعہ ''رنگ امتزاج''میں جملہ سات خاکے ہیں جو شاہ حسین نہری ، خان شمیم اور اخترالزماں ناصرودیگر پر لکھے گئے ہیں۔''وقت کے چاک پر'' عارف خورشید کے افسانوں، خاکوں اور افسانچوں کا مجموعہ ۲۰۱۰ء میں منظر عام پر آیا۔اس میں قاضی سلیم ،حمید سہروردی، جاوید ناصراور رشید انور پر خاکے لکھے گئے ہیں۔

''تنظیم کثیر رنگی'' میں اورنگ آباد کی معروف اور غیر معروف شخصیات پر بارہ خاکے ہیں۔ معروف جدید افسانہ نگار محمود شکیل ، معروف شاعر و نقاد بشر نواز ، مرحوم جاوید ناصر (شاعر) ، یوسف عثمانی (شاعر)، ڈاکٹر ارتکاز افضل (ادیب) پر جو خاکے لکھے گئے ہیں وہ قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث یوں ہیں کہ وہ (قارئین) ان خاکوں کی شخصیات سے اچھی طرح واقف ہیں۔محمود شکیل پر لکھے خاکے کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

> ''پاکستانی پرچوں میں اس قدر شائع ہوئے کہ ہندوستانیوں نے محمود شکیل کو پاکستانی افسانہ نگار سمجھا۔ جوانی بغیر محبت کے گزر گئی۔عشق و عاشقی کا چکر ان کے ہاتھ کی لکیروں میں نہیں ۔ ہاتھ بہت صاف ہے۔ زیادہ لکیروں کا بکھیڑا نہیں۔ نہ دولت کی لکیر، نہ محبت کی ، نہ ڈگریوں کی نہ ہی الجھنوں کی باریک باریک لکیریں۔بس پورے ہاتھ میں دو ہی لائینیں ہیں۔ایک لکھتے رہنے کی، دوسرے پیدل چلنے کی۔'' (روشنی کا رنگ)

عارف خورشید نے محمود شکیل پر خاکہ لکھ کر ایک عمدہ اور منجھے ہوئے افسانہ نگار کو جو گمنامی کے غار میں پڑا تھا، منظر عام پر لایا ہے، ورنہ بھارت کے قارئین محمود شکیل سے بہت کم واقف تھے۔ مندرجہ بالا اقتباس سے عارف خورشید کے تیز مشاہدے کا پتہ چلتا ہے۔شخصیت کی اچھی تصویر کشی کی ہے۔خاکہ نگار سے ممدوح کے ذہن میں بھی جھانکنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ محمود شکیل ایک سیدھے سادے، بےفکر انسان ہیں جو ایسی کوئی غلط حرکت نہیں کرتے کہ جس کی وجہ سے انھیں ذہنی الجھنوں میں خواہ مخواہ مبتلا ہونا پڑے۔

بشر نواز پر شخصی خاکہ بڑی محنت اور نفسیاتی مطالعہ کے بعد لکھا گیا ہے۔ بشر نواز کی زندگی کے پوشیدہ گوشوں، ان کی بری عادتوں اور کمزوریوں کے ساتھ ان کی انانیت کا تذکرہ بڑے دلکش اور متاثر کن انداز بیاں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''خارجاً ممنوع ہے کہ بال کٹوانے سے انھیں گدگدی ہوتی ہے، منہ دھونے اور نہانے کے معاملے میں شیر ہیں۔ شراب کے شوقین، پینے کے بعد غمگین۔ جوں جوں نشہ چڑھتا جاتا ہے یہ بہت بڑے آدمی ہوتے جاتے ہیں۔ اس وقت کسی بڑے آدمی کا ذکر کیجیے تو بشر نواز اپنے مخصوص انداز میں گردن جھٹک کر بال ہلا کر سیدھا ہاتھ سر کی سیدھی جانب پھراتے ہوئے کہتے ہیں ''ہاں وہ مجھے جانتا ہے'' یا پھر وہ میری فلاں چیز شائع نہیں کرے گا تو میرا کیا نقصان ہوگا۔ وہ اردو ادب کی ایک شاہکار تخلیق سے دنیا کو محروم کردے گا۔'' (احتجاج رنگ)

خاکہ نگار شخصیت کے بارے میں درست معلومات ان افراد سے بھی حاصل کرتا ہے جو اس کے ممدوح کے قریبی اور پھکڑ دوست ہوتے ہیں۔ بشر نواز کی مفلسی اور معاشی بدحالی کی مکمل تصویر عزیز قیسی نے چند الفاظ میں خوبصورت ڈھنگ سے کھینچی ہے جس سے عارف خورشید نے استفادہ کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ عزیز قیسی کا خیال ہے کہ بشر نواز کو ہرے درخت کے نیچے کھڑا کر دیجیے درخت فوراً سوکھ جائے گا۔

عارف خورشید کے ہاں تخیل کی کارفرمائی مفقود ہے جبکہ حقیقت نگاری ان کے خاکوں کی خصوصیت ہے، یہی وجہ ہے کہ انھیں اپنے ممدوح کے ذہن و دل میں جھانکنے سے زیادہ اس کے بیڈروم اور درون خانہ کی باتوں میں لطف آتا ہے۔ وہ اپنے ممدوح کے بیڈروم میں چپکے سے پہنچ کر کسی کونے میں چھپ کر وہاں کی ایک ایک چیز اور ہر حرکت کو اپنی آنکھ کے کیمرے میں قید کرلینا چاہتا ہے۔ جاوید ناصر کے خاکے میں ان کی جنسی کمزوری کو بے باکانہ انداز میں بیان کرنے میں عارف خورشید کو بڑی لذت محسوس ہوتی ہے وہ اور قاری سے بھی اسی لذت کی خواہش کرتے ہیں:

''شادی سے قبل انھوں نے فاحشاؤں کے کوچوں کی عملی سیر کی اور فراق گورکھپوری کے ہم رکاب بھی رہے۔ ان کی باتیں باذوق سامع کے لیے دلچسپ ہوا کرتی ہیں۔ ان کی ظرافت کی گرہ بہت کم دوستوں کے سامنے کھلتی ہے۔ شراب نوشی کے دوران چھیڑ چھاڑ کرنا، سامنے والا جو اُگل دے اسے ''پھر بیان کرنا'' میں لکھ دینا ان کو اچھا لگتا ہے۔'' (کم آمیز رنگ)

دوسروں کے بیڈ روم میں جھانکنا، درون خانہ باتوں میں دلچسپی لینا بلکہ انھیں چٹخارے لے کر بیان کرنا۔ میں نہیں سمجھتا کہ عارف خورشید کسی جنسی نفسیات کے مرض میں مبتلا ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ایسی حرکات وہی شخص کر سکتا ہے جو کسی نفسیاتی مرض کا شکار ہو۔

عارف نے ''تنظیم کثیر رنگی'' میں جو اڑان بھری تھی اور وہ جس بلندی پر پہنچے تھے بعد کے خاکوں میں وہ اس سے اوپر نہیں اٹھ سکے ہیں۔ بلکہ ''وقت کے چاک پر'' میں شامل خاکوں میں ان کی فکری اور فنی بلندی کا گراف گرا ہے۔ قاضی سلیم اور حمید سہروردی پر لکھے گئے خاکے کمزور ہیں۔ ایک ہی شخص پر وقفے سے دو خاکے لکھنے کا یہ نقصان ہوتا ہے کہ پہلے خاکے میں پیش کردہ باتوں کے دوسرے خاکے میں دوبارہ شامل ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ چنانچہ جاوید ناصر پر دوسری مرتبہ لکھے گئے خاکے ''پرانا غم کہانی بن گیا ہے'' میں پیراگراف جوں کے توں نقل کیے گئے ہیں۔ سوائے جاوید ناصر کی موت پر اظہار غم کے اور کوئی چونکا دینے والی بات کا انکشاف نہیں کیا گیا ہے۔ شخصیات کے فن پاروں میں بھی شخصیت کے نظریات، افکار اور احساسات کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اگر خاکے کا کردار کوئی شاعر ہے تو اس کی شاعری کے توسط سے اس کی ذہنی کیفیات اور افکار تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔ اس طرح تخلیقات شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ کرنے میں بے حد کارآمد ہوتی ہیں۔ لیکن عارف خورشید نے جن اہم تین شاعروں بشر نواز، قاضی سلیم اور جاوید ناصر پر خاکے لکھے ہیں ان کے شعری کلام کے حوالے سے ان کی (شاعروں کی) ذہنی کیفیات، احساسات اور جذبات و نظریات کو واضح کرنے پر خاص توجہ نہیں دی ہے۔ بشر نواز، جاوید ناصر اور یوسف عثمانی کے خاکوں میں ان شاعروں کی بعض مکمل نظموں، غزلوں یا اشعار کو پیش کر کے شاعری کے حوالے سے شخصیت کے مختلف گوشوں کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی۔ بعض خاکوں میں خود عارف خورشید نے اپنے اشعار شامل کر دیے ہیں۔ بلکہ ان کے کلام پر خواہ مخواہ تبصرہ کر کے خاکہ نگاری میں تبصرہ نگاری کے فن کو ٹھونسنے کی کوشش کی ہے۔ اورنگ آباد کے ایک اور شاعر یوسف عثمانی پر لکھے خاکے ''رنگ کی خوشی من کا سودا'' میں ان کی بیوی اور کہنہ مشق شاعرہ رعنا حیدری کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شاعری سے بحث کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

> ''رعنا حیدری ماضی کو کرید کر حال بتا دیتی ہیں...... مگر میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ رعنا حیدری کی نظمیں زیادہ Powerful ہیں۔ ان

کے پاس ایک عورت کی مکمل شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔‘‘

(رنگ کی خوشی من کا سودا)

پھر خاکہ نگار رعنا حیدری کی مختلف نظموں کے بند پیش کرتا ہے۔ خاکہ یوسف عثمانی کا اور ذکر اس پری وِش کا!’’ وقت کے چاک پر‘‘ خاکے میں قاضی سلیم کی زندگی کے ان گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ تھے، لیکن انداز بیان خشک اور بے کیف ہونے سے قاری اس خاکے کو پڑھنے میں کوئی لطف محسوس نہیں کرتا ہے۔

دکن کے معروف جدید شاعر، افسانہ نگار اور نقاد حمید سہروردی پر یہ الزام ہے کہ انھوں نے غیر شعوری طور پر جدیدیت کے سیل رواں میں بہہ کر ایسی تخلیقات کو جنم دیا جو عام قاری بلکہ منجھے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کے پلے نہیں پڑتی تھیں۔ لیکن اس کے برعکس ان کی شخصیت ایک محترم کھلی کتاب کی طرح ہے جس کو ہر کوئی آسانی سے پڑھ سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے۔ عارف نے حمید سہروردی کی منکسر المزاجی اور شرافت کی عکاسی بہت کم الفاظ میں کی ہے:

> ’’حمید سہروردی بھی دیگر کہانی کاروں اور افسانہ نگاروں کی طرح اپنے آپ کو وزن اور بحر سے آزاد پاتے ہیں...... میں نے حمید سہروردی سے کبھی کسی کی غیبت یا برائی نہیں سنی۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے خلاف کیا کیا باتیں ہوتی ہیں۔ یہی ان کی افسانہ نگاری کا اطمینان ہے۔ اگر لوگ کچھ نہ کہتے تو شاید وہ اپنے فن سے مطمئن نہ ہوتے۔‘‘ (وہ ایک افسانہ طراز)

عارف خورشید کے سبھی خاکے شخصی خاکوں کی تعریف میں آتے ہیں اور ایسے خاکے فن کار سے عمیق مشاہدہ اور گہری نظر کا تقاضا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں مشاہدے کی شدت اور دور بینی تو ہے لیکن ان سے پوری طرح استفادہ کرنے کی کوشش کا فقدان ہے۔ البتہ اسلوب دلکش، زبان آسان اور فقرے چست ہیں۔ یہ خوبیاں ایک اچھے خاکہ نگار کی پہچان سمجھی جاتی ہیں۔ عارف کا نفسیاتی مطالعہ بھی گہرا ہے، لیکن ان کی توجہ جنسی نفسیات پر پتہ نہیں کیوں زیادہ مرکوز دکھائی دیتی ہے۔ عارف خورشید کا یہ وصف خاص ہے کہ انھوں نے شخصیات کی خامیوں، کمزوریوں، برائیوں اور لتوں کو بڑے بے باکانہ انداز میں بیان کرنے کی جرأت کی ہے اور یہ جرأت مندی بہت کم خاکہ نگاروں کے حصے میں آئی ہے۔

☆☆☆

پیکر تراشی سے نفسیاتی تجزیے تک

ڈاکٹر مسرت فردوس

عارف خورشید کے ذکر کے ساتھ ہی ایک افسانہ نگار، ایک شاعر اور ناولٹ نگار کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ سبھی باذوق و ادب نواز قارئین جانتے ہیں کہ اُن کی تصانیف کی طویل فہرست ہے اور اس میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے اور مراٹھواڑا کی ادبی تاریخ میں ایک درخشاں باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس ہشت پہلو و ہمہ گیر شخصیت کی تصنیفی صلاحیتوں کا ایک گوشہ خاکہ نگاری ہے۔ انھوں نے اورنگ آباد سے تعلق رکھنے والے اور خاص طور پر دوستوں کے حلقے میں شامل قریبی و دیرینہ مراسم رکھنے والے افراد کے دلچسپ خاکے تحریر کئے ہیں۔ جن سے ان کی ذہنی و جذباتی وابستگی رہی ہے۔ خاکہ نگاری کے فن کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ ان ہی افراد کا خاکہ لکھا جائے جن کی چال ڈھال، عادت و اطوار، رہن سہن کا نہایت قریب سے مشاہدہ ہو۔ یہ سب شخصیتیں ایسی ہیں جنھیں اورنگ آباد کے بیشتر قارئین جانتے ہیں اس لئے پڑھتے وقت زیادہ لطف آتا ہے اور ان کی زندگی کی بولتی چالتی، پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوتی ہیں۔ خاکہ میں تو کسی شخصیت کو جیسی وہ ہوتی ہے من وعن ویسے ہی پیش کر دیا جاتا ہے۔ اسے اچھا یا برا یا کچھ اور ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اُن کی زندگی کے مختلف واقعات کا علمی بصیرت سے انتخاب کر کے پوری مہارت سے ان کو ترتیب دی جاتی ہے اور یوں شخصیت سامنے آتی ہے۔ خاکہ صفحۂ قرطاس پر نوکِ قلم سے بنائی ہوئی ایک شبیہ ہے یہ بے جان ساکت اور گم سم نہیں ہوتی، یہ بولتی ہوئی متحرک، پرکیف تصویر ہوتی ہے۔

عارف خورشید کے لکھے ہوئے خاکوں کا مجموعہ ''تنظیم کثیر رنگی'' ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا، اس میں بارہ شخصیتوں کے خاکے ہیں۔ ''رنگ امتزاج'' جسے فرید احمد نہری نے مرتب کیا، اس میں سات افراد کے قلمی مرقع ہیں۔ جس میں لفظوں کی مدد سے فنکار کے خیالات، تجربات، تاثرات، جذبات عیاں ہوتے ہیں۔ انھوں نے شخصیتوں کا ذکر یوں کیا ہے کہ کاغذ کے انباروں سے زندہ پیکر ابھر کر سامنے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور ہم خود کو ان کی محفل کا ایک فرد سمجھنے لگتے ہیں۔ مدت العمر جن لوگوں

سے ان کے تعلقات جس رنگ میں رہے زیادہ تر تذکرہ اِن ہی کا ہے۔ جس کسی کے لیے ان کے دل میں جس قسم کے جذبات اٹھتے تھے ویسا ہی پیش کیا ہے۔ مضامین کی اصل روح اور بنیاد یہی جذبات، تاثرات اور احساسات ہیں۔ واقعات کا انتخاب اور ان کا بیان ان ہی دلکش رنگوں سے مزین ہے۔ خاکہ نگاری کا وصف بھی یہی ہے کہ شخصیت مکمل طور پر سامنے آجائے اور اُس کی انفرادیت بھی قائم رہے۔ مشاق قلمکار نے شکل وصورت، جسامت، لباس، وضع قطع، تراش خراش ہر پہلو کو پیش کیا ہے۔ اس لیے عارف خورشید بجا طور پر پیکر تراش کی حیثیت سے ابھرتے ہیں۔ بشر نواز کے بارے میں لکھتے ہیں:

''قد پانچ فٹ چھ انچ، جسم دبلا پتلا، رنگ گورا، پیشانی چوڑی، کبھی ڈاڑھی کبھی ہٹلر کٹ مونچھیں باقی اور ڈاڑھی بالکل صاف، کبھی بال بہت کم، کبھی زلفیں دراز، پچھلے چند برسوں سے زلفیں بھی قائم اور رخ پرنور پر ڈاڑھی بھی باقی۔''

جاوید ناصر کی چہرہ نویسی ملاحظہ فرمائیے:

''یہ کم قد رانسان قدرآور شاعر ہے۔ سیاہ رنگ کے باوجود چہرے پر اجالا ہے ناک آواز کی طرح موٹی اور بھاری ہے۔ ساری سوچ اور فکر کی گہرائیاں اور علم وادب کی گیرائیاں ان کی ناک پر مرکوز ہیں، باوجود پان نوشی کے دانت سفید، دل کھول کر ہنستے وقت اچھے لگتے ہیں۔''

(تنظیم کثیر رنگی۔صفحہ ۳۸)

''یوسف عثمانی حلیہ سے فلفی معلوم ہوتے ہیں اور حرکات وسکنات سے شاعر۔ زلفیں، میٹر گیج اور ڈاڑھی نیرو گیج، رنگ سانولہ، قد پانچ فٹ ساڑھے سات انچ، آنکھیں بڑی، ناک متناسب، جسم بھاری بھرکم، آواز باریک۔ اسکوٹر چلاتے ہیں تو دور سے اندازہ نہیں ہوتا کہ اسکوٹر پر ہیں یا پیدل۔'' (تنظیم کثیر رنگی۔صفحہ ۶۵)

ڈاکٹر الطاف قریشی کے متعلق لکھتے ہیں:

''چھریرا بدن، میانہ قد، چوڑی پیشانی پر اکثر چشمہ جو لکھتے وقت آنکھوں پر

ہوتا ہے تشخیص کے وقت پھر اپنی جگہ پر، اونچی ناک، چپکے گال، بال گھنے
نہیں لیکن وہ بھی سلیقے سے جمے نہیں، ٹیڑھی مانگ، موٹے ہونٹ وآنکھوں
میں شوق کی پرچھائیاں نظر نہیں آتیں جیسے خوابوں، خیالوں اور منصوبوں
میں مصروف ہوں۔'' (رنگ امتزاج۔صفحہ ۱۰۷)

یہ شخصیتیں ایسی نہیں کہ صرف خوبیوں کا مرکب ہے بلکہ ان میں عیب بھی ہیں خوبیاں بھی ہیں۔ عام آدمی کی طرح اُن کی خواہشیں اور تمنائیں بھی ہیں اور حادثات زمانہ کے آگے صید زبوں بھی ہیں، ان کے عادات واطوار کے ذکر کے ساتھ مزاج وقت اور میلانِ زمانہ کا تذکرہ بھی آیا ہے اور دور کی مکمل تہذیب بھی پیش کردی ہے۔ عارف خورشید نے ہر شخص کے حالات بڑے اعتدال اور توازن کے ساتھ لکھے ہیں۔ خاکے تنقیص اور مداحی کے الزام سے بچ جاتے ہیں۔ کردار کی اندرونی گرہوں کو کھولنے میں محنت وہنرمندی کا کمال دکھایا ہے، زندگی کی پہلودار پری شیشے میں اتارنا ان کا مقصد ہے۔ خاکہ لکھتے وقت وہ خود کو اُس فضا میں پہنچادیتے ہیں جس میں وہ شخصیت متنفس و متحرک ہو۔ رفعت سعید قریشی کی شخصیت جس ماحول سے ابھرتی ہے اُس کی تصویر دیکھئے:

''نواب پورہ میں واقع فیکٹری اس زمانے میں اس لیے بھی مشہور تھی کہ
بہت اہم شخصیات اور فلمی اداکار اکثر و بیشتر فیکٹری میں آتے تھے۔ اُس
وقت اورنگ آباد میں کوئی بڑا کارخانہ نہیں تھا۔ ہر و کو ہی صنعت کا درجہ
حاصل تھا خاندان کی نیک نامی اور کاروباری عروج نے برتری کا احساس
پیدا کردیا تھا جو رسّی جل جانے کے بعد بھی نہیں نکلا۔''

قلمکار نے شخصیتوں میں غیر موجود خوبیوں کو موجود یا اُن کی واقعی کمزوریوں کو عنقا نہیں بنایا۔ اوصاف ان مشاہیر کے وہی ہیں جو انھوں نے بیان کیے ہیں مگر عقیدت ومحبت کی وجہ سے ان کے رنگ گہرے اور نقوش تیکھے ہوگئے ہیں اور تصویر مصور کی Retouching کی بدولت اصل سے کسی قدر حسین ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر ارتکاز افضل اور اختر الزماں ناصر سے محبت وعقیدت مصنف کے قلم سے ٹپک پڑتی ہے:

''ذہانت اور محنت دونوں کا یکجا ہونا مشکل ہے۔ ارتکاز ذہین بھی ہیں اور

محنتی بھی، مزاج میں توازن، غربت ومحنت کی بناء پر پیدا ہوا ہے جو ادب
سے وابستہ بھی رکھتا ہے اور زمانہ شناسی بھی سکھلاتا ہے۔''

ان کی عقیدت ومحبت دونوں کا اثر یہ بھی ہے کہ مصنف کے ساتھ ساتھ قاری بھی اُس شخص کی مسرتوں اور تکلیفوں میں شریک ہو جاتا ہے اور اس کے درد سے ہمارے دل میں بھی درد اٹھنے لگتا ہے۔ اُن کے خاکے قاری کے دل میں شخصیت سے ہمدردی اور عزت کے جذبات پیدا کر دیتے ہیں۔ عظیم شخصیتوں کے خاکے کا مطالعہ نہایت عمدہ اور مستحسن جذبات پیدا کرتا ہے۔ خاکوں میں سراپا نگاری پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ شخصیتوں کا حسن وجمال نفاست طبع، خوش پوشاکی، خوش اخلاقی، ظرافت طبع، حلم وخوش الحانی، علمی تبحّر، اپنے پیشے سے وابستگی جیسے پہلوؤں کے ضبط تحریر میں آنے سے خاکوں کا وقار بڑھا ہے۔

''شاہ حسین نہری خوشخط، خوش لباس، جامہ زیب، خوش گفتار اور بیشتر مذہبی
لٹریچر کو گھول کر پی جانے کے باوجود خوش مزاج ہیں۔''

موصوف کے مزاج کی شگفتگی، خوش طبعی، چٹکلے بازی، گفتگو میں ہر ہر فقرے کو لطف سے بھر دینے کا انداز، تصنیفی کام کرنے کا طریقہ اور دیگر اطوار کو دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے۔ شاہ حسین نہری کی فقرے بازی اور عارف خورشید کے طرزِ تحریر کا نمونہ دیکھیے:

''میں نے کہا: ٹھیک ہے عشاء کے بعد اگر بارش نہ ہو تو پہنچتا ہوں۔''
کہنے لگے ''میں نے بھی ایک فلم دیکھی تھی، اس میں ہیرو ہیروئن سے کہتا
ہے کہ میں تمہارے لیے آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتا ہوں۔''
ہیروئن کہتی ہیں ''ہم کل ملیں گے'' تو ہیرو فرماتا ہے ''اگر بارش نہ ہو تو''
اور پھر اُدھر سے کھنک دار ہنسی کی آواز آئی اور ٹاپک بدل گیا۔
''انھیں میں نے لائیٹر دیا۔ انھوں نے پوچھا '' آپ نے سگریٹ چھوڑ
دی ہے؟''
میں نے اثبات میں سر ہلایا تو مسکراتے ہوئے بولے:
''تو اسی لیے اپنی بلا میرے سر ڈال رہے ہیں۔''

مصنف نے شخصیتوں کو چلایا پھرایا بھی ہے اور اُن کی نفسیاتی کیفیت کو سمجھنے کی اور اُن کی نفسی

پیچیدگیوں کو سلجھانے کی طرف توجہ کی ہے۔ نفسیاتی تجزیہ بھی بڑا گہرا ہے۔ محمد محسن کی کمزوریوں پر سے ہمدردانہ طور پر پردے اٹھائے ہیں:

''چاہتے ہیں کہ محفل میں نگاہوں کا مرکز بنے رہیں اس لیے بے تکی باتیں، بیہودہ مذاق، بے ربط اداکاری سے بھی باز نہیں رہتے۔ آپ اردو کا ایک ادق لفظ بولیے، اس کا متبادل معلوم ہو تو بڑی معصومیت سے پوچھتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے نا؟ انگلش میں کہیے تو اردو کا سہارا لیتے ہیں اور اگر آپ ان کی کمزوری سمجھ جائیں اور Irritate ہوں تو کہتے ہیں آدمی مرنے تک طالب علم رہتا ہے۔ میں سیکھنے کے لیے پوچھ رہا ہوں جبکہ یہی بات وہ کئی بار پوچھ چکے ہوتے ہیں۔ ان کی یادداشت بہت کمزور ہے، ویسے جھوٹ پکڑا جائے تو بغلیں جھانکنے کے بجائے آپ سے لپٹ کر سونگھنے لگتے ہیں۔''

''پیدا ہوئے تو دائی نے غسل دیا، یہ کام اب غسال کو کرنا ہے۔''

''بشرٹ نیا، اس پر بغیر استری کی پرانی پتلون پہن لینے میں تکلف نہیں ہوتا کبھی شرٹ ان نہیں کرتے کہ پتلون کے لوپس میں بیلٹ کے بجائے ستلی کا استعمال کرتے ہیں۔ ہمیشہ باتھ روم سلیپر پہنتے ہیں جو ان کی سائز سے بڑی ہوتی ہے۔ شاید بڑھتے جسم سے ناامید نہیں۔''

محمد محسن کے کردار اور سیرت کے اونچ نیچ، مزاج کے اینچ پیچ، طبیعت کے رجحانات، نفسی کیفیات، الغرض ان کی زندگی کا ہر گوشہ و کونہ ان کی نظر میں آیا اور زندہ جاوید پیکر کو الفاظ کے قالب میں ڈھال دیا۔ عارف خورشید کا پروقار مزاج، تحریر کی شگفتگی، واقعات کی دروبست، شخصیت کی شش جہات کا فنکارانہ انعکاس اور سب سے زیادہ مصنف کا شفقتوں بھرا قلم، کسی شخص کو ایک عام آدمی کو دکھاتے ہوئے حد درجہ دلکش اور محبوب بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر الطاف قریشی کے خاکے میں شکل صورت، خاندانی حالات نفسیات کی اتھاہ گہری الجھنوں کا ذکر پیشہ سے وابستگی غرض ایسے پہلو منتخب کیے ہیں کہ شخصیت کی ذہنی افتاد، افکار و نظریات قاری کے سامنے عیاں ہو جاتے ہیں۔

کچھ خاکے بہت تفصیلی ہیں لیکن یہ تفصیلی ذکر ایسا نہیں کہ صرف ریکارڈ کا رجسٹر بن جائے بلکہ پورا ادبی حسن لیے ہوئے ہے اور دلچسپی سے معمور ہے۔ شخصیت کو پیش کرتے وقت انھوں نے فقروں کے ایجاز و اختصار اسلوب کے حسن و جمال اور اسلوب کے برمحل استعمال سے ایک سماں باندھ دیا ہے۔ زبان میں روانی ہے، فقرے تیز طرار، چست اور برجستہ ہیں۔ مکالمے برمحل ہیں۔ ہر ادیب کا اپنا مخصوص مزاج اور منفرد لب ولہجہ اور خاص طرزِ بیان ہوتا ہے۔ عارف خورشید کی زبان انفرادیت لیے ہوئے ہے۔ بیان کی جھلک ان جملوں میں ملاحظہ کیجیے:

''افسانہ لکھتے ہیں یا بیا گھونسلہ بناتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا۔''

''بس پورے ہاتھ میں دو ہی لائسنس ہیں ایک لکھنے کی اور ایک پیدل چلنے کی۔''

''مفلسی بشر نواز کی منکوحہ ہے جو پوت توڑ کر اور چوڑیاں پھوڑ کر ہی جائے گی۔''

''بشر نواز کی حرکات دیکھ کر یہ شبہ ہوتا ہے کہ جسم میں خون کے بجائے پارہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''مولانا ہماری ادبی گفتگو پان کے ساتھ چبا کر نگل چکے تھے لہٰذا اپنی ڈاڑھی لے کر میدانِ بحث میں کود پڑے۔''

''ریڈیو پر ان سے نیوز سن کر لگتا تھا کہ اختر الزماں ناصر بے وزن کلام سنا رہے ہیں۔''

''وجاہت قریشی کی زندگی ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ ہے۔''

''جس کے دم سے اورنگ آباد کی گلیوں میں اورنگ آباد دکن زندہ تھا ایک رکھ رکھاؤ، ایک وضعداری، ایک خلوص و شفقت کا سہانا پن ان گلیوں میں گھومتا پھرتا تھا، آج وہ کہیں کھو گیا۔''

خاکہ کسی شخصیت کو الفاظ و زبان کے ذریعہ حیات نو بخشتا ہے۔ اختر الزماں ناصر کا خاکہ ''آواز تم نے جب دی'' پڑھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخصیتیں آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں اور ہم ان سے مستفیض ہو رہے ہیں۔

خاکوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ مصنف نے شخصیت کے خاص پہلو کی طرف ابتدائی چند

جملوں میں اس طرح اشارہ کر دیا ہے کہ قاری کا ذہن خود بخود اُس طرف ملتفت ہو جاتا ہے کہ قلمکار کیا کہنا چاہتا ہے۔ محمود صدیقی کے خاکے کے ابتدائی جملے:

''عمر بڑھتی نہیں کم ہوتی جاتی ہے اسی طرح ترقی کا پیمانہ اپنی جگہ ہے، ترقی کرنے والے بدلتے رہتے ہیں۔ آج میں اس پیمانے سے محمود صدیقی کو ناپ رہا ہوں۔ جس طرح ہر دوڑنے والے کی توجہ آواز کی طرف ہوتی ہے وہ لمبی دوڑ میں پیچھے رہ جائے تو ناظرین کی پرواہ کیے بغیر دوڑتا رہتا ہے۔ جب وہ آگے نکلنے لگتا ہے تو دیکھنے والوں کی نظریں اس کے استحسان میں چلانے لگتی ہیں۔''

اشارہ کرتے ہیں کہ محمود صدیقی ترقی کی دوڑ میں بہت آگے نکل گئے۔ نہایت موزوں اور مناسب شعر سے خاکوں کی ابتداء کی ہے۔ شاہ حسین نہری کی شخصیت پر لکھا گیا مرقع افسانوی طرز لیے ہوئے ہے جیسے بچے کو کہانی سنا رہے ہیں۔ ان قلمی تصویروں کے عنوان بھی اُن کی تخلیقی ذہن کی پیداوار ہے۔

''مان اُس کو ہنر میرا'' ''میں ورنہ ہر لباس میں'' جیسے عنوان شخصیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مزاج سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے کثیر رنگوں سے مزین مجموعہ ''نظم و تنظیم'' کی عمدہ مثال ہے۔

مصنف کے انتخاب واقعات، ترتیب اور شعوری کوشش سے تشکیل پانے والے اسکیچ بے جان واقعات اور تفصیلات کا مجموعہ نہیں بلکہ حقیقت کو شرما دینے والی زندہ اور متحرک تصویروں سے انھوں نے ادب میں اضافہ کیا ہے۔

☆☆☆

بے ریا خاکہ نگار

(''تنظیم کثیر رنگی'' اور ''وقت کے چاک پر'' کی روشنی میں)

پروفیسر مظفر شہ میری

غالب اکادمی، دہلی کے رہائشی کمرے پر میں نے دستک دی۔ جن صاحب نے دروازہ کھولا تھا، ان کا تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ عارف خورشید ہیں۔ میں ان کے نام اور کام سے واقف نہ تھا۔ کمرے میں ان کے ساتھ محترم سلیم شہزاد بھی تھے۔ میری ان سے ملاقات تھی۔ چنانچہ ان سے علیک سلیک ہوئی۔

مجھے اس کمرے میں ان دونوں کے ساتھ تین دن گزارنے تھے۔ اس لیے میں نے کمرے اور عارف خورشید دونوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ عارف خورشید مجھے ایک عام سے آدمی لگے جن میں شاعروں اور ادیبوں جیسے چونچلے نظر نہ آئے۔ یہ بھی گمان گزرا کہ شاید وہ سلیم شہزاد کے دوست ہوں، جو ان کے ہمراہ دہلی گھومنے آگئے ہوں۔ سلیم شہزاد خاموش طبع آدمی ہیں اور عارف خورشید سے میری واقفیت نہیں تھی۔ چنانچہ کوئی وجہ نہ تھی کہ کمرے کی خاموشی مجھے اپنے شکنجے میں بری طرح نہ جکڑ لیتی۔

خدا خدا کرکے، بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کی شروعات بھی عارف خورشید ہی نے کی۔ وہ مجھ سے بڑی محبت سے گفتگو کرنے لگے۔ مگر برا ہو میری طبیعت کا کہ ان سے کھلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ قبض و بسط کی اس حالت میں ایک دن نکل گیا۔ دوسرے دن شام کو جب ہم سمینار سے لوٹے تو عارف خورشید سے بات کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ اب کے گفتگو کا آغاز میں نے کیا۔

میں ان دنوں ایک ناولٹ لکھنے کے زعم میں مبتلا تھا۔ خیال ہوا کہ میں اس کی کہانی عارف خورشید کو سناؤں۔ میں نے کہانی سنانی شروع کی۔ تھوڑی ہی کہانی سنائی ہوگی کہ عارف خورشید نے قطع کلام کرتے ہوئے فرمایا: ''بھائی میرے، اس میں کہانی کہاں ہے؟ مجھے یہ کسی کا سچا واقعہ لگتا ہے۔'' میں نے پوچھا: ''آپ نے کیوں کر جانا؟'' انھوں نے وضاحت کی: ''اس میں کہیں کوئی افسانوی جواز نہیں ہے

اور نہ افسانہ جیسی کوئی بات اس میں ہے۔'' عارف خورشید کا خیال صحیح تھا۔ وہ ایک سچا واقعہ تھا؛ کہانی نہیں تھی۔ میں نے اس کے بعد انھیں کہانی نہیں سنائی۔ لیکن ان کی گفتگو سے مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ ایک حقیقی واقعہ کو افسانے میں کیسے ڈھالا جا سکتا ہے۔ فکشن کا میرا یہ پہلا سبق تھا اور عارف خورشید سے بحثیت افسانہ نگار کے پہلا تعارف۔

بات سے بات نکلتی گئی۔ ایک بات یہ بھی نکلی کہ حیدرآباد کے فلاں معروف افسانہ نگار اور ان کی افسانہ نگاری کے تعلق سے ان کی ذاتی رائے کیا ہے؟ عارف خورشید نے ان کے نام سن کر ناک بھوں چڑھایا اور تحقیر آمیز لہجے میں کہا: 'ارے وہ! اسے تو افسانہ لکھنا ہی نہیں آتا۔' اس کے بعد، اس کی افسانہ نگاری پر بات ہوئی تو اس بار میرا تعارف ناقد عارف خورشید سے ہوا۔ یوں ان کے ایک ایک جوہر مجھ پر کھلتے گئے اور میرے دل میں ان کے لیے جگہ بنتی گئی۔ آمدم برسرِ مطلب۔ عارف خورشید سے جو ملاقات برائے نام سی تھی وہ اچھی خاصی دوستی اور محبت میں بدل گئی۔

دہلی سے لوٹنے کے بعد کئی دنوں تک ہماری بات نہیں ہوئی۔ ایک دن ان کا فون آیا کہ مجھے ان پر مضمون لکھنا ہے۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ کوئی مجھ سے اس طرح کی فرمائش کرتا ہے تو مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے اور میں کوشش کرتا ہوں کہ کسی طرح معاملے کو ٹال دوں۔ لیکن میں عارف خورشید کو 'نہ' نہ کہہ سکا۔ چنانچہ میں نے ان سے اپنی کتابیں بھجوانے کی گزارش کی جو جلد ہی آ گئیں اور آ کر میرے سینے پر چڑھ بیٹھیں۔ اس دوران میں میرا اورنگ آباد جانا ہوا اور ان سے ملنے کا موقع بھی ملا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں، جلد ہی اپنا مضمون بھیج دوں گا۔

اورنگ آباد سے لوٹنے کے بعد، میں نے سوچا کہ عارف خورشید کے خاکوں کے حوالے سے ان کے وژن کا مطالعہ کروں۔ کیونکہ میرا ماننا ہے کہ خاکہ نگار اپنے ممدوحوں میں اپنی ہی آئڈیل زندگی کو تلاشتا ہے۔ وہ یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی فکر و جذبے کے کون کون سے زاویے اس کے ممدوح میں موجود ہیں۔ چنانچہ میں نے یہی کچھ تحقیق کرنے کے ارادے سے ان کے خاکوں کے مجموعے ''تنظیم کثیر رنگی'' کو جیسے ہی کھولا، پہلے ہی صفحے پر موصوف نے وہ سب کچھ لکھ دیا تھا جسے میں اپنی دانست میں بڑی تحقیق کے بعد ثابت کرنے والا تھا۔ آپ بھی پڑھیے:

''میرا قلم افسانے کی گلیوں میں آوارگی کا شوقین ہے۔ مگر ڈاکٹر یوسف عثمانی

کی ہمت افزائی سے "تنظیم کثیر رنگی" ترتیب دے سکا۔ یہاں اس بات کا
تذکرہ بھی ضروری ہے کہ میرے افسانوی ذوق کو جلا محمود شکیل سے ملی۔
بشر نواز سے میں نے ادبی سوجھ بوجھ، جاوید ناصر سے کم گوئی،
ڈاکٹر یوسف عثمانی سے ہم دردی، ڈاکٹر ارتکاز افضل سے اپنائیت،
زاہد حسن خان سے مصلحت، قاضی رئیس سے محبت، مولانا رشید سے
اعتدال، محمود صدیقی سے لگن، وجاہت قریشی سے اپنی دھن میں مگن،
مظفر شطاری سے تجارتی قلابازیاں اور اختر حسین سے ہر حال میں خوش رہنا
سیکھا ہے۔اس لیے میں ان تمام کا ممنون ہوں۔" (تنظیم کثیر رنگی۔ص۶)

اب آپ ہی بتائیے میں ان کے وژن کے بارے میں نیا کیا لکھتا۔ جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ سب کچھ عارف خورشید نے کہہ دیا تھا۔لہٰذا میں نے پھر ایک بار عارف خورشید کو اٹھا کر رکھ دیا۔

میری اس شکست فاش کے بعد چند ہی دن گزرے ہوں گے کہ عارف خورشید کا دوبارہ فون آ گیا، بڑی سبکی محسوس ہوئی۔ میں نے ان کی کتابیں اٹھالیں اور کمپیوٹر کی اصطلاح میں ان کی براؤزنگ کرنے لگا تا کہ کوئی موضوع ہاتھ آجائے اور میری بات رہ جائے۔ میں نے ان کی شاعری پڑھی، دو ایک افسانے بھی دیکھے۔مگر میری نگاہ ٹھہری رہی ان کے خاکوں ہی پر۔ مجھے ان کے خاکے متاثر کرنے لگے تھے۔ان میں کوئی ایسی بات تھی کہ ان کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا تھا۔چنانچہ میں عارف خورشید کی خاکہ نگاری کی خصوصیات کو سمجھنے لگا جو کچھ اس طرح میری سمجھ میں آئیں۔

پہلی بات تو یہ کہ یہ تمام کے تمام خاکے ان لوگوں پر لکھے گئے ہیں جن کے ساتھ خاکہ نگار اٹھتا بیٹھتا ہے۔ یوں نہیں کہ فیض احمد فیض، احمد فراز، من موہن سنگھ یا سونیا گاندھی کو ایک بار کہیں دیکھ لیا اور ان پر خاکہ لکھ ڈالا۔ اردو والوں میں یہ وبا عام ہے کہ کسی مشہور شخص کے بارے میں کچھ لکھ دو اور تھوڑی شہرت کی کمائی کرلو۔ اللہ کا شکر ہے کہ عارف خورشید اس لشکرِ تعلق میں شامل نہیں ہیں۔ بایں وجہ ان خاکوں میں اخلاص اور سچائی کی کبھی نہ ختم ہونے والی خوشبو بسی ہوئی ہے جسے بین السطور میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔

میں نے اردو کے اکثر خاکوں میں دیکھا ہے خاکہ نگار اپنے ممدوح سے زیادہ خود اپنی تعریف

کی فکر میں گھلا جا رہا ہے۔ وہ بار بار ایسے مواقع ڈھونڈ نکالتا ہے جس سے اس کی اپنی تعریف کا کوئی پہلو نکل آئے۔ عارف خورشید نے عمداً ایسی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ بلکہ بعض جگہوں پر انھوں نے اپنے عیوب تک کو بیان کر دیا ہے۔ میں نے فی زمانہ کسی خاکہ نگار کو اتنا بے ریا نہیں پایا جتنا عارف خورشید کو پایا ہے۔ ثبوت کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

"میرے افسانے ڈاکٹر یوسف عثمانی کو کبھی پسند نہیں آئے۔ میں نے 'احساس کا زخمی مجسمہ' پر تبصرہ کہ خواہش ظاہر کی تو دیوان پر دراز ہو گئے اور خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا "میں تبصرہ کروں گا تو خلاف جائے گا۔" میں نے اصرار کیا کہ خلاف کیجیے۔ پھر ان کی گردن نے جھٹکا لیا اور زلفوں نے بھر کر کہا: 'مجھے ایسا ادب پسند نہیں۔ میں وہ افسانے پسند نہیں کرتا جن کے کرداروں کا جسم کپڑوں کے باوجود نظر آئے۔" ('ت ک ز'ص:۶۷)

ایک اور جگہ دیکھیے کس طرح وہ اپنے آپ پر ظلم کرنے پر تلے ہوئے ہیں:

"عارف خورشید کی صحبت میں مت رہیے۔ ورنہ بگڑ جائیں گے۔ کیوں کہ وہ sex پر لکھتا ہے۔ عقائد کے خلاف لکھتا ہے۔ مذہب بیزار ہے۔"
('ت ک ز'ص:۱۳۲)

ایک اور عیب ان کا یہ بھی دیکھ لیجیے:

"طلبا مجھے اس لیے بھی سلام کرتے تھے کہ میں کالج کی other activities میں زیادہ حصہ لیتا تھا اور عاشقی کے لیے جس بے خوفی کی ضرورت پڑتی ہے وہ مجھ میں تھی۔" ('ت ک ز'ص:۸۱)

وہی آدمی اپنے عیوب کو دوسروں پر ظاہر کرنے کی جرأت کر سکتا ہے جسے اپنے کردار پر مکمل بھروسہ ہوتا ہے جو آدمی اندر سے ڈھلمل ہوتا ہے وہ اس جسارت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

عارف خورشید نے اپنے ممدوحوں کے روشن پہلوؤں ہی کو نہیں دکھایا ہے بلکہ ان کی بشری کمزوریوں کو نہایت بے تکلفی سے بیان کیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے کہیں بھی نہ وہ تامل کرتے ہیں اور نہ ہی مضطرب ہوتے ہیں، بلا رنگ سے یہ خاکے ہمیں متاثر کرتے ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ چند مثالیں

ملاحظہ کیجیے:

''محمود شکیل، افسانہ جتنا اچھا لکھتے ہیں، پڑھتے اتنا ہی خراب ہیں۔

('ت ک ر'ص:۱۱)

ڈاکٹر یوشف عثمانی کے تعلق سے بیان بڑا خطرناک ہے:

''کسی کے مخالف ہو جاتے ہیں تو اس قدر سرد مہری کا برتاؤ کرتے ہیں کہ وہ خود دوبارہ ملنے سے گھبراتا ہے۔'' ('تک ر'ص:۷۰)

مولانا عبدالرشید ندوی کی اس کم زوری پر کیسے پردہ اٹھایا ہے، ملاحظہ کیجیے:

''کوئی ٹیڑھا شریر سا سوال کر دیتا ہوں تو وہ سوال کو غور سے اپنا سیدھا کان میری طرف کر کے سنتے ہیں۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ان کا بایاں کان سنتا ہی نہیں۔'' ('ت ک ر'ص:۱۳۳)

وجاہت قریشی کی کم زوری کو کس خوبی سے ظاہر کیا ہے، آپ بھی دیکھیے:

''وجاہت کو افسانہ لکھنا آتا ہے اور وہ افسانے کی بنت سے واقف ہے۔ افسانہ سنتا اور پڑھتا ہے اور افسانے پر بات بھی کر سکتا ہے، مگر ہر دوسرے آدمی کو اپنے سے بڑا سمجھنے کی نفسیاتی کم زوری کا شکار ہو جاتا ہے۔''

('ت ک ر'ص:۱۵۵)

اختر حسین کی یہ جوانی کی داستان بڑی دلچسپ ہے:

''اختر لڑائی جھگڑوں سے بہت پرہیز کرتا تھا مگر بس bus میں ہم لوگوں کے سہارے، معیار قائم رکھتے ہوئے لڑکیوں کو چھیڑا کرتا۔''

('ت ک ر'ص:۱۸۵)

جاوید ناصر کی جوانی کا یہ راز بھی سن لیجیے:

''شادی سے قبل انھوں نے فاحشاؤں کے کوچوں کی عملی سیر کی اور فراق گورکھپوری کے ہم رکاب بھی رہے۔'' ('وک چ پ'ص:۴۱)

دیکھا اس بے تکلفی کو، ان مثالوں کو پڑھتے ہوئے کیا ہمیں ایسا نہیں لگتا ہے کہ ایک گھنے

برگد کے پیڑ کے نیچے، چاندنی رات میں، دوستوں کی ایک محفل بجی ہے اور عارف خورشید اپنے دوستوں کی ممی کری mimicry کر رہے ہیں یا اپنے مخصوص طرزِ بیان سے دوستوں کو آئینہ دکھا رہے ہیں؟

جی ہاں! وہ یہی کر رہے ہیں اور نہایت سلیقے سے کر رہے ہیں۔

البتہ جب وہ اپنے ممدوح کا سراپا بیان کرتے ہیں تو اتنی چابک دستی کے ساتھ کہ ان کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ یہ کچھ نمونے دیکھیے:

ارتکاز افضل کا سراپا ملاحظہ کیجیے:

''اوسط جسم، میانہ قد، سر میں تیل، ٹیڑھی مانگ سیدھی جانب سے نکالی ہوئی، دانت ذرا بڑے اور ذرا سے اٹھے ہوئے مگر سلیقے سے جمے ہوئے، گول چہرے کا ایک لڑکا لائن میں نمبر ایک پر کھڑا ہوا تھا اور میں ساتویں نمبر پر تھا۔'' ('ت ک ر'، ص: ۸۰)

قاضی سلیم کا سراپا پڑھیے، لگے گا کہ وہ آپ کے سامنے کھڑے ہیں:

''رنگ کھلتا ہوا گندمی، پروقار تکون چہرہ، بڑا سر، کان ذرا سے بڑے، سوچی ہوئی غلافی آنکھیں، تیل لگا کر سلیقے سے جمائے ہوئے بال، مٹھی بھر جسم، ہاتھ میں سگریٹ، کبھی جلتی ہوئی اور کبھی جلنے کی منتظر انگلیوں سے کھیلتی ہوئی۔'' ('و ک چ پ'، ص: ۵۵)

مجھے رعنا حیدری کا سراپا بھی عمدہ لگا:

''رعنا حیدری کا رنگ گندمی، چہرہ لانبا، جو ذہانت کی علامت ہے۔ سر بھی لانبا۔ ناک آنکھوں کے قریب پہنچ کر ذرا دب گئی ہے۔ پیشانی چوڑی، قد پانچ فٹ پانچ انچ، صحت مند جسم، چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی ہیں۔ مختصر یہ کہ اپنی نظموں کی طرح شگفتہ وشائستہ ہیں۔ ہمیشہ یوسف عثمانی کے ساتھ اسکوٹر پر دکھائی دیتی ہیں۔ سلام کا جواب مسکرا کر دیتی ہیں۔ محفلوں میں کم جاتی ہیں۔ اپنا کلام بہت بہت اصرار کے بعد سناتی ہیں۔''

('ت ک ر'، ص: ۷۰)

اتنا پڑھ لینے کے بعد ان ہستیوں کے بارے میں کیا باقی رہ جاتا ہے کہ ہم سوال کریں کہ وہ کون ہیں اور کیا ہیں؟ خاکہ نگاری کی یہی خوبی ہے جو عارف خورشید کے خاکوں میں بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھیں عارف خورشید جیسا دوست اور خاکہ نگار ملا کتنے لوگوں کو یہ نصیب ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کے آئینے میں اپنی صورت دیکھیں۔ ممکن ہے اس طرح دیکھنے والوں کو اپنی صورت اجنبی سی معلوم ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی شخصیت کے کسی خاص پہلو سے واقف ہی نہ ہوں۔ کبھی کبھی خاکہ نگار اسے ایک نئی شخصیت سے واقف کراتا ہے۔ عارف خورشید نے اپنے دوستوں کے حق میں وہی کام کیا ہے۔

عارف خورشید کے خاکوں کی ایک نرالی بات یہ بھی ہے کہ وہ جس کا خاکہ کھینچتے ہیں، اس کے افرادِ خاندان کا کہیں اجمالی طور پر کہیں نہایت تفصیلاً ذکر کرتے ہیں۔ بعض مقامات پر لگتا ہے کہ اگر اس مقام پر کسی فردِ ممدوح کی نصف بہتر کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں یہ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی کہ ایک مرد کی زندگی میں اس کی شریک حیات کا کتنا دخل ہوتا ہے۔ چند مثالیں:

> ''ڈاکٹر عثمانی ماں کی گود سے محروم رہے اور سوتیلی ماں نے انھیں پال پوس کر بڑا کیا۔ یہی معاملہ ان کی شریک حیات رعنا حیدری کا بھی تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے دکھ سکھ اس تناظر میں کیسے کیسے نہ بانٹے ہوں گے۔ کتنی محبت ان میں پیدا نہ ہوئی ہوگی اور ان دونوں نے ایک دوسرے کی کیسے کیسے نہ دل جوئی کی ہوگی۔ حتیٰ کہ وہ ایک دوسرے کے لیے Made for each other بن گئے ہوں گے۔'' ('ت ک ر'، ص:۶۶-۶۷)

اسی طرح وہ ارتکاز افضل کی نجی زندگی میں جھانک کر کہتے ہیں:

> ''جب تک بھابی ان کے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں نہیں پھیرتیں، انھیں نیند نہیں آتی۔'' ('ت ک ر'، ص:۸۳)

شطاری کی رفیقۂ حیات کی سلیقہ مندی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''مکان کو دیکھ کر اہلیہ اور فیکٹری کو دیکھ کر شطاری کے رکھ رکھاؤ کا پتہ چلتا ہے۔'' ('ت ک ر'، ص:۱۸۵)

یہ اور ایسی کئی مثالیں ہیں جہاں عارف خورشید نے ممدوح کے علاوہ اس کے متعلقین کا ذکر کر کے خاکے میں گھریلو اور اپنائیت کا رنگ پیدا کیا ہے۔

عارف خورشید افسانہ نگار بھی ہیں اور وہ شاعر بھی عمدہ ہیں۔ان دونوں صلاحیتوں سے انھوں نے بڑا کام لیا ہے۔خاکوں میں افسانہ نگاری کا یہ رنگ دیکھیے:

ذیل کے اقتباس کو پڑھتے ہوئے لگے گا کہ آپ کسی افسانے کی پہلی چند سطریں پڑھ رہے ہیں:

> ''زاہد حسن خان آستین میں سانپ پالنے کے عادی ہیں جو انھیں اور ان کے بھائیوں کو ڈستے رہے ہیں۔اب آنے والی نسل کو بھی ڈس رہے ہیں۔ چوں کہ سانپ ان کے دوست ہیں اس لیے وضاحت کا یہ جواز بھی باقی نہیں رہتا کہ مخالفت دشمنی میں کی جارہی ہے۔'' ('ت ک ر'،ص:۹۷)

رشید انور کا جب جنازہ اٹھا تو:

> ''جنازہ مسجد سے نکلا۔ ہم لوگ کاندھا دینے کے بعد پیچھے چل رہے تھے۔ مجھے رشید انور کے دونوں ہاتھ جنازے کے باہر خالی نظر آئے۔سوچا جنازے کو رکوا کر کہوں کہ ان کے ہاتھ تو اندر کر دیجیے۔مگر ہمت نہیں ہوئی کہ وہ کسی کو دکھائی نہیں دے رہے تھے۔'' ('وک چ پ'،ص:۱۰۵)

آیئے اب شاعرانہ اندازِ بیان کی کچھ مثالیں دیکھیں:

> ''حقیقی عشق دل میں ایک شعلہ سا لپکا دیتا ہے۔'' ('ت ک ر'،ص:۱۷)

ایک اور مثال:

> ''رات مدہوشی کے عالم میں ڈھل جائے گی، پگھل جائے گی، پگھلا ہوا موم سورج کی تمازت کی پروا کیے بغیر پھر سے جلنے کے لیے تیار ہو جائے گا مگر حقیقت کے چہرے سے نقاب کون ہٹائے؟ اگر نقاب الٹنے کی ہمت کسی نے کی تو وہ اپنا ذہنی توازن باقی نہ رکھ پائے گا۔''
>
> ('وک چ پ'،ص:۹۵)

ایک اور مثال:

"جس طرح سورج خون کے آنسو رو کر سمندر میں پناہ گزیں ہو جاتا ہے
اسی طرح میں بھی سمجھوتے کی چادر اوڑھ کر غائب ہو جاتا ہوں۔"

('وک چ پ'، ص:۸۲)

تاہم کہیں کہیں عارف خورشید ہمیں اس افسانوی اور شاعری کے چمن زار سے نکال کر یکا یک رپورٹنگ کے صحرا میں لے چلتے ہیں۔ ایسی جگہوں پر خاکے کا تخلیقی جوش ٹھنڈا پڑ کر اخبار کی رپورٹ کی طرح خشک ہو جاتا ہے۔ مثلاً: ارتکاز افضل کے بیرونی ممالک کے دوروں کے تعلق سے جو کچھ عارف خورشید نے لکھا ہے وہ خشک رپورتاژ کے سوا کچھ نہیں۔

"اپنے کینیڈا کے دورے کے بعد وہ حکومت امریکہ کی دعوت پر امریکن یونیورسٹیز کے دورے پر روانہ ہو گئے...... امریکہ میں قیام کے دوران ڈاکٹر ارتکاز افضل کو IVP یعنی بین الاقوامی وزیٹر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا جس کے تحت کے سارے اخراجات میزبان ملک نے اٹھائے۔ حتیٰ کہ ٹیکسی کا کرایا اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک ہوائی سفر کے اخراجات بھی میزبان ملک ہی نے ادا کیے۔"

('ت ک ر'، ص:۹۵)

یا کبھی کبھی سمینار کا خشک تنقیدی یا تحقیقی مقالہ: قاضی سلیم کے بارے میں قاضی جمال کے یہ اقتباسات ان کے خاکے کا جزو نہیں معلوم ہوتے بلکہ کسی سنجیدہ مقالہ کا حصہ لگتے ہیں۔

قاضی جمال حسین نے لکھا ہے:

"جب نظم کی فضا سیال بلکہ تجریدی صورت حال پر قائم ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں کسی واضح نتیجے تک پہنچنے کے بجائے قاری متن کے مبہم اشاروں سے خود ایک ذہنی تصویر بنا لیتا ہے اور اپنے طور پر معانی کے نئے نئے ملبوس میں دیکھتا ہے۔"

قاضی جمال آگے لکھتے ہیں:

''قاضی سلیم کی شعری کائنات کبھی تو ایک نقطے میں سمٹ آجاتی ہے اور کبھی افق کے پار اتھاہ وسعتوں تک دراز ہو جاتی ہے۔'' (وک چ پ، ص:۶۱)

عارف خورشید کے خاکوں کی ایک اور خصوصیت ان میں موجود دانش پارے ہیں۔ وہ لکھتے ہوئے اپنی زندگی کے بہترین تجربات کو لفظوں کے چھوٹے چھوٹے کوزوں میں بند کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے خاکوں کے وزن و وقار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ چند مثالیں آپ بھی ملاحظہ کریں:

''ایک اچھا فن کار اپنی تخلیقات میں زندہ رہ جاتا ہے اور ایک اچھا استاد اپنے شاگردوں میں۔'' (ت ک ر، ص:۱۵۰)

انسانی رویوں کے تعلق سے یہ بیانِ بلیغ ملاحظہ ہو:

''سخت رویہ تو ہر ایک اپنا سکتا ہے مگر موم کی وہ سختی جو احساس کی گرمی سے پگھل جائے ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔'' (ت ک ر، ص:۱۵۵)

دنیا نے محبت کو ہمیشہ اندھی کہا ہے۔ عارف خورشید اس بیان کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''محبت اندھی کبھی نہیں ہوتی۔ یہ محبت پر الزام ہے، محبت تو دیکھتی، محسوس کرتی، سوچتی، جاگتی، دوڑتی بھاگتی، اور قائم و دائم ازل تا ابد، بہتی ندی ہے۔'' (ت ک ر، ص:۱۷۸)

شرافت اور چالاکی کو جوڑ کر کیا پتے کی بات کہی ہے دیکھیے:

''شریف آدمی جب چالاک بننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔'' (وک چ پ، ص:۶۱)

فطرت کبھی بدلتی نہیں۔ یہ بیان ملاحظہ کیجیے:

''پیشے، طبقے اور علاقے سے فطرت کو فرق نہیں پڑتا۔ عادات بدلی جا سکتی ہیں۔ فطرت تو انسان لے کر پیدا ہوتا ہے اور لے کے کر مرتا ہے۔''
(ت ک ر، ص:۱۳۴)

دوستی اور دشمنی کے تعلق سے عارف خورشید کا یہ خیال دیکھیے:

'وجود دشمنی کا ہے، دوستی تو فرضی چیز ہے۔ دشمنی کو معیار بنا کر دوستی نام دے دیا گیا ہے۔ کم دشمنی معیاری دشمنی۔'' ('ت ک ر،ص:۱۳۹)

تیز رفتار زندگی کے ساتھ کیوں کر نبھائی جائے:

''میاں زندگی رفتار سے عبارت ہے۔ سست رفتاری تڑپ تڑپ کر مرنے کا عمل ہے۔ وقت کم ہے، زندگی اپنے کاموں کے لیے مختصر ہے۔''

('ت ک ر،ص:۱۵۷)

میں اس ضمن میں ان ہی دو چار مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ ڈھونڈنے پر کچھ اور مثالیں مل جائیں گی۔ عارف خورشید کے خاکوں سے ان کی تنقیدی بصیرت بھی جھلکتی ہے۔ مثلاً بشر نواز کی شاعری پر ان کی تنقیدی رائے کچھ اس طرح ہے:

''ان کی شاعری اپنے عہد سے جڑی ہونے کے باوجود بڑی شاعری ہے۔ پیچیدگی سے گریز کرتے ہیں۔ تہہ داری کے قائل ہیں۔ ان کی شاعری لفظوں کے پیچھے جھانکتے جذبوں اور احساسات کے الاؤ سے اٹھتی چنگاری کی شاعری ہے۔'' ('ت ک ر،ص:۱۷-۱۶)

شاعری کے تعلق سے عارف خورشید کی یہ رائے بڑی اہمیت کی حامل ہے:

''شاعری تو وہ ہوتی ہے جو کیفیات کو کیچ کر سکے۔ الفاظ بڑے اور بات چھوٹی، مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ جیسے دھیمی دھیمی برسات زمین کی تہہ تک بھگوتی۔ زندگی جھیلنی پڑتی ہے۔ دوسروں کے تجربوں سے اخذ کرنے میں مزا نہیں آتا۔ مرعوب کن الفاظ جمع کرنا مشکل نہیں، سیدھے سادھے الفاظ ہوں، برق کی سی کیفیت ہو تو مزا آتا ہے۔'' ('ت ک ر،ص:۲۸)

فن ہی کے تعلق سے ان کا یہ بیان بھی ملاحظہ کیجیے:

''فن تو وہ قد آدم آئینہ ہے جس کے سامنے کپڑوں کے باوجود آدمی برہنہ نظر آتا ہے۔ اپنے آپ کو باحیا ثابت کرنے کے لیے آئینے کو لات مار کر توڑنے والا یہ کیوں نہیں سوچتا کہ وہ ٹکڑوں ٹکڑوں میں برہنہ ہو جائے گا۔''

('ت ک ر،ص:۲۸)

اردو تنقید کی موجودہ صورت حال پر ان کی یہ رائے قابلِ توجہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو ادب میں فن کو نقصان نقاد کی تن آسانی سے پہنچا ہے۔ ایک نقاد اگر کوئی بات کہہ دے تو بس وہی سکہ رائج الوقت ہو جاتی ہے۔ دوسرا خود غور و خوض کی زحمت گوارا نہیں کرتا اور پھر مضامین قلم برداشتہ ہو جاتے ہیں۔'' ('وک چ پ'، ص:۴۲)

جزئیات نگاری سے خاکے میں جان پڑ جاتی ہے۔ عارف خورشید نے اس کا بڑا خیال رکھا ہے۔ انھوں نے ارتکاز افضل کی عادتوں کو بیان کرتے ہوئے کس قدر جزئیات سے کام لیا ہے دیکھیے:

''اور اپنے مخصوص انداز میں پورا منہ کھول کر ہنستے ہوئے کھوپڑی کے بال شہادت کی انگلی سے کھجانے لگے۔ یہ ان کی عادت ہے۔ جب بہت خوش ہوتے ہیں تب ایسا کرتے ہیں اور جب بہت پریشان ہوتے ہیں تب بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ ان کی اس حرکت سے انھیں نشہ آتا ہوگا۔''

('ت ک ر'، ص:۸۳)

زاہد حسن خان کی چشمہ لگانے کی عادت اور اس کی جزئیات ملاحظہ کیجیے:

''چشمہ پڑھتے وقت لگاتے ہیں۔ بیٹھے سوچ رہے ہوں تو چشمہ ہاتھ میں لیے گھماتے رہتے ہیں اور کھڑے ہوں تو دونوں ہاتھ پہنچوں سے ہلاتے رہتے ہیں۔ خدوخال کے اعتبار سے ہاتھوں کے پنجے بڑے ہیں۔ جو فیصلہ کا لمحہ گزرنے سے پہلے سامنے والے تک پہنچ جاتے ہیں۔''

('ت ک ر'، ص:۲۸)

طوالت کے خوف سے یہاں دو ہی مثالیں دی گئیں ہیں۔

انشائیہ اور خاکوں ہی پر کیا منحصر ہے ہر صنف شعر و ادب کے لیے شگفتہ بیانی بہ منزلہ روح کے ہوتی ہے۔ چونکہ عارف خورشید کمالِ بے تکلفی کے ساتھ اپنے خاکے لکھتے ہیں اس لیے شگفتگی از خود پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً:

''اس تناظر میں بشر نواز کو دیکھا تو محسوس ہوا کہ ان کے چہرے کا عکس جھیل میں لہرا رہا ہے۔'' ('ت ک ر'، ص:۱۸)

ایک اور مثال:

''تب ماضی اپنی تمام تر حماقتوں کے ساتھ چنبیلی کے منڈوے تلے سے نکل کر سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ آج اس جگہ منڈوا باقی نہیں مگر چنبیلی کی خوشبو وہیں باقی ہے۔'' (ت ک ر، ص: ۱۲۹)

اردو والوں پر کوئی اتنا تیکھا طنز کر کے دکھائے:

''ہر نوجوان جس پر اردو کا آسیب سوار ہو جاتا ہے وہ شاعری پر اتر آتا ہے۔'' (ت ک ر، ص: ۱۴۳)

محمود صدیقی کے تعلق سے یہ جملہ ملاحظہ کیجیے۔ مجھے یقین ہے کہ اسے پڑھ کر خود محمود بھی خوش ہوئے ہوں گے۔

''تحریکوں اور جماعتوں سے وابستہ اور اتنے پڑھے لکھے شخص کے بارے میں سن کر محسوس تو یہی ہوتا ہے کہ یہ اپنی زندگی میں مولانا مودودی، مولانا آزاد، اورنگ زیب، غالب، جوش، برنارڈ شاہ، ڈاکٹر رسل، رابرٹ فراسٹ، اور رادھا کرشنن وغیرہ سے متاثر ہوں گے۔ مگر یہ زندگی میں اپنی والدہ ہی سے متاثر ہیں جن کے انتقال اس وقت ہوا جب یہ گیارہ ماہ کے تھے۔'' (ت ک ر، ص: ۱۴۶-۱۴۵)

بی ایڈ ہی کے اساتذہ کا طریقہ نہیں بیشتر اساتذہ کا یہی طریق ہے۔ آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔

''سمجھانا اور سمجھ میں نہ آئے تو الجھا دینا B.Ed. کے لکچررس کا طریقۂ کار ہے۔'' (ت ک ر، ص: ۱۴۵)

آج کل اردو اساتذہ کتنے قابل ہیں عارف خورشید کی زبانی سنیے:

''رہی زبان کی غلطیاں تو وہ اردو لکچررس سے بھی ہو جاتی ہیں۔ املا کی غلطی تو کاتب کے سر منڈھ جاتی ہے۔'' (ت ک ر، ص: ۱۵۵)

مدرسین کی اولادیں اکثر بگڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ کیوں وجہ عارف خورشید سے معلوم کیجیے:

''وجہ صاف ہے کہ خدا موجود ہے جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے وہ

خود بچ نکلے تو اس کی اولاد گرتی ہے۔'' (ت ک ر،ص:۱۶۱)

وجاہت قریشی خادم اردو ہیں۔مگر اورنگ آباد میں کتنے لوگ ہیں جو خادم اردو بنے پھرتے ہیں مگر اصل میں وہ ہیں نہیں۔ان کے تعلق سے عارف خورشید کا یہ بھر پور طنز ملاحظہ کیجیے:

''میں تو نادم اردو ہوں ...... اورنگ آباد میں یہ سب موجود ہیں اور آپ سب کو جانتے ہیں بس پہچاننے میں تھوڑی دقت ہوگی۔یعنی فسادِ اردو، باوائے اردو، نگاہِ اردو، شرمندۂ اردو، فخر اردو، الزام اردو، فقیر اردو، روایت اردو، زعمِ اردو، ناز اردو، جسم اردو، جان اردو، شان اردو، مقام اردو، ہجرت اردو، فالج اردو، شجر اردو، داغ دھبہ اردو، بدکلام اردو، شر اردو، جنازہ اردو وغیرہ وغیرہ۔'' (ت ک ر،ص:۱۶۰)

اب آیئے طنز ومزاح کی محفل سے نکل کر فن کی دنیا کی سیر کریں۔

بات ہم تشبیہ سے شروع کریں گے۔ ہر چند تشبیہ اور استعارہ شاعری کے لوازمات میں شمار ہوتے ہیں مگر نثر نگاروں نے ان سے بڑے بڑے کام نکالے ہیں۔ عارف خورشید نے بھی ان لوازماتِ شاعری سے اپنے خاکوں میں حسن پیدا کیا ہے: چند مثالیں:

''محمود شکیل ، افسانہ لکھتے ہیں یا بیا کا گھونسلا بناتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا۔'' (ت ک ر،ص:۹)

ڈاکٹر عثمانی کے تعلق سے لکھتے ہوئے کیا خوب صورت تشبیہ استعمال کی ہے:

''زبان کے آدمی ہیں اس لیے صحیح محاوروں میں الجھے رہتے ہیں۔محاوروں کے پودے میں نئی کونپلوں کے قائل نہیں۔'' (ت ک ر،ص:۶۸)

آج کے اردو اخبار کے لیے یہ تشبیہ کتنی بلیغ ہے کہنے کی ضرورت نہیں ہے:

''آج اخبار کی اشاعت کتبہ کی طرح ہے جس پر صاحب مزار کی ڈگریاں لکھی ہوں جو فاتحہ پڑھنے والے کی نہ مزار پر اُگے سبزہ چرنے والے کی کسی کام کی ہیں۔'' (ت ک ر،ص:۱۰۲)

یہ خوب صورت تشبیہ ملاحظہ کیجیے:

''ان کی یہ خامی دوستی کی ڈور میں گرہ کا کام کرتی ہے۔'' (ت ک ر،ص:۱۲۳)

اور یہ تشبیہ بھی:

''پیمانے نہیں بدلتے چیزیں بدلتی ہیں۔ جس طرح بٹن کبھی چھوٹے نہیں ہوتے کاج بڑے ہو جاتے ہیں اسی طرح عمر بڑھتی نہیں کم ہو جاتی ہے۔''

(ت ک ر،ص:۱۴۰)

اور یہ تشبیہ:

''وجاہت قریشی کی زندگی ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا ایک چشمہ ہے۔''

(ت ک ر،ص:۱۵۳)

اور یہ دو تشبیہی نشرابِ دو آتشہ کا کام کر رہی ہیں:

''حیاتِ مختصر میں پہاڑ جیسی زندگی گزارنا اور وہ بھی حالات کا تیشہ لیے، ایک حساس دل انسان کے لیے جب دو بھر ہو جاتا ہے۔'' (ت ک ر،ص:۱۸۰)

شمیم احمد کی طبعی خشکی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وہ تنقید کی طرح خشک آدمی تھے۔'' (ت ک ر،ص:۱۸۴)

ایک عمدہ استعارہ کئی پیراگراف کا مواد ایک لفظ میں ظاہر کر دیتا ہے۔ عارف خورشید نے یہ استعارے تخلیق کیے ہیں:

No Ball کرکٹ کی اصطلاح ہوتو ہو، عارف نے اسے بڑا بلیغ استعارہ بنا دیا ہے:

''محمود شکیل کو ذرا سا بھی سیاسی شعور نہیں۔ بس اخبار پڑھ کر کچھ بحث و مباحثے میں حصہ لیا تو، ایسا نہیں ہونا چاہیے، ایسا کرنا مناسب نہیں، یہ بری بات ہے، جیسے اخلاقی جملوں سے بحث میں No Ball پھینک کر خاموش ہو جاتے ہیں۔'' (ت ک ر،ص:۱۳)

زاہد حسن خان کے دشمن بہت ہیں۔ اژدھے سے بڑھ کر دشمن کا استعارہ کیا ہو سکتا ہے:

''ان کی پٹاری میں ایک اژدھا بھی ہے۔ اگرچہ اس کا زہر نکال لیا گیا ہے۔'' (ت ک ر،ص:۹۸)

استعارہ بالکنایہ کی ایک مثال:

''اب بھی ان سے ملنے کا اشتیاق ٹھاٹھیں مارتا ہو تو مجبور ہوں۔''

(ت ک ر، ص: ۱۱۵)

استعارہ کی اسی قسم کی ایک اور مثال:

''کچھ خوش نصیب میٹرک تک آ کر ہانپنے لگے۔''

(ت ک ر، ص: ۱۱۶)

پتھر کا یہ استعارہ آپ کی توجہ چاہتا ہے:

''زندگی میں وقت کے پتھراؤ نے کچھ پتھر مجھے بھی تھما دیے۔''

(ت ک ر، ص: ۱۲۷)

محمود صدیقی نے گھریلو جھگڑوں سے تنگ آ کر علاحدہ گھر لینے کا ارادہ کیا تا کہ وہ اپنی بیگم کو علاحدگی کا سبق سکھائیں۔ اس موقع پر عارف خورشید نے دیکھیے Lesson Plan جیسا بلیغ استعارہ استعمال کر کے کیا لطف پیدا کیا ہے:

''یہ اپنے والدین کو چھوڑ کر رہنے کے لیے رضامند نہیں تھے مگر بیوی کو الگ رہنے کا Lesson دینے کے لیے علاحدگی پر رضامند ہو گئے۔ بیوی خود ہی Lesson Plan سمجھ گئی اور معاملہ اپنی موت آپ مرا۔''

(ت ک ر، ص: ۱۴۹)

استعارہ تمثیلیہ کی یہ خوب صورت مثال:

''میری خوش نصیبی اچھے دوست رہی ہے میں نے اپنی ساری زندگی جدوجہد کی نذر کر دی۔ پہاڑ کھود رہا ہوں ہر جگہ مجھے کوئلہ کی کانوں کے دہانے ہی ملے۔ کانوں میں ہیروں کے امکانات سے میں پُر امید ہوں۔'' (ت ک ر، ص: ۱۷۹)

صنعتوں میں عارف خورشید نے صنعت عکس کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے۔ کچھ مثالیں:

''دوسروں میں خود کی تلاش اور خود میں دوسروں کی کھوج بشر نواز سے

کہلواتی ہے۔'' ('ت ک ر'،ص:۱۹)

ارتکاز افضل کی یہ خصوصیت صنعت عکس کے حوالے سے دیکھیے:

''وہ ہر برائی سے اچھائی اور ہر اچھائی سے برائی نکال لینے میں طاق۔''

('ت ک ر'،ص:۹۴)

جاوید ناصر کے تعلق سے یہ بیان ملاحظہ ہو:

''جاوید ناصر دوستوں کے ایسے دشمن ہیں کہ ان کے فن پر کھلی تنقید سے گریز نہیں کرتے اور دشمنوں کے ایسے دوست کہ ان کی خوبیوں کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔'' ('ت ک ر'،ص:۵۹)

ایک مثال یہ بھی:

''وہ بگڑے ہوئے کب ہیں جو سدھر جائیں گے اور میں سدھرا ہوا کب ہوں جو بگڑ جاؤں گا۔ ('ت ک ر'،ص:۱۳۲)

کہیں کہیں صنعت تجنیس سے بھی فائدہ اٹھایا ہے:

ڈاکٹر یوسف عثمانی اور ان کی شریک حیات رعنا حیدری ایک جان دو قالب ہیں۔ اس فقرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عارف خورشید نے یہ فقرہ تخلیق کیا ہے جو صنعت تجنیس کی مثال بن گیا ہے:

''یہ زندگی میں ایک جان دو قالب تو ہیں مگر انھوں نے اپنا پہلا شعری مجموعہ ''آئینے'' کو ایک جلد دو طالب کر دیا ہے۔'' ('ت ک ر'،ص:۷۰)

''محمود رنگ محل کو سنائی کم دیتا تھا اور محمود صدیقی کو بجھائی کم دیتا تھا۔''

('ت ک ر'،ص:۱۴۵)

صنعت مبالغہ کی یہ مثال دیکھیے۔ شطاری کو ہر قسم کے پودے جمع کرنے کا شوق ہے۔ ان کے اس شوق کے تعلق سے عارف خورشید کا یہ بیان مزہ دے جاتا ہے۔

''ان کا بس چلتا تو یہ اپنے کندھوں پر گملے رکھ لیتے۔ وہ تو اچھا ہے کہ کندھے خالی نہیں۔ ذمہ داریوں کا بوجھ پہلے ہی سے دھرا ہے۔''

('ت ک ر'،ص:۱۷۲)

عارف خورشید کو اپنے دکنی ہونے پر بڑا فخر ہے۔ خاکوں کے بین السطور میں یہ احساس قاری کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ مثلاً:

''سرزمین دکن کا راوی کہتا ہے کہ یہاں کی ادبی روایت شاعری تک محدود رہی۔ مگر آج یہ سرزمین نظم ونثر کے ملاپ سے روایت کی بہتی ندی پر پل باندھنے کا کام کر رہی ہے۔'' ('ت ک ر' ص:۷)

عارف خورشید نے قاضی سلیم کے حوالے سے دکنی کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے اس میں دکنی سے ان کے بھی محبت جھلکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

حضرت شاہ سراج کا جشن منانا تھا تو قاضی سلیم نے ''مصرعِ طرح کے لیے ایسے قافیے لیے کہ لوگ مجبوراً دکنی انداز میں غزل لکھیں گے۔''

('وک چ پ' ص:۵۸)

آگے چل کر قاضی سلیم کہتے ہیں:

''دکنی میں کیا بیوٹی ہے دیکھیے۔ اگر یہ روایات یوپی، نارتھ انڈیا جاتیں تو ہماری اردو شاعری بالکل مختلف ہوتی۔ یہ دھرتی سے جڑی شاعری ہے۔ قلی قطب شاہ کی جو میوزک دکنی Poetry میں ہے اس کا تو جواب نہیں۔'' آگے چل کر قاضی سلیم نے ایک اور پتے کی بات کہی ہے۔ ''ہم میوزک سے بھی گئے اور اپنی دھرتی سے بھی کٹ گئے اور جا کر ایران سے ملے۔'' ('وک چ پ' ص:۵۸-۵۹)

دکنی سے محبت اپنی جگہ پر، مگر جب دکنی الفاظ یا دکنی کے مہمل الفاظ بطور مترادفات کے استعمال ہوتے ہیں تو ہمیں تامل کرنا پڑتا ہے: مثلاً 'گوراچٹا' کو 'گورا گمٹا' ('ت ک ر' ص:۱۰۰) کہنا خالص دکنی زبان کی دین ہے۔ دکنی میں ناول اور ناولٹ کو مونث بولنے کا رواج ہے۔ عارف خورشید بھی یہی استعمال کرتے ہیں۔ ('ت ک ر' ص:۹) بشر نواز کے تعلق سے لکھتے ہیں: 'سیدھا ہاتھ سیدھی جانب پھراتے ہوئے کہتے ہیں۔' ('ت ک ر' ص:۲۴) ایک اور جگہ یوں تحریر کرتے ہیں: 'مفلسی بشر نواز کی منکوحہ ہے جو پوت توڑ کر اور چوڑیاں پھوڑ کر ہی جائے گی۔' ('ت ک ر' ص:۲۶)۔ ایک اور جگہ لکھا

ہے: 'حمید سہروردی کے بارے میں ایک بھی غیر غلط بات شاہ حسین نہری سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔' (وک چ پ، ص: ۸۵) محمود صدیقی کو ان کی چال کی وجہ سے نیشنل اسکول کا ہولا اور غلامانہ ذہنیت کا روایتی مدرس سمجھتا تھا۔ ('ت ک ر، ص: ۱۵۰) غلط اردو لکھنے اور بولنے والے پر یہ جس قدر جلتے او نٹتے ہیں شاید اپنی قسمت پر اتنا پیچ وتاب نہیں کھاتے ہوں گے۔' ('ت ک ر، ص: ۳۴)۔ ان مثالوں میں 'ہاتھ پھراتے ہوئے' پوت توڑنا اور چوڑیاں پھوڑنا' 'غیر غلط' 'ہولا' اور 'جلنا اونٹنا' وغیرہ جیسے الفاظ اور فقرے دکنی زبان سے ماخوذ ہیں جن کے نعم البدل معیاری اردو میں موجود ہیں۔

ہاں تو دوستو! یہ رہا عارف خورشید کی خاکہ نگاری کا مختصر جائزہ۔ اس مختصر سے تنقیدی مطالعہ کے بعد میں اپنے دل کی بات کہنا چاہوں گا۔ عارف خورشید نے جن لوگوں کے یہ خاکے لکھے ہیں، ان میں اتنی خوبیاں ہیں کہ بے محابا میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی ادب کی اس کہکشاں کا حصہ بن جاؤں اور ان سے دوستی گانٹھ لوں؛ ایسے دردمند، انسان دوست، رحم دل، پاکیزہ طینت، جہدِ مسلسل کرنے والے اور شعر و ادب کا اعلا پایے کا شعور رکھنے والے لوگ اب اردو بازار میں کم ہی دکھائی دیتے ہیں۔ عارف خورشید نے ان لوگوں کے خاکے لکھ کر دراصل چند عمدہ شخصیتوں کے نمونے اردو ادب کو دیے ہیں۔

☆☆☆

متحرک قلمی تصویریں

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط

اردو میں خاکہ نگاری کو مرقع نگاری یا قلمی تصویر کشی بھی کہتے ہیں۔ پین پورٹریٹ (Pen portrate)، اسکیچ (Sketch) اور کیری کیچر (Cari cature) جیسے انگریزی الفاظ ہی کے یہ متبادل ہیں۔ خاکہ نگاری ایسی قلمی تصویر کشی ہوتی ہے جس میں شخصیت کے نہ صرف یہ کہ ظاہری اوصاف نمایاں ہوتے ہیں بلکہ داخلی اوصاف بھی کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ اس اعتبار سے خاکہ نگاری مصوری سے اعلیٰ و افضل فن قرار پاتا ہے۔ بعض ناقدین نے خاکہ نگاری کے لیے مزاحیہ عنصر کو ضروری قرار دیا ہے لیکن ہم مولوی عبدالحق کی ''چند ہمعصر'' اور منٹو کی ''گنجے فرشتے'' کا بغور مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں سنجیدگی اور سنجیدہ روی کو بالالتزام برتا گیا ہے۔ دراصل خاکوں کے چہرے بے تکلف دوستوں کے اور احباب کے ہوسکتے ہیں۔ ایسی صورت میں بے تکلفی کی پوٹ سے مزاح پیدا ہوسکتی ہے لیکن یہ لازمی عنصر قطعی نہیں ہوسکتا۔ ان قلمی مرقعوں میں شخصیت کے خدوخال کی بہ نسبت اس کے اندرون میں جھانکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کی ظاہری وضعداری کے ساتھ اس کے اخلاق، مروت، غصہ، نیکوکاری، حرص و ہوس، دانشمندی، علمیت، قابلیت وغیرہ اوصافِ باطنہ کو بھی بے لاگ لپیٹ انداز میں بیان کیا جاتا ہے مگر اس میں نہ چوٹ ہوتی ہے نہ طنز اور نہ ہی مخاصمانہ جذبہ، نہ معاندانہ انداز کارفرما ہوتا ہے۔ یہ تضحیک و تمسخر سے بھی بالاتر ہوتا ہے۔ اس میں اگر مزاح ہوتا بھی ہے تو وہ صرف بے تکلفی کی نمائندگی کرتا ہے۔ بغض وعناد اور مذاق و مسخرہ پن کے ساتھ کسی شخص کی قلمی تصویر کشی کرنا خاکہ نگاری نہیں خاکہ اڑانے کے مصداق ہوتا ہے۔ معاندین اس موقعے کا خوب فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن ایسے خاکے ادب میں کوئی مقام نہیں بناتے۔ خاکہ نگاری کے لیے خاکہ نگار اور خاکہ کھینچے جانے والی شخصیت کا باہم شناسا ہونا لازمی امر ہے۔ اس کی طبیعت سے واقفیت ضروری ہے، وگرنہ یہ ''ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ'' والا معاملہ درپیش آجائے تو محنت سے لکھا ہوا خاکہ ملیامیٹ ہوجاتا ہے۔ اچھا خاکہ وہ ہوتا ہے جس میں شخصیت کے بیرون کی بجائے اندرون عکس ریز ہو اور اوصاف وعوارض باطنہ بھی منعکس ہوں۔

خاکے میں مبالغہ آرائی یا دروغ گوئی اصل چہرے کو بگاڑنے کا سبب بن جاتے ہیں۔ خاکہ نگار کے لیے لازمی ہے کہ وہ مدحت و منقصت سے اجتناب برتے اور خامیوں اور خوبیوں کو اس نوع سے منکشف کرے کہ دونوں میں توازن قائم رہے۔ خاکے میں شخصیت کا پرتو ہو بہو دکھائی دینا خاکہ نگار کے ماہر فنکار ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

اردو میں خاکہ نگاری کی روایت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ اس کے ابتدائی نقوش تذکروں میں دکھائی دتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب ''آبِ حیات'' میں بھی خاکہ نگاری کے بعض عمدہ نمونے مل جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے معاصر ادیبوں اور شاعروں کے فنی کارناموں کی وضاحت اور ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو بڑے لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ ہمارے تذکرہ نویسوں نے طرز نگارش میں تذکروں کو سوانحی خاکوں میں پھر شخصی مرقعوں میں ڈھالنے کی دانستہ کوششیں کی ہیں اور تاریخ نویسی کے اکتا دینے والے انداز بیان سے ہٹ کر ان میں لفظی رنگ و روغن بھرا۔ تذکروں میں خاکہ نگاری کا یہ اسلوب،، حیاتِ جاوید'' سے ہوتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد کے ''تذکرہ'' تک پہنچتا ہے، لیکن یاد رہے یہ تذکرے ''خاکے'' نہیں، خاکوں کے انداز میں لکھی گئی سوانح ہیں۔

اردو کا اولین خاکہ جو فنی اصولوں پر پورا پورا اترتا ہے، وہ ''نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے لکھے ہوئے اس خاکے میں نذیر احمد کے ظاہر و باطن دونوں عیاں ہو جاتے ہیں اور ان کی چلتی پھرتی شخصیت کے تمام خد و خال نمایاں ہو جاتے ہیں۔ دراصل کسی شخصیت کے متعلق خاکہ نگار کے ذاتی تاثر اور شخصی مطالعے کی بنیاد پر جو سیرت گری کی جاتی ہے وہ خاکہ بن کر صفحۂ قرطاس پر ابھرتی ہے گویا خاکہ نگاری کے لیے انسانی سرور کار کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر سیدھا، سپاٹ اور غیر مصنوعانہ خاکہ بنایا ہی نہیں جا سکتا۔

خاکہ نگاری کے فنکاروں کی فہرست کافی طویل ہے۔ اس میں خواجہ حسن نظامی، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، بیگم انیس قدوائی، مالک رام، صباح الدین عبدالرحمٰن، ڈاکٹر اسلم فرخی، سعادت حسن منٹو، کشمیری لال ذاکر، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، شاہد احمد دہلوی، رام لعل نابھوی، وجاہت علی سندیلوی اور شمیم حنفی قد آور خاکہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ صوبائی اور شہری سطح کے احباب اور ادباء و شعراء کی شخصیتوں کے خاکے لکھ کر خاکہ نگاری کو ریاستی سطح پر فروغ دینے والے خاکہ نگار بھی اردو میں موجود ہیں۔ اس ضمن میں گلبرگہ کے امجد علی فیضؔ، ولیؔ و سراجؔ کے وطن اورنگ آباد کے احمد اقبال، عارف خورشید

اور نورالحسنین کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

عارف خورشید نے محتاط اندازے کے مطابق تیس، پینتیس خاکے ضرور لکھے ہوں گے۔ ان کے خاکوں کا پہلا ہی مجموعہ ''تنظیم کثیر رنگی'' کے نام سے شائع ہوا تھا اس کے بعد ''رنگِ امتزاج'' میں ان کے سات خاکے اور ''وقت کے چاک پر'' نامی اس کتاب میں چار خاکے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں چار افسانے، باون افسانچے اور ایک تبصرہ شامل ہے جبکہ رنگ امتزاج میں خاکوں کے علاوہ گیارہ تبصرے اور ایک مضمون ہے۔ کتابوں کی اس فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ عارف خورشید افسانہ اور افسانچہ نگاری میں بھی درک رکھتے ہیں اور ان کا تنقیدی ذہن بھی پختہ ہے۔ ادبی اصناف کے ان ہمہ رنگوں کا امتزاج وہ اپنی تخلیقات میں نہایت فنکارانہ انداز میں کرتے ہیں۔ بالخصوص خاکوں میں ان کے یہاں تنقید کا رنگ بھی ابھرتا ہے تو افسانوی رنگ بھی جھلکتا ہے۔ ان کے بعض خاکوں کی نثر میں شعری حسن بھی در آیا ہے جو ان کے شاعر ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ ویسے خاکوں سے زیادہ ان کے شعری مجامع منظر عام پر آچکے ہیں۔ حقائق کا اخفا کرنا ان کی عادت نہیں۔ ''سچ'' اور سچائی ان کے افسانوں کی پہچان ہے۔ یادوں کے سائباں میں، آتشیں لمحے، سنہری رت کا فریب دیتے ہیں تو وہ لہولہو آرزوؤں کے ٹوٹے ہوئے آئینے سے احساس کا زخمی مجسمہ تراش کر سوچ کے جزیرے میں لمحوں کی صلیب پر چڑھا دیتے ہیں۔ اس عمل سے ان کی کہانی وجود میں آتی ہے۔ ان کی کہانیاں اور کچھ بھی نہیں صرف آنکھوں کی زبان ہوتی ہیں اور آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ سچ ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی حقیقت پسندی بعض کو گراں گزرتی ہے۔ جہاں تک ان کے خاکوں کا سوال ہے تو اس میں بھی ان کی قلندرانہ سرمستی نظر آتی ہے۔ انھوں نے شائستہ مذاق اور طنز ومزاح کی محسوس نہ ہونے والی کاٹ سے مملو خاکوں میں اپنے احباب اور دوستوں کی قلمی تصویریں پیش کی ہیں، جنھیں پڑھ کر لبوں پر تبسم کھل جاتا ہے۔ عارف خورشید کے خاکوں میں حلیے بگاڑے نہیں جاتے نہ ان پر مدحت وتوصیف کا غازہ چڑھایا جاتا ہے بلکہ چہرے کو اصل حال ہی پر رکھا جاتا ہے۔ اس صداقت کی آنچ سے خاکہ کی اصلیت میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ ان کی خاکہ نگاری میں شخصیت کی طبعی تصویر کے ساتھ اس کے افکار و اطوار اور جذبات واحساسات کا مجموعی مگر مجملاً تعارف ہوجاتا ہے۔

عارف خورشید کی خاکہ نگاری کا یہ وصف ہے کہ وہ اختصار سے کام لیتے ہیں اور جزئیات سے گریز کرتے ہیں۔ وہ مصوری کی مانند پس منظر کی بہ نسبت اصل تصویر کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ خاکوں میں

شخصیت کے انہی پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں جو تصویر کو نکھارنے میں معاون بن سکتے ہیں۔ کمزوریوں کی تفصیل سے گریز کرتے ہیں اور اوصاف حمیدہ پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کے خاکے احباب کی تکریم یا بے تکلفی کے مطابق ہوتے ہیں۔ جہاں بے تکلفی ہوتی ہے تو تعظیم و تکریم کا لحاظ قدرے کم ہو جاتا ہے لیکن کسی مکرم و معزز شخصیت کا خاکہ لکھتے ہیں تو عملاً جس وضعداری کو نباہتے ہیں اسی کا اظہار تحریر میں بھی روا رکھتے ہیں۔ ان کے خاکوں کا نمایاں وصف یہ ہے کہ ان میں قلمی تصویریں پردۂ سیمیں کی طرح متحرک نظر آتی ہیں۔

خاکہ نگاری میں عارف خورشید کے فکر و خیال اور سوچ کے دھارے جب دور پردیس کے معتبر فنکاروں کے خیالات کے جھرنوں سے ملتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو فرخندہ بنیاد شہر اورنگ آباد کے اس ادیب کی وقعت ہمارے دل میں اور بڑھ جاتی ہے۔ شاہ حسین نہری کے خاکے میں عارف خورشید نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> ”میں پہلی ہی ملاقات میں سمجھ گیا تھا کہ آدمی مذہبی دکھائی دینے کے باوجود نیک ہیں۔“

طنز کی نہایت تیز دھار سے اچانک لگنے والے زخم کا احساس نہ ہو تو یہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ جو مذہبی ہوتا ہے وہ نیک نہیں ہوتا۔ ہمارے ادباء و شعراء کو سفید پوش دینداروں سے تلخ تجربات حاصل ہوئے ہوں گے اس لیے ان کا اطلاق مخلصین پر بھی کر لیا ہوگا۔ دیگر مذاہب میں بھی ڈھونگی دینداروں (پنڈتوں) کی کمی نہیں۔ ان سے چوٹ کھائے ہوئے شریف النفس بھی اس طرح کی فقرہ بازی کر سکتے ہیں۔ بہرحال! عارف خورشید کے اس گہرے طنزیہ اسلوب کی مماثلت ہم لاہور کے کالم نویس مشہور مزاح نگار عطاالله حق قاسمی کے درج ذیل جملے سے کر سکتے ہیں۔ انھوں نے روزنامہ جنگ جمعہ ۱۷ دسمبر ۲۰۱۰ء کے کالم ”روزنِ دیوار سے“ میں راقم الحروف کے متعلق لکھا تھا:

> ”ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط با قاعدہ شرعی وضع قطع کے حامل تھے۔...... مجھے ڈاکٹر صاحب کی اس خوبی نے بہت متاثر کیا کہ پابند شریعت ہونے کے باوجود ان میں تنگ نظری نام کو بھی نہیں تھی۔“

عارف خورشید کے مندرجۂ بالا جملے اور عطاالله حق قاسمی صاحب کے اس خط کشیدہ جملے میں قارئین بآسانی معنوی ربط محسوس کریں گے۔ دونوں کے درمیان فکر و خیال میں مطابقت ان کے فکری و ذہنی

انسلاک کی گواہ ہیں۔ ایسے معاملات میں دونوں کے یہاں فکر کی رو ایک سمت میں بہتی نظر آتی ہے۔

خاکہ نگاری میں بذلہ سنجی، لطیف مزاح اور طنز و ظرافت کو روا رکھا گیا ہے۔ یہ ایسے عناصر ہیں جن کے سبب خاکے پُر نشاط اور طرب انگیز بن جاتے ہیں لیکن عارف خورشید کے بعض خاکے ایسے بھی ہیں جن کی تہہ میں حزن و ملال کی نو یریں لہریں متحرک دکھائی دیتی ہیں۔ اس ضمن میں ان کے خاکے ''وقت کے چاک پر''، ''پرانا غم کہانی بن گیا'' اور ''آواز تم نے جب دی'' کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ بالترتیب قاضی سلیم، جاوید ناصر اور اختر الزماں ناصر کے خاکے ہیں۔ ان میں حزنیہ عنصر غالب نظر آتا ہے۔ ''وقت کے چاک پر'' قاضی سلیم کی سریع الحسی کی غمازی کرتا ہے۔ اس خاکے کے آخری جملے میں جذباتی شاعر کا یہ وصف یوں عیاں ہوتا ہے۔ ''عارف! میری زندگی Event full نہیں رہی ہے۔'' اسی طرح جاوید ناصر کے خاکہ ''پرانا غم کہانی بن گیا'' میں المناک فضا چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جاوید ناصر نہایت خاموش طبیعت تھے۔ عارف خورشید نے ان کے اس وصف کو بڑے حزنیہ انداز میں بیان کیا ہے:

> ''جب میں نے تمہارا دیدار کیا تو دعا کر رہا تھا کہ خدا تمھیں دس منٹ کی زندگی اور دے دے تاکہ میں واقعے کی حقیقت جان سکوں مگر وہ دس منٹ بھی تم خاموش رہ کر ضائع کر دیتے، غالباً اسی لیے دعا قبول نہیں ہوئی۔''

مذکورۂ بالا تینوں خاکوں میں ایک خاص بات جو میں نے محسوس کی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں ام الخبائث شراب کا ذکر کثرت سے ہوا ہے، لیکن اس کی تلخی اور خباثت کو عارف خورشید نے ایسے اسلوب میں بیان کیا ہے کہ اس کی حرمت بہ ہزار شوقیہ پیے جانے پر بھی ''پامال'' نہیں ہوتی اور شوقِ مئے نوشی پر بھی حرف نہیں آتا۔

عارف خورشید کے خاکوں میں زبان کا استعمال نہایت محتاط انداز میں ہوا ہے۔ پیچیدہ لفظیات اور ادق معنی سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔ سہل و سادہ زبان میں وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ خاکے میں مذکور دوسری شخصیتوں کے ادق جملے ان کی عبارت میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ طویل اور پیچیدہ جملے ان کے یہاں کبھی کبھار دکھائی دیتے ہیں۔ زبان کے چٹخاروں کی بجائے زبان کی سہل انگاری کو وہ اپنے خاکوں میں ترجیح دیتے ہیں۔ بات میں بات بیان کر کے اسے مضحک نہیں بناتے، مگر محاورات اور ضرب الامثال کی قلت ان کے یہاں شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ وہ زبان کے استعمال

میں قواعد کی باریکیوں پر نظر رکھتے ہیں۔ مثلاً حرف ربط اضافی (کا) اور حرف ربط ظرفی (کو) کے درمیان پائے جانے والے فرق کی تمیز انھیں ہے اور اس کی باریکی کو وہ بخوبی سمجھتے ہیں۔ عربی، فارسی لفظیات کا استعمال کر کے وہ علمیت کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے اور نہ عالمانہ رعب کا اظہار کرتے ہیں۔

عارف خورشید کی خاکہ نگاری کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ خاکوں میں ان کی تنقیدی بصیرت نمایاں ہوتی ہے۔ باتوں باتوں میں وہ اپنی تنقیدی رائے خاکے کے درمیان میں اس سرعت و اعتماد کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ قاری اس جلد بازی میں گڑ بڑا جاتا ہے اور اس رائے کو بلا ردوقدح کے تسلیم کر لیتا ہے لیکن جو رائے وہ دیتے ہیں وہ تنقید کی اعلیٰ کسوٹی پر صحیح ثابت ہوتی ہے، چند نمونے ملاحظہ ہوں:

''اپنے زمانے کی صداقتیں جس کے قابو میں آجاتی ہیں اور پھر وہ انھیں بہترین الفاظ اور اسلوب میں کاغذ پر اتار بھی سکے وہی بڑا افسانہ نگار ہوتا ہے۔''

(''جب بھی دیکھا ہے تجھے''، رنگ امتزاج)

''ان کی نظموں کا لہجہ رومانی اور غزلوں کا لہجہ بظاہر راست لیکن اکثر تہہ دار ہوتا ہے۔ بظاہر مطمئن اور آسودہ حال ہونے کے باوجود ان کی غزلوں میں رات کی اذیت کا ذکر زیادہ ہے۔ رات کے ذکر کی بہتات کے باوجود ان کی غزلوں میں بصری پیکروں کی کثرت ہے۔''

(آدمی ہو کے بھی......رنگ امتزاج)

''افسانہ نگار کی ایک ذہنی رو ہوتی ہے، اس کا ساتھ دینا ضروری ہو جاتا ہے ورنہ افسانہ ہاتھ نہیں آتا۔ آپ کا اپنا خیال کہیں اور جاتا ہے اور افسانہ نگار کہیں اور لے جاتا ہے۔ اس تصادم میں قاری کا الجھ جانا فطری ہے۔ میں سمجھتا ہوں ذاتی نوعیت کی علامت قاری کو شرکت سے محروم کر دیتی ہے۔''

(وہ ایک افسانہ طراز۔ وقت کے چاک پر)

یہ چند مثالیں عارف خورشید کے تنقیدی شعور کا پتہ دیتی ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ عارف خورشید افسانہ نگار بھی ہیں اور اس کے ناقد بھی۔ وہ شاعر بھی ہیں اور شاعری کے نقاد بھی۔ وہ خاکہ نگار بھی ہیں اور خاکہ کے تنقید نگار بھی۔ ان کا کوئی فن ادھورا نہیں۔ شاید وہ اپنی ذات کو بھی محاسبہ کی منزل سے گزارتے ہوں گے اس لیے وہ آدمی بھی پورے ہیں ادھورے نہیں۔ ☆☆☆

آزمائش کی گھڑی

(کتابوں پر تبصرے اور افسانوں کے تجزیے)

تبصرہ ''سوچ کے جزیرے''

اشرف عادلؔ

دکن کی سرزمین مدتوں سے شعروادب تہذیب وتمدن، ثقافت اور تاریخ کے حوالے سے اہمیت کی حامل رہی ہے۔ تاریخ کے اوراق میں درج ہے محمد تغلق نے اورنگ آباد سے ایک نزدیکی علاقے دیوگڑھ کو دولت آباد کے نام سے منسوب کردیا اور اسی شہر میں اپنا ڈیرا ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ہی دولت آباد ایک بہت بڑے گروہ کا مسکن بن گیا۔ یہ فاتح گروہ ایک خوبصورت زبان اپنے ساتھ لے آیا تھا اور یہاں کے آزادانہ ماحول میں اس زبان کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور یہاں کے لوگوں نے اس جدید زبان کو اپنا لیا۔ شاید اس لیے کہ یہاں کے لوگ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ جمالیاتی شعور بھی رکھتے تھے۔ یہی وجہ کہ دکن کی سرزمین نے اردو ادب کو مالا مال کردیا یہی وہ زمین ہے جہاں سے اردو کے قادرالکلام اور مایہ ناز شعرا نے جنم لیا جن میں ولیؔ اور سراجؔ کے علاوہ میر غلام علی آزادؔ بلگرامی، عارف الدین خاں، سید اشرف، لالہ لچھی نارائین شفیقؔ اور صفیؔ اورنگ آبادی قابل ذکر ہیں۔

آج بھی گلشن اورنگ آباد میں شعروادب کے پھول کھل رہے ہیں۔ شعر ادب کے اس کے گلستان کو جو شعرا اپنے خوبصورت خیالات اور فکر آب حیات سے سیراب کررہے ہیں، ان میں عارف خورشید کا نام بھی شامل ہے۔ عارف خورشد ایک درجن سے زیادہ کتابیں تحریر کرچکے ہیں، جن میں افسانویں اور شعری مجموعے کے علاوہ سوچ کے جزیرے کے عنوان سے ان کا ایک اور شعری مجموعہ حال ہی میں منظر عام پر آچکا ہے۔ عارف نے ثلاثی اور غزل کو خاص طور پر اپنا ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ مینا وساغر شیشے کے ہوں یا مٹی کے، نشہ شراب میں ہے یعنی اصل چیز شراب ہے۔ اسی طرح صنف سخن کوئی بھی ہوں اصل چیز تو شاعری ہی ہے۔ عارف کی شاعری نہ صرف جاندار ہے، بلکہ زبان، موضوع اور خیال کے حوالے سے بھی خوبصورت ہے۔ چوں کہ ابھی اردو میں ثلاثی کہنے کا رواج نہیں ہے لیکن عارف کی کوشش نے اس ہنر میں بھی قلم کے ہنر دکھائے ہیں۔ اردو میں چار مصرعی صنف سخن رباعی مروج ہے۔ شعرا نے اس ہنر میں خوب نام کمایا ہے اور اردو کو مالا مال کیا ہے لیکن ثلاثی تین مصرعی صنف سخن ہے اور

اس میں ایک مخصوص بحر کا بھی استعمال ہو رہا ہے زیر تبصرہ کتاب کے آغاز میں شاعر یوں رقمطراز ہے:

''اے صنف سخن میں ایجاد کے متوالو، اے تجربوں کو حوصلے بخشنے والے اعتدال پسند شاعرو! ذرا سوچو! تین مصرعی نظمیں تو لکھی جا سکتی ہیں بلکہ لوگوں نے یک مصرعی نظمیں لکھی ہیں۔ بعض تو یک لفظی کا بھی دعویٰ کرتے ہیں لیکن اگر ثلاثی ایک علیحدہ صنف سخن ہے تو اس کے لیے رباعی کی طرح مخصوص بحر ہونی ہی چاہیے۔ ورنہ سہ مصرعی نظم کو ثلاثی کیوں کہا جائے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ثلاثی کو تثلیث کے نام سے مکمل شکل قمر اقبالؔ نے دی ہے۔''

یہاں پر عارف نے جس بحث کا آغاز کیا ہے اس میں مزید سوچنے سمجھنے اور لکھنے کی گنجائش ہے۔ ان کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ ثلاثی کے لیے مخصوص بحر کا استعمال ہونا ہی چاہیے۔ فی الحال بحر خفیف مسدس کا استعمال کیا جا رہا ہے آگے رباعی کی طرح ہر مصرعے میں مختلف بحر استعمال ہو سکتی ہے۔ امکانات کے دروازے کھلے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ثلاثی پر سنجیدگی کے ساتھ کام کیا جائے۔

'سوچ کے جزیرے' میں ایک سو سے زیادہ ثلاثیاں موجود ہیں، حالانکہ ابھی اس صنف سخن کو بہت سی منزلیں طے کرنی ہونگی۔ ثلاثی کا سفینہ ابھی حال ہی میں اردو شعر و ادب کے سمندر میں اترا ہے، اس لیے اسے بہت سارے طوفانوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ جہاں تک عارف کی ثلاثیوں کا تعلق ہے، ان میں شاعر نے لفظوں کا استعمال چابک دستی کے ساتھ کیا ہے اور عام بول چال کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ ثلاثیاں قاری کو ایک نئی دنیا کی سیر کراتی ہیں۔ یہ دنیا عالم غیب نہیں بلکہ یہ دنیا ہماری دنیا ہے جس میں رشتوں کا احساس ہے، قدروں کی پامالی کا ذکر ہے اور فکر کا بدلتا ہوا منظر ہے۔ اگر اس صنف سخن میں لفظوں کا استعمال ڈھنگ سے نہ کیا گیا تو ثلاثی کا حسن اثر انداز ہو سکتا ہے لیکن عارف نے اس چیز کا خاص خیال رکھا ہے جس کی وجہ سے ان کی ثلاثیوں میں جان پیدا ہو گئی ہے۔ آپ کے مطالعے کے لیے پیش ہیں نمونے کے طور پر کچھ ثلاثیاں۔

فکر کو اپنی فاش کرتا ہوں
مل رہے ہیں جہاں زمین و فلک
میں کسی کو تلاش کرتا ہوں

☆

لفظ کو وار سے نہ کم سمجھو
میرے ہاتھوں میں ہے قلم دیکھو
اس کو تلوار سے نہ کم سمجھو

☆

ساتھ لہروں کے گھر بھی بہتے ہیں
جب گھروندے ہوں ریت کے پھر بھی
ساحلوں کے قریب رہتے ہیں

☆

اور کچھ بھی نہیں کہانی میں
میں ہوں ساحل پہ ہاتھ میں پتھر
دائرے بن رہے ہیں پانی میں

☆

وہ شرافت کی بات کرتا ہے
اس میں شاید غرض ہے پوشیدہ
کیوں محبت کی بات کرتا ہے

آیئے اب عارف کی غزلوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ''غزل کی قدیم تعریف عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کے متعلق باتیں کرنا۔'' لیکن اب غزل کی دنیا بہت وسیع ہو رہی ہے غزل میں ہر طرح کے مضامین باندھے جا رہے ہیں آج بھی غزل میں گل و بلبل، صیاد، نشیمن، برق، آشیاں، چمن، خرمن جیسے الفاظ استعمال کیے جا رہے ہیں، لیکن آج کی غزلیہ شاعری میں یہ الفاظ علامت کے طور پر استعمال کیے جا رہے ہیں اور علامتیں نئے نئے مطالب اور اشاریات کے ساتھ پوری دنیا کی زبان بن گئی ہے۔

جہاں تک ''سوچ کے جزیرے'' میں شامل غزلوں کا تعلق ہے۔ ان میں بھی روایتی الفاظ

استعمال ہوئے ہیں لیکن نئے مطالب کے ساتھ۔اس کے ساتھ ساتھ عارف کی غزلوں کے پیمانے سے افسردگی، مایوسی اور بیقراری کی شراب بھی جھلکتی ہے۔جس کا نشہ قاری محسوس کر سکتا ہے۔

وہ شب و روز کا ملنا بچھڑنا عارفؔ
مدتیں گزریں کہاں تجھ سے ملاقات ہوئی

صدائیں دے کے میں مایوس لوٹ جاؤں گا
وہ اپنے بند دریچوں کو پھر سے کھولے گا

حالانکہ عارف کی غزلوں میں اداسی اور ناامیدی تو ہے لیکن ان کا لہجہ تازہ بھی ہے اور منفرد بھی۔روایتی الفاظ اور نئی جہتوں کا ملاجلا سنگم ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔

کیا روایت ہم نے گھر میں ڈال دی
کہتے کہتے بات اکثر ہم نے ٹال دی

آپ کے ہر خواب کو نیندیں ملیں
آپ کی شانوں کو ہم نے شال دی

میں ارادہ ہوں مجھے توڑ کبھی
اور دشمن سے ہرا دے یارب

پھر تصور اِدھر گیا ہوں گا
تجھ میں کوئی سنور گیا ہوگا

مجھے امید ہے کہ عارف کا یہ شعری مجموعہ قاری کو دیر تک اور دور تک اپنے ساتھ فکر اور سوچ کے سمندر میں بہا کر لے جائے گا۔میں عارف کو اس خوبصورت کتاب کو تخلیق کرنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆

سوچ کے جزیرے

آفاق عالم صدیقی

''سوچ کے جزیرے'' عارف خورشید کی غزلوں اور ثلاثیوں کا مجموعہ ہے۔ اردو زبان و ادب میں اصناف کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اصناف سخن میں جو مقبولیت غزل کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ غزل کا اعزاز غالباً اس کا ایجاز و اختصار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے اور ہر کوئی غزل میں ہی طبع آزمائی کرتا ہے۔ اختر الایمان نے جب یہ کہا کہ غزل کو جس مقام تک پہنچنا تھا وہ میرؔ و غالبؔ کے ہاتھوں پہنچ گئی تو بہت سے لوگوں نے اس بات کا برا منایا، مگر سمجھ دار لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ بات گرچہ تلخ ہے مگر سچ ہے۔ سو ان میں سے کئی ایک نے غزل کی بجائے دوسری اصناف سخن پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ جمیل الدین عالی نے دوہے کو اپنایا اور نئی شناخت بنائی۔ یوں بھی دوہا غزل سے بہت حد تک مماثلت رکھتا ہے۔ سو دوہا کہنے کی روایت چل نکلی۔ بعد میں آنے والے شاعروں نے سوچا کہ غزل کا بدل دوہا ہی تھا مگر وہ عالی جی لے اڑے۔ اب کیا کیا جائے۔ ایسی صورت میں غزل کی طرح مختصر اور جامع صنف ثلاثی کی طرف نظر اٹھی اور لوگوں نے اس پر بھی جی کھول کر طبع آزمائی کی۔ مگر بات زیادہ نہیں بنی اور اس صنف شاعری کو دوہے جیسی مقبولیت بھی حاصل نہیں ہو سکی۔ اس کے باوجود چند شاعروں نے اس پایہ کی ثلاثیاں کہیں کہ ان پر نظر ٹھہرنے لگی۔ انھیں شعرا میں ایک نام عارف خورشید ہے۔ ان کی ثلاثیوں کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے محض ذائقہ بدلنے کے لیے ثلاثیاں نہیں کہی ہیں بلکہ اپنے اظہار کے وسیلے کے طور پر اسے اپنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ثلاثی کہنے میں کامیاب نظر آتے ہیں اور تین مصرعوں میں اپنی بات اتنی خوبصورتی سے کہہ جاتے ہیں کہ مسرت انگیز حیرت ہوتی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جو لوگ تخلیقی کرب سے آشنا ہوتے ہیں اور جو اپنی ذات کے دائرے میں قید نہیں ہوتے ہیں۔ وہ بہر حال فن کا ارتقا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں چند ثلاثیاں دیکھیے۔

اور کچھ بھی نہیں کہانی میں
میں ہوں ساحل پہ ہاتھ میں پتھر
دائرے بن رہے ہیں پانی میں

جانے کیا کیا نصیب دکھلائے
آدمی تو گلاب قسمت ہے
صبح کھل جائے شام مرجھائے

مات دی موت کو ہزاروں بار
ہم نے پھیرا ہوا کا رُخ لیکن
زندگی تجھ سے ہوگئے بیزار

ظاہر ہے کہ ان ثلاثیوں میں زندگی کی بے معنویت کو جس خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے وہ ثلاثی کے فن پر قدرت کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ جب کہ شاعر کا ایمائیت سے بھرپور انداز بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ ویسے عارف خورشید کی غزلیں بھی دامن دل کھینچنے کی صفت سے متصف ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انھوں نے غزل پر ثلاثی کو اولیت دی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی غزلیں ان کی ثلاثی سے زیادہ شاداب معلوم ہوتی ہیں۔ چند اشعار دیکھیے ؎

رات بھی اور گھپ اندھیرا بھی
راستہ کیوں سجھائی دیتا ہے

نہ جانے کتنے یگ بیتے ، ہماری پیاس باقی ہے
عجب سودا ہے ، ملنے کی ابھی تک آس باقی ہے
ملے تھے کب کہاں بچھڑے تھے یاد آتا نہیں کچھ بھی
کہیں تو کچھ نہ کچھ کھویا ہے یہ احساس باقی ہے

سوئے ہیں گنہگار سبھی دھوم مچا کر
اللہ کا بندہ ہے کہ سونے نہیں دیتا
اک یاد ہے تیزاب صفت پھول پہ دل کے
رشتہ یہ کبھی ختم وہ ہونے نہیں دیتا

میرا احساس ہے کہ عارف خورشید اگر غزل پر ہی پوری توجہ دیتے تو وہ زیادہ کامیاب شاعر بن کر ابھرتے اور تازہ منظر نامے پر اپنا رنگ دکھانے میں زیادہ کامیاب ہوتے۔ایسا نہیں ہے کہ ان کی غزلوں میں ادھر ادھر دو چار اچھے اشعار بکھرے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ ان کی کئی غزلیں ایسی ہیں جو پوری نقل کیے جانے کا استحقاق رکھتی ہیں۔مثال کے طور پر ایک غزل دیکھنے میں مضائقہ نہیں ہے ۔

کیا روایت ہم نے گھر میں ڈال دی
کہتے کہتے بات اکثر ٹال دی
آپ کی محفل میں ہم رسوا ہوئے
آپ کی ہر لے پہ ہم نے تال دی
ورنہ کب کے مر چکے تھے خوف سے
میرے جذبے نے ہمیشہ ڈھال دی

آپ کے ہر خواب کو نیندیں ملیں
آپ کے شانوں کو ہم نے شال دی
اک بشر کو سن رہے تھے غور سے
اک بشر کی بات عارفؔ ٹال دی

معلوم یہ ہوا کہ عارف خورشید میں غزلیں کہنے کی بڑی صلاحیتیں ہیں اور وہ غزل مزاج اور غزل زبان سے بھی خوب واقف ہیں۔ان کا مجموعۂ کلام گرچہ مختصر ہے مگر پر تاثیر ہے اور تخلیقی قوت سے مالا مال بھی۔ عارف خورشید کی اب تک چودہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں شاعری، افسانے اور خاکوں کے مجموعوں کے علاوہ تبصروں کا مجموعہ بھی شامل ہے۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ساری توانائی

کسی ایک صنف پر صرف کی جاتی تو وہ آج اردو کے قابل فخر فنکاروں میں سے ایک ہوتے۔اس کے باوجود کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری میں اتنی تب وتاب تو بہرحال ہے ہی کہ وہ انھیں فنکاروں کی بھیڑ میں کبھی گم نہیں ہونے دے گی۔پچانوے صفحے کی یہ کتاب نوائے دکن پبلیکیشنز سے نہایت خوبصورت چھپی ہے۔البتہ اس کی قیمت ڈھائی سو روپے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

☆☆☆

سوچ کے جزیرے

رفیق جعفر

عارف خورشید اورنگ آباد (مہاراشٹر) کے فعال اور جانے مانے فکشن نگار اور شاعر ہے ان کی سوچ مثبت اور تخلیق صالح ہوتی ہے۔ سینیر قلمکاروں اور نقادوں کی بے رخی اور کم توجہی کے باوجود لکھتے رہے۔ ادبی رسائل میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہیں۔ ان کی کتابیں بھی چھپیں، اصل میں ادب کے قارئین کا بہتر ردِ عمل سند کا درجہ رکھتا ہے۔ جو انھیں حاصل ہے۔ یہی سند محرک بنی اور وہ میدانِ ادب میں ڈٹے رہے۔

''سوچ کے جزیرے'' عارف خورشید کی برس ہا برس کی شعری کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس میں ثلاثیاں اور غزلیں ہیں۔ اس مجموعے کو ڈاکٹر سحر سعیدی جیسے سینیر شاعر و قلمکار نے مرتب کیا ہے۔ اور شاہ حسین نہری جیسے استادِ سخن نے قطعۂ تاریخ (بہ مناسبت اشاعتِ کتاب) لکھا ہے۔ ان دونوں حضرات کی عارف خورشید کے کلام سے دلچسپی اہمیت رکھتی ہے۔ بغیر دیباچہ ، پیش لفظ اور بغیر شاعر کی اپنی بات کے شائع شدہ اس کتاب سے شاعر کی خود اعتمادی ظاہر ہوتی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں ثلاثیاں زیادہ اور غزلیں کم ہیں۔ ثلاثی کے موجد اورنگ آباد کے حمایت علی شاعؔر مانے جاتے ہیں جو اِن دِنوں پاکستان میں مقیم ہیں۔ برسوں پہلے اس صنفِ سخن پر ادبی رسائل میں گفتگو ہو چکی ہے۔ ثلاثی حمایت علی شاعؔر کی پہچان بھی بنی اور اس وقت ہند و پاک کے کئی شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی بھی کی لیکن اس صنف کی زیادہ پذیرائی نہ ہو سکی چنانچہ یہ صنف سمٹ کر رہ گئی۔ اورنگ آباد کے ایک اور معتبر شاعر قمؔر اقبال مرحوم نے ثلاثی کو تثلیث کا نام دے کر ایک ہی بحر کے تین مصرعوں میں بات مکمل کرنے کا تجربہ کیا جو کہ بہت پسند کیا گیا۔ اس سلسلے میں عارف خورشید کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

''اگر ثلاثی ایک علیحدہ صنفِ سخن ہے۔ تو اس کے لیے رباعی کی طرح مخصوص

بحر ہونی ہی چاہیے ورنہ ہر سہ مصرعی نظم کو ثلاثی بھلا کیوں کہا جائے؟ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ثلاثی کو تثلیت کے نام سے مکمل شکل قمر اقبال نے دی ہے۔"

(سوچ کے جزیرے۔ ص۴)

اس اقتباس سے ظاہر ہوا کہ عارف خورشید ایک ہی بحر میں تین مصرعوں کے قائل ہیں اور اسی فارم کو ثلاثی مانتے ہیں اور انھوں نے اس صنفِ سخن پر خوب طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی کہی ثلاثیاں قابل مطالعہ ہیں کیونکہ انھوں نے اس صنف میں شعریت اور معنویت کا خاص خیال رکھا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ عارف خورشید کی کوششوں نے ثلاثی کو نئی زندگی دی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ اس معیار کی اتنی مقدار میں سہل زبان میں بھرپور معنویت کے ساتھ ثلاثیاں آج کے کسی شاعر کے پاس نہیں ملتیں۔ ہم نے بغور مطالعہ کیا، لطف آیا۔ ملاحظہ فرمائیں تین ثلاثیاں۔

سب سے پیارے ہو اتنا کافی ہے
تاج کی تخت کی ضرورت کیا
تم ہمارے ہو اتنا کافی ہے

یاد کب اس کا ساتھ چھوڑے گی
سوچتا ہوں کہ شاعری اپنی
اور کب تک لہو نچوڑے گی

شمع جل کے پگھل ہی جائے گی
جاوداں ہوگا وصل کا لمحہ
یہ جوانی بھی ڈھل ہی جائے گی

تین ہم وزن مصرعی نظم کے اس فارم میں پہلے اور آخری مصرعوں میں قافیہ اور ردیف کی پابندی شعریت عطا کرتی ہے۔ بظاہر تو یہ فارم آسان نظر آتا ہے لیکن اس کی مشکل سے وہی واقف ہوسکتا ہے جو اس صنف میں طبع آزمائی کرتا ہو۔ عارف خورشید کے کلام کے مطالعے سے اس صنف میں ان کی مشق کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کی مشاقی کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس صنفِ سخن میں عارف خورشید

کامیاب نظر آتے ہیں۔آسان زبان میں بھرپور معنویت اور تروتازہ مضامین کی یہ ثلاثیاں شاعری کے قارئین کو بھی پسند آئیں گی اور شعرا حضرات کو ثلاثی کہنے پر بھی اکسائیں گی۔

جہاں تک اس مجموعہ میں شامل غزلوں کی بات ہے اس سلسلے میں ہمارا خیال ہے کہ عارف خورشید غزل کی صنف میں اپنی ثلاثی والی صنف کے میعار و مرتبے سے بہت کچھ الگ نظر آتے ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احتیاط، رکھ رکھاؤ، زبان، شوکتِ لفظی، کلاسکیت اور غزل کے نئے رجحانات کے تقاضوں کے اہتمام نے انھیں غزل میں اپنی راہ متعین کرنے کے لیے کنفیوژن میں مبتلا کر دیا ہے اور وہ اپنے قاری کو کنفیوز کرنا نہیں چاہتے، یہ کشمکش ان کی غزل میں نظر آتی ہے۔اس کے باوجود غزل پسند قارئین کے لیے اس کتاب کے بہت سارے اشعار میں دلکشی موجود ہے۔بطور نمونہ صرف چار اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

گونجتی ہیں ہزار آوازیں
حافظہ بے صدا نہیں ہوتا

لکھا تھا جس ورق پہ میرا نام وہ کہیں نہیں
بچھڑ کے میرے ہاتھ میں وہ جو کتاب دے گیا

صدائیں دے کے میں مایوس لوٹ جاؤں گا
وہ اپنے بند دریچوں کو پھر سے کھولے گا

سنتے ہیں کل کے دور میں انسان تھے بہت
تاریخ ہے اداس کہ انسان اب کہاں

مندرجہ بالا اشعار کی طرح اور بھی بہت سارے اشعار ''سوچ کے جزیرے'' میں مل جائیں گے۔مجموعی طور پر یہ مجموعہ کلام آج کے شعری ماحول میں خوشبو کا جھونکا ہے جو دل کو منور اور دماغ کو معطر کرے گا۔

☆☆☆

سوچ کے جزیرے

میر ہاشم

ہوا کے مدِ مقابل چراغ جلانا حوصلہ مندی اور خود اعتمادی کا کام ہے اور یہ کام عارف خورشید نے شعوری طور پر کیا ہے۔ اپنی شاعری اور افسانوں کے مجموعوں کو 'یارانِ نکتہ داں' کی 'صلائے عام' کے لیے پیش کرتے چلے گئے۔ زیرِ نظر شعری انتخاب سے پہلے تین مجموعے شائع کر چکے ہیں۔ افسانوں اور افسانچوں کے چھ سات مجموعوں کے علاوہ ایک کتاب خاکوں پر مشتمل ہے اور ایک تبصروں پر۔ اس طرح مطبوعات کی تعداد بارہ چودہ تک پہنچ جاتی ہے۔ شاعری اور افسانوں کے ڈھیر لگا دینے سے کوئی فن کار بڑا نہیں ہو جاتا۔ عام طور پر زود نویسی نقصان پہنچاتی ہے لیکن عارف خورشید کی تخلیقات پر نظر ڈالنے سے لگتا ہے کہ ان کا فن مسلسل ترقی کی سمت گامزن ہے۔ ان کے افسانے ایک حد تک جدیدیت کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔ افسانوں میں شاعرانہ زبان ملتی ہے۔ خاکوں میں تحریر کی روانی، سلاست، بے باکی اور بے ساختگی نظر آتی ہے۔ تبصروں کے دیکھنے سے تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہر حقیقی فنکار کے اندر ایک تنقید نگار ضرور ہوتا ہے جو اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ عارف خورشید کے اندر مچلتا ہوا نقاد ہے۔ لکھنے پڑھنے کے لیے ان کے پاس ابھی کافی عمر پڑی ہے۔ ذرا تھم تھم کر قدم بڑھائیں تو ادب کے جریدے پر اپنا دوام ثبت کر سکتے ہیں۔ ''سوچ کے جزیرے'' اسی سال شائع ہونے والی کتاب ہے۔ یہ ثلاثی اور غزل پر مشتمل ہے۔ ثلاثی ایک نئی صنف ہے، غالباً پہلے پہل حمایت علی شاعر نے طبع آزمائی کی۔ قمر اقبال نے اسے 'تثلیث' کا نام دیا۔ عارف خورشید کا خیال ہے کہ اگر ثلاثی ایک علیٰحدہ صنف سخن ہے تو اس کے لیے رباعی کی طرح مخصوص بحر بھی ہونی چاہیے۔ انھوں نے ایک خاص بحر کی نشاندہی بھی کی ہے، جو لوگ اس صنف سخن پر طبع آزمائی کر رہے ہیں انھیں اس مشورے پر اظہار خیال کا حق حاصل ہے، البتہ میں ان کے اس خیال سے پوری طرح متفق ہوں کہ ثلاثی کے تینوں مصرعے ناگزیر ہونے چاہیں اور ایک مصرع کم کرنے پر عدم تکمیل کا احساس ہو۔ عارف خورشید نے

بڑی حد تک اس کی پابندی کی ہے۔غزل میں تو سارا مضمون دو مصرعوں میں سمٹ آتا ہے ایک مصرع اضافہ کر کے اسے ثلاثی کہنا کچھ مشکل نہیں۔مثال کے طور پر غالب کی غزل میں ایک ایک مصرع اضافہ کر کے دیکھتے ہیں:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
کیوں تڑپتا ہے اس طرح ہر پل
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اس تغافل کی انتہا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

ہر طرف اضطراب سا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

ظاہر ہے ایک ایک مصرعہ غیر ضروری ہے، عام طور پر جو ثلاثیاں لکھی گئی ہیں ان میں یہ نقص نظر آتا ہے۔

فیض احمد فیض نے کہا تھا:

بہت ملا نہ ملا زندگی سے ، غم کیا ہے
متاعِ درد بہم ہے تو بیش و کم کیا ہے

اور عارف خورشید کہتے ہیں:

کیا ہے ابہام کیا علامت ہے
ایسی باتوں سے مجھ کو کیا لینا
دل میں غم ہے تو فن سلامت ہے

یہ غم یا متاعِ درد یا سوز گداز عشق ہے جو فن کار کو بیدار رکھتا ہے اور اس کی فنکارانہ زندگی کا ضامن بھی ہے۔یہ غم دل اور بے قراری محبوب کے لیے بھی ہو سکتی ہے یا کسی اور مقصدِ حیات کے لیے

بھی۔تشبیہ، استعارہ، کنایہ، ایمائیت، ابہام، علامت نگاری، پیکرتراشی اور سہلِ ممتنع وغیرہ شاعری کا خارجی حسن ہے لیکن داخلی حسن تو شدت تاثر ہے جو غمِ دل یا غمِ عشق کی دین ہے اور کبھی یہ غم دل غم کائنات بھی بن جاتا ہے۔عارف خورشید کی ثلاثیوں میں زیادہ تر حدیثِ دل ہے مگر غم ذات بھی ہے اور غم دوراں بھی۔اس سلسلے کی چند ثلاثیاں درج ہیں۔

تیری خوشبو ہے میری سانسوں میں
پھر بھی یہ روح چاہتی کیا ہے
دل کے جیسی چبھن ہے آنکھوں میں

کیا بتائیں تمھیں کہ کیسے تھے
ریزہ ریزہ بکھر گئے ورنہ
ہم بھی اک دن چٹان جیسے تھے

اور کچھ بھی نہیں کہانی میں
میں ہوں ساحل پہ ہاتھ میں پتھر
دائرے بن رہے ہیں پانی میں

شام سے سو رہا ہے وہ ایسے
صبح سے بھی غرض نہیں کوئی
رات سے بھی خفا ہو وہ جیسے

سب کے دل کا قرار لائے گا
منتظر لوگ ہیں یہاں بیٹھے
کل کا سورج بہار لائے گا

اس شعری انتخاب کے دوسرے حصے میں کوئی پینتالیس، پچاس غزلیں شامل ہیں، عارف خورشید نے جب قلم سنبھالا تو اس وقت تک ادبی تحریکات میں بڑی حد تک اعتدال آچکا تھا۔انھوں نے کھلی آنکھوں سے ترقی پسند تحریک، حلقہ ارباب ذوق اور جدیدیت کا جائزہ لیا اور اپنی راہ کا تعین کیا۔

ان کا ایک شعر ہے۔

لفظ ہے ایک اور عارف میں
لفظ کے رخ ہزار کرتا ہوں

غزل میں الفاظ لغوی معنی تک محدود نہیں ہوتے بلکہ امکانی مطالب لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ لفظ کا تخلیقی استعمال ہی فن کاری ہے، اسی کو انھوں نے ''لفظ کے ہزار رخ'' کرنا کہا ہے۔ اردو غزل یادِ محبوب، حدیثِ دل اور رخِ یار کے ذکر سے خالی نہیں۔ محبت اور عشق، غزل کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق محبت کے جذبات کو کچھ عرصے کے لیے پسِ منظر میں کر سکتے ہیں۔ اس موضوع پر ''سوچ کے جزیرے'' میں بہت سارے اشعار دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

نہ جانے کتنے یگ بیتے ہماری پیاس باقی ہے
عجب سودا ہے ملنے کا ابھی تک آس باقی ہے

گئے موسم کی خوشبو کے سوا کیا پاس باقی ہے
دکھا لہجہ ، بکھرتا ٹوٹتا احساس باقی ہے
ملے تھے کب، کہاں بچھڑے تھے یاد آتا نہیں کچھ بھی
کہیں تو کچھ نہ کچھ کھویا ہے یہ احساس باقی ہے
رکا رکا سا وہ سماں ہے اس گلی کے موڑ پر
کہ ختم اپنی داستاں ہے اس گلی کے موڑ پر
نہ سوچ کی تمیز ہے نہ دل پہ اختیار ہے
عجیب عارفؔ امتحاں ہے اس گلی کے موڑ پر
یاد کس کی تھی جہاں سارا بجھا سا رہ گیا
روشنی دل میں ہوئی باہر اندھیرا رہ گیا
سکون مجھ سے چھین کر وہ اضطراب دے گیا
ہے ریت ریت زندگی عجب سراب دے گیا

گزرتا وقت پاس ایک پل رکا تھا سائے میں
یہ کون لمحے لمحے کا مجھے حساب دے گیا
یوں بھٹکتا ہے شہر بھر میں وہ
بھول جائے کوئی مکاں جیسے
ہے اسی کی ہواؤں میں خوشبو
وہ بچھڑ کر ہے درمیاں جیسے
پتی پتی گلاب بکھرے ہیں
اس کی یادوں کے خواب بکھرے ہیں
مرے پہلو میں جو روشن دیا ہے
وہ میرے آنسوؤں سے جل رہا ہے
اک یاد ہے تیزاب صفت پھول پہ دل کے
رشتہ یہ کبھی ختم وہ ہونے نہیں دیتا
یہ بھی خبر نہ ہوسکی اس کے خیال میں
آکر قریب کون کدھر سے گزر گیا
اب مری بینائی ہے وہ سانولی سی چاندنی
نقش سب دھندلا گئے ، بس ایک چہرہ رہ گیا
تب مجھے ترکِ تعلق پر ندامت کیوں نہ تھی
اب یہی دل میں کھٹکتا ایک کانٹا رہ گیا
پرورش کررہے ہیں اشکوں سے
خواب آنکھوں میں بو گیا کوئی

ان اشعار سے یہ ظاہر ہے کہ شاعر روایتی اور رسمی باتیں نہیں کررہا ہے بلکہ اس میں حقیقی تجربے کی گرمی ہے اور اس کا اپنا ایک انداز بیان ہے اور لہجہ ہے۔ عارف خورشید کی غزل یادِ محبوب اور حدیثِ دل تک ہی محدود نہیں ہے، انھوں نے محرومی حیات پر بھی نظر ڈالی ہے۔

سیاہ دن اسے آواز دیتا رہتا ہے
ذرا سی رات میسر ہو وہ بھی سو لے گا
ہو روز و شب کی کثافت کہ اپنے دل کا غبار
ان آنسوؤں سے خود وہ اپنی آنکھ دھو لے گا

زندگانی کی دھوپ میں عارفؔ
ریزہ ریزہ بکھر گیا ہوگا
جی رہا ہوں مگر ابھی عارفؔ
زندگانی کا منتظر ہوں میں
سوچتا ہوں کہیں نکل جاؤں
اپنے بچوں سے پیار کرتا ہوں
شام تک گھر کا آسمان بھی ہوں
رات ہوتے ہی بے مکان بھی ہوں

شاعر اپنے حوالے سے بات کر رہا ہے۔ لیکن یہ اشعار بے شمار لوگوں کی ترجمانی بھی کر رہے ہیں جو غربت کا لہجہ، بکھرتا ٹوٹتا احساس باقی ہے اور سطح غربت کے نیچے زندگی گزار رہے ہیں اور گزارنے پر اس لیے مجبور ہیں کہ زندگی کے تمام وسائل پر ایک مخصوص طبقے کا قبضہ ہے اور شاعر کے الفاظ میں وہ جی رہے ہیں مگر زندگانی کے منتظر ہیں:

چند اور تلخ و شیریں تجربات کا اظہار اس طرح ملتا ہے۔

جان و دل جیسے رفیقوں میں بھی آج
زندگی نے کیسی الجھن ڈال دی
یوں بھی تھی الجھی ہوئی راہِ حیات
اس نظر نے اور الجھن ڈال دی
تیز ہنس مکھ شریر آنکھوں سے

خواب محروم ہوگئے شاید

محرومی حیات کے تذکرے کے باوجود عارف خورشید کی شاعری میں یاس و مایوسی نہیں ہے بلکہ حوصلہ مندی اور جی داری ہے۔

ہم سے لوگوں کے سر چھپانے کو
ہر جگہ آسمان ہوتا ہے

جب عزم سلامت ہے تو ہے اس کا یقیں بھی
منزل مرے قدموں سے بہت دور نہیں ہے

ذرا یہ شعر دیکھیے۔ یاس یگانہ کے تیور نظر آتے ہیں۔

سلیقہ چاہیے جینے کا ورنہ
کسی نے کیا مجھے عارفؔ دیا ہے

اور انھوں نے ثابت کیا کہ انھیں جینے کا سلیقہ آتا ہے۔ بعض اشعار میں استعارے کا بے ساختہ استعمال نظر آتا ہے۔

اک حادثے سے بچ کے مجھے یوں لگا کہ بس
کاغذ کا اک سفینہ بھنور سے گزر گیا

غزل کے پیرائے میں عارف خورشید نے مرثیہ بھی کہا ہے، وہ غزل اس طرح شروع ہوتی ہے۔

سنو کہنے کو عارفؔ کیا بچا ہے
یہ تازہ غم ہے جینے کی سزا ہے
طبیعت بجھ گئی جاوید ناصرؔ
دلِ عارفؔ بھی اب گھبرا رہا ہے

اس غزل پر کوئی نوٹ نہیں ہے لیکن ہر شعر بول رہا ہے کہ وہ جاوید ناصر کی بے وقت موت کا مرثیہ ہے۔ یہ شعر دیکھیے۔

وہ جو لہجے سے پتھر کاٹتا تھا
وہ شیشہ ہاتھ سے کیسے چھٹا ہے

یہ تو ہے ''سوچ کے جزیرے'' کا غالب حصہ حدیثِ دل اور یادِ محبوب ہی سے متعلق ہے۔ وہ مختلف پہلوؤں سے اس موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔ فراقؔ کہتے ہیں۔

کیا ہے سیر گہِ زندگی میں رخ جس سمت
ترے خیال سے ٹکرا کے رہ گیا ہوں میں

یہی کچھ حال عارف خورشید کا بھی ہوسکتا ہے۔ امید ہے کہ وہ نظم اور نثر کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہوئے کئی مجموعے پیش کریں گے۔ آج کی زندگی کے نو بہ نو موضوعات، نفسیاتی وحسی واردات، سیاسی، قومی اور بین الاقوامی حالات، انسانی تجربات واحساسات، اپنے عہد کی ناانصافی اور عدم مساوات، عالمگیر اضطراب، بگڑتی ٹوٹتی قدریں وغیرہ جیسے رہنما موضوعات ہیں جو عارف خورشید کے منتظر ہیں۔

☆☆☆

وقت کے چاک پر

رشید انجم

عارف خورشید افسانوی ادب میں یوں تو کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ چونکہ تحریر بھی اس شعر کی مانند ہوتی ہے جو آپ کے احساس کو معطر کلی کالمس دے، آپ کے ادراک پر اثر انداز ہو، آپ کے شعور پر دستک دے اور شعور سے اتر کر لاشعور میں متمکن ہو جائے۔ اس سے بہتر تعارف قاری سے کسی قلم کار کا ہو ہی نہیں سکتا۔ عارف خورشید بھی ایسے ہی قلم کار ہیں جن کی کہانیاں ہولے ہولے آپ کے کانوں میں سرگوشیاں کرتی ہیں، چھیڑتی ہیں، گدگداتی ہیں اور فکری تجسس کے کواڑ کھول کر اندر آنے کی پذیرائی کرتی ہیں۔

''وقت کے چاک پر'' عارف خورشید کا ۱۴۴ صفحات پر مشتمل افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ صرف مجموعہ نہیں ہے، چار اصناف و اسلوب پر مشتمل ایک دستاویز ہے۔ افسانے، افسانچے، خاکے اور تبصرے عارف خورشید نے ایک طرح سے یہ جدت کی ہے کہ ایک ہی کتاب میں چار الگ اصناف اور اسلوب یکجا کر دیے ہیں۔ نہ تو یہ خالص افسانوی کتاب ہے، نہ خاکہ اور نہ تبصرہ۔ یہ عارف خورشید کے منچلے قلم کی تحقیقی جولانیاں ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ خاکہ اور تبصرہ بھی خود کو افسانے کے فارم میں ڈھلنے سے روک نہیں پائے اور خاکہ و تبصرہ میں بھی قاری کی دلچسپی اسی طرح برقرار رہتی ہے کہ جیسے وہ کوئی افسانہ پڑھ رہا ہو۔

اس مجموعے میں چار مکمل افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں لفظیات کا کھیل نہیں ہے۔ لفظ کی شہادت ہے جو الفاظ کی بندش کو سطور کی پابند بناتی ہے اور واقعہ و پلاٹ کا تسلسل قائم رکھتی ہے۔ ان مختصر افسانوں میں جامعیت ہے، جو فن کے چاک پر عارف خورشید کے ماہر اور ہنر مند ہاتھوں کی جنبش سے متشکل ہوتے ہیں۔

ایک تبصرہ ہے جو سلیم احمد کے افسانوی مجموعے پر بے لاگ لکھا گیا ہے۔ چار ہی خاکے ہیں

جو قاضی سلیم، حمید سہروردی، جاوید ناصر اور رشید انور پر تحریر کیے گئے ہیں۔ خاکے کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ خاکہ ماہر مصور کی طرح کینواس پر اس کے خطوط کو واضح کرتا ہے۔ تصویر میں مصور رنگوں کی آمیزش سے جس طرح صاحب تصویر کے باریک سے باریک تاثر کو برش کی مدد سے ابھار کر اس کے حسن و جمال کا تعین کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح خاکہ نگار صاحب خاکہ کو قلم کا پائدار تصور دیتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تصویر سے ہم صاحب تصویر کے صورت آشنا ہوتے ہیں اور خاکہ میں صرف اس کا اجمالی تصور ہمارے پردۂ بصارت پر منعکس ہوتا ہے۔

ان کے بعد باون افسانچے ہیں۔ ان افسانچوں میں بھی کہانی پن ہے۔ فن کی تنظیم ہے جو تخلیق کو تحریک دیتی ہے۔ یہ عارف خورشید کا چھٹا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے قبل پانچ افسانوی اور ایک افسانچوی مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ دو شعری مجموعے، دو خاکے اور تبصروں کے مجموعے اور ایک ثلاثی و غزلوں کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ عارف خورشید کو اہل علم و دانش نے سراہا بھی ہے اور ان کو شناخت بھی کیا ہے۔ عارف خورشید اب ان اصناف میں بہت منجھ چکے ہیں کہ اورنگ آباد سے نکل کر ملک کی ادبی برادری بھی ان سے واقف ہو چکی ہے۔

اس مجموعے کا عنوان ''وقت کے چاک پر'' عارف خورشید کے ذہنی میلان کی دلالت کرتا ہے۔ مجموعی طور پر ''وقت کے چاک پر'' کو اردو ادب میں جگہ ملنی چاہیے۔ میں ان کی اس بات سے متفق ہوں کہ ''میری کاوش کو سکہ بند نقاد یا منصوبہ بند ناقص کے نظریہ سے دیکھنے کے بجائے اپنی نظر سے دیکھیے اور فیصلہ کیجیے۔'' میں نے ایک قاری کی نظر سے ان کی کاوش کو دیکھا اور پرکھا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ قاری ہی معترض بھی ہوتا ہے اور معترف بھی ہوتا ہے اور میں ان کے قلم کا معترف ہوں۔

☆☆☆

وقت کے چاک پر

رفعت سعید قریشی

عتیق احمد عتیق نے عارف خورشید کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے ''مقام مسرت ہے کہ عارف خورشید صاحب ایسے کہانی کار ہیں جو سچائیوں پر مبنی انسانی نفسیات اور زندگی کی داخلی و خارجی سطحوں کو ابھارنے ، لیکن ایجاز و اختصار کے ساتھ پوری کائنات معانی کو اپنی کہانیوں میں سمو دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں، خواہ وہ فکر و اظہار جنسی موضوع ہی کیوں نہ ہو۔ اسی فکری بلوغت اور تخلیقی بصیرت نے انھیں ایک اچھا افسانہ نگار بنا دیا ہے۔ اردو کے اچھے افسانہ نگار ہونے کی بناء پر میر کہانی کہلانے کے مستحق ہو گئے ہیں۔'' عتیق اُردو ادب کا ایک معتبر نام ہے عارف خورشید کے متعلق ان کا یہ بیان عارف کی عظمت کو مزید ایک سند عطا کرتا ہے۔ م ناگ نے عارف خورشید کے فن کو سراہتے ہوئے لکھا ہے'' ایک کتاب کے آنے سے ادیب صاحب کتاب ہو جاتا ہے، مجھے پتہ نہیں ایک سے زائد کتابیں آنے پر ادیب کو کیا کہا جاتا ہے، کیونکہ عارف وہ خوش قسمت ادیب ہیں جن کی ایک دو نہیں آج تک کل تیرہ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ م۔ ناگ نے یہ بات غالباً ۲۰۰۱ء میں کہی تھی عارف نے اس کے بعد بھی دو اور کتابیں تصنیف کیں اور اب تازہ کتاب '' وقت کے چاک پر'' انھوں نے کل بہ نفس نفیس غریب خانہ پر تشریف لا کر مجھ تک پہنچائی۔ اس طرح سولہ کتابوں کا یہ مصنف اور میر کہانی کار جب مجھ ناچیز کے گھر آتا ہے تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ '' وقت کے چاک پر'' ایک سو چوالیس صفحات پر مبنی ایک معیاری تصنیف ہے جو پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ باب اول میں چار افسانے شامل ہیں۔ باب دوم میں تبصرہ کے تحت سلیم احمد کی کتاب 'اندھے سفر کا مسافر' پر تبصرہ ہے۔ باب سوم چار خاکوں پر مشتمل ہے، جس میں چار مشہور و معروف ادبی شخصیتوں کے خاکے قارئین کو مکمل طور پر مطمئن مسرور اور محظوظ کرتے ہیں، ان میں قاضی سلیم، حمید سہروردی، جاوید ناصر اور رشید انور شامل ہیں۔ آخری باب میں افسانچے کتاب کی رونق بڑھاتے ہیں۔ افسانہ 'شجر ممنوعہ' میں غازی کا کردار ایک

ایسے جنس زدہ آدمی کا ہے جو اپنی ہیجانی کیفیت سے خود پریشان اور کنفیوزڈ ہے، کبھی وہ شبینہ کے تصور میں گم رہتا ہے اور کبھی اپنی ماضی کو یاد کر کے تصورات کی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ افسانے کی زبان اور بیان کہیں نہ کہیں کافی ہیجان انگیز ہے۔ ''گیلری سے وہ اندر آیا دروازہ بند کیا اور ملکہ سے لپٹ گیا معمول کے مطابق انکار اور اقرار کے بیچ دونوں خود سپردگی سے چھلکنے لگے۔ وہ پوری شدت سے آمادہ ہوا ہی تھا کہ اسے اپنا لڑکپن روشن دان سے جھانکتا دکھائی دیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں پتنگ اڑانے کے لیے چھت پر چڑھ رہا ہے۔ وہ شبینہ سے کہہ رہا ہے اور شبینہ اسے سمجھا رہی ہے کہ شادی سے پہلے ایسا کرنا گناہ ہے۔''

''وہ آنکھیں بند کیے بے حس وحرکت اسی طرح سو رہی تھی، صراحیاں ابھر رہی تھیں۔ یہ نڈھال ہو گیا وہ بحال ہو گئی۔'' عارف خورشید کے ابتدائی افسانوں میں جنس کی لذت کا بیان اس قدر ابھر کر کبھی نہیں آیا تھا آج ان کے افسانوں میں منٹو کا رنگ اعلانیہ نظر آنے لگا ہے۔ یہ تبدیلی ان کی سابقہ روایات سے بغاوت کا اشارہ دیتی ہے۔ شہرت کے اس مقام پر جہاں سعادت حسن منٹو دیگر پہنچ گئے تھے اس کی ایک وجہ غالباً یہی بغاوت کا طریقہ کار تھا۔ کتاب کا دوسرا افسانہ 'سات چاند' بھی کم وبیش اس قماش کا ہے، لیکن یہاں جنسی کیفیت ایک نفسیاتی کش مکش سے نبرد آزما دکھائی دیتی ہے اور آخر کار کہانی کا مرکزی کردار اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ''دوسری عورت کی جو چیز آپ انجوائے کر لیتے ہیں وہ آپ کی بیوی میں کم ہو جاتی ہے۔'' افسانہ ''بے آواز شہادت'' ہم عصر تعلیمی اداروں پر ایک کڑی چوٹ ہے اور حقیقت سے یقیناً بے حد قریب بھی۔ اس افسانے کو عارف خورشید نے ایک اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ کہانی افسانہ نگار کی اپنی آپ بیتی ہو لیکن وہ دور جس نے عارف کے تمام رنگ ڈھنگ بہت قریب سے دیکھے ہیں، ان حالات وواقعات کو اس قدر صراحت سے لکھنا اس لیے بھی ممکن ہو سکا کہ بار بار کا مشاہدہ افسانہ نگار کے حافظے میں غیر ارادی طور پر محفوظ ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ ایک واقعہ ذہن میں آجانے کے بعد دوسرے کئی واقعات خود بخود یاد آجاتے ہیں اس طرح غیر ارادی طور پر ایک مکمل افسانہ نوک قلم سے وجود میں آگیا۔ جہاں تک مدارس کی انتظامیہ اور کارکردگی کا تعلق ہے تو سب سے پہلے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ ہر قوم اپنی آئندہ نسل کے لیے تعلیمی درس گاہ کا اہتمام کرتی ہے تاکہ قوم کے نونہالوں کی ذہنی نشو ونما ٹھیک طرح سے پروان چڑھے۔ یہ کام ان لوگوں

کی ذمے داری ہوتی ہے جن کے ذمے قوم کے بنانے اور سنوارنے کا کام سونپا گیا ہے۔ اگر یہی ذمہ دارانِ قوم شہرت اور دولت کی خواہش میں ادارے سے بد دیانتی اور طلبہ سے ناانصافی کریں تو وہی ہوتا ہے جو آئے دن ہم اخبارات میں پڑھتے ہیں اور یہی بات عارف خورشید نے اپنے افسانے میں پیش کی ہے۔ باب دوم میں صرف ایک ہی تبصرہ ہے جو سلیم احمد کی کتاب 'اندھے سفر کا مسافر' پر کیا گیا ہے، اس تبصرے میں عارف خورشید نے سلیم احمد کی ادبی خامیوں پر زیادہ توجہ دی ہے۔ اگرچہ انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس افسانوی مجموعے میں جتنی خامیاں ہیں اس سے زیادہ خوبیاں ہیں جس کا ذکر انھوں نے مصلحتاً نہیں کیا۔ خاکوں کے باب میں قاضی سلیم پر لکھا گیا ''وقت کے چاک پر'' ایک خوبصورت خاکہ ہے، اتنا ہی خوبصورت جتنی قاضی سلیم کی شخصیت تھی۔ قاضی سلیم سے میری قریبی رشتہ داری تھی۔ میں نے ان کی نجی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ عارف خورشید نے قاضی صاحب کی زندگی کے کئی پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور بڑی دیانتداری سے اسے اجاگر کیا ہے۔ واقعات وحالات کا تسلسل خاکے کو زیادہ جاندار بناتا ہے۔ خاکے میں قمر اقبال، عزیز کاتب، مقتدر نجم، نور الحسنین، مظفر الدین اور وحید اختر کا ذکر شہر کی قدیم روایات واقعات اور شخصیات کی یادیں تازہ کرتا ہے۔ ادب میں اگر نیک سیرت اور نیک دل انسان کو تلاش کیا جائے تو قاضی سلیم کا نام فہرست میں بہت اوپر ہوگا۔ خاکساری، وقار اور متانت میں ان کا شاید ہی کوئی نعم البدل ملے۔ عارف خورشید نے قاضی سلیم پر خاکہ لکھ کر ادب کا ایک نہایت اہم کام انجام دیا ہے۔ ''جتنے اس پیڑ کے پھل تھے'' کے عنوان سے رشید انور پر لکھا گیا خاکہ بے حد Touching ہے۔ رشید انور کے شوقِ علم وادب نے انھیں سعودی عرب کی سرزمین پر بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا، چنانچہ رشید انور سے میری ملاقات الخوبر سعودی عرب کی کتابوں کی دوکان میں ہوئی۔ موصوف اُردو رسالوں کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ موصوف نے مجھے پہچانا اور ہم لوگ کافی دیر تک اورنگ آباد کی ادبی محفلوں کی باتیں کرتے رہے۔ افسوس کہ رشید انور سے میری یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ خاکے سے رشید انور کی زندگی کے کئی رنگ سامنے آتے ہیں۔ افسوس کہ زندگی کے آخری ایام روحانی کرب اور مایوسی کے نذر ہوئے۔ عارف خورشید کے خاکے صرف ادب کا ہی حصہ نہیں بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ یہ تاریخ کا حصہ بھی بن رہے ہیں، جو ایک دستاویز کی شکل میں اگلی نسلوں کو ہماری داستانیں سنائے گی۔ کتاب کے آخری حصے میں افسانچے، عارف خورشید کے قلم

کے جادو کی دل نشینی اور دلچسپی کو قائم رکھتے ہوئے ان کے تحریری اثر کو مزید گہرائی عطا کرتے ہیں۔
کتاب ہذا میں شامل بیشتر افسانچے معاشرتی زندگی کی ایک واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔ معاشرے کے بگاڑ کی سچی تصویر چند سطروں میں یوں ابھرتی ہے جیسے کوزے میں دریا بند ہو۔ واقعیت نگاری اور اخلاق و معاشرت پر تنقید کا یہ رجحان شاید اصلاح معاشرہ میں کارگر ثابت ہو جائے۔

☆☆☆

وقت کے چاک پر

محمد عمر فاروق

''وقت کے چاک پر'' عارف خورشید کی ایک ایسی تخلیق ہے جسے اُردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اس میں آپ نے چار افسانے، ایک تبصرہ، چار خاکے اور ترپن افسانچے شامل کیے ہیں۔ افسانہ زندگی کے بالکل قریب ہوتا ہے۔ افسانہ نگار اپنے آس پاس بہت سی کہانیاں دیکھتا ہے۔ اس میں کچھ ایک کہانیاں اس کے دل پر گہرا اثر ڈالتی ہیں، جنھیں وہ اپنے قلم کے زور سے افسانوں کی شکل دے دیتا ہے۔ کہانی کوئی بھی ہو دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے اس کہانی کو کیسے الفاظ کا پیکر پہنا کر افسانے کی شکل دی ہے۔ کیا وہ اپنے افسانہ کے ساتھ انصاف کر پایا ہے یا پھر سستی شہرت کے پیچھے پڑا ہے۔

افسانہ نگار زندگی کے ہر پہلو کو باریک بینی سے دیکھتا ہے۔ عارف خورشید نے اپنے افسانوں میں زندگی کی مختلف پہلوؤں کو اس طرح قلم بند کیا ہے کہ گویا کہ وہ ایک مسلم حقیقت بن کے سامنے آگئی ہو۔ موصوف کے افسانوں میں زندگی اس طرح زندہ دکھائی دیتی ہے جیسے یہ نگاہ سے گزر چکا ہو۔ افسانہ ''شجر ممنوعہ'' ''وقت کے چاک پر'' کا پہلا افسانہ ہے۔ اس میں موصوف نے جنسی خیالات کو الفاظ دیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

> ''وہ پلٹا اور اس نے ملکہ کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ صبح ساری تھکن بستر سے ہو کر حمام تک پہنچی۔ ملکہ ابھی وہیں ہے وہ تولیہ سے بدن پونچھتا ہوا باہر نکل آیا۔''

اگلا افسانہ ''سات چاند'' ہے۔ اس میں موصوف نے نفسیاتی پہلو کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری افسانے کے ساتھ ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ اس میں ایک کردار پیش کیا ہے جو خوبصورتی کو اپنی بیوی کے بجائے دوسری عورتوں میں دیکھتا ہے اس کے ساتھ عجیب واقعہ پیش آتا ہے کہ وہ جو چیز دوسری عورت کی استعمال کر لیتا ہے اسے وہ اپنی بیوی میں کم دکھائی دینے لگ جاتی ہے۔ جیسے وہ کسی عورت کے

بالوں کی تعریف کرتا ہے اسے اپنی بیوی گنجی دکھائی دینے لگتی ہیں۔

اس کتاب کا تیسرا افسانہ ''داستان مرکب'' ہے اس میں موصوف نے ایک نویں کلاس کے بچے کو جنسی ہوس کا شکاری دکھایا ہے۔

موصوف نے اس افسانہ میں دکھایا ہے کہ ایک نویں کلاس کا نابالغ بچہ کس طرح لڑکیوں کے پیچھے لگ کر اپنی کلاس میں فیل ہوجاتا ہے وہی بچہ بڑا ہوکر تجارت میں خوب پیسہ کماتا ہے مگر عادتیں وہی رہتی ہیں اس کے شوق بادشاہوں سے بھی زیادہ ہوجاتے ہیں۔ جب اس پر بڑھاپا آتا ہے تو وہ سب کچھ چھوڑ کر مسجد میں خدا کو یاد کرنے آجاتا ہے۔

'بے آواز شہادت' اس کتاب کا آخری افسانہ ہے۔ اس میں موصوف نے ایک سائنس کی معلم کو سائنس روم میں بڑی ہڈیوں کے ڈھانچے میں جان آجانے کے بعد گفتگو کرتے دکھایا ہے وہ ڈھانچہ ایک عورت کی شکل میں اس معلم سے باتیں کرتی ہے۔ دور حاضر کے بارے میں باتیں ہوتی ہیں وہ عورت کہتی ہے ادارے اب پہلے کی طرح نہیں چل رہے اس میں ٹیچر رشوت دے کر تقرر کرتے ہیں بچے ان سے اعلیٰ علم حاصل نہیں کر پاتے یا یوں کہنا اچھا ہوگا کہ ٹیچر پڑھانے کے اہل نہیں ہوتے۔ آگے وہ کہتی ہے کہ آج کل بیشتر تعلیمی ادارے جاہلوں کی سرپرستی میں ہی چل رہے ہیں۔ اقتباس:

> ''صدر انجمن نے اچانک اسکول آکر رجسٹر حاضری چیک کیا اس پر ایک لیڈی ٹیچر کے دستخط نہیں تھے۔ سوپر وائزر انگلش کا پرچہ سیٹ کر رہا تھا۔ صدر نے پوچھا ان کی درخواست کہاں ہے اس نے وہی پرچہ ہاتھ میں تھما دیا صدر انجمن نے ایسے دیکھا جیسے پڑھ رہا ہو اور کہاں ہاں ٹھیک ہے فائل میں لگادو۔''

مندرجہ بالا اقتباس میں موصوف نے یہ تلخ حقیقت پیش کی ہے کہ ادارہ کا صدر جو خود کم علم ہوتا ہے مگر دوسروں پر اپنا رعب ڈالتا رہتا ہے۔

اس مجموعہ میں موصوف نے 'اندھے سفر کا مسافر' سلیم احمد کی کتاب کا تبصرہ بھی کیا ہے۔ اس تبصرہ میں آپ نے ان کی خوبیوں اور خامیوں کا بڑے اچھے ڈھنگ سے ذکر کیا ہے اس سے بھی موصوف کی باریک بینی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

موصوف نے اس کتاب میں چار خاکے بھی شامل کئے ہیں پہلا خاکہ 'وقت کے چاک پر' قاضی سلیم کی یادوں کو تازہ کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ دوسرا 'وہ ایک افسانہ طراز' حمید سہروردی، تیسرا 'جتنے اس پیڑ کے پھل تھے' رشید انور اور آخری خاکہ 'پرانا غم کہانی بن گیا' جاوید ناصر کی یادوں کے پھول اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

موصوف نے اس کتاب میں ترپن افسانچے بھی شامل کیے ہیں۔ انھیں پڑھنے کے بعد قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اتنے کم الفاظ میں اتنی بڑی بات۔ یہی اصل افسانچے کی پہچان ہے۔

☆☆☆

وقت کے چاک پر

ڈاکٹر مسعود جعفری

اورنگ آباد کے نئی نسل کے نمائندہ شاعروں میں قاضی سلیم ، بشر نواز ، قمر اقبال کا نام لیا جاتا ہے۔ انہی میں ایک اہم تخلیق کار عارف خورشید بھی ہیں ، جن کی اب تک چودہ کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ عارف خورشید کا ذہن تخلیقی آبشار میں ڈوبا رہتا ہے۔ ان کا مشاہدہ عمیق ہے اور وہ انسانی سرشت کا بخوبی احاطہ کرتے ہیں ۔ وہ انسان کے ظاہر و باطن کی شناخت کا فن جانتے ہیں ۔ ان کی شاعری غیر معمولی طور پر اثر پذیری رکھتی ہیں۔ ان کی نثر میں سماج کی پر فریب ریا کاریوں پر بھر پور طنز پایا جاتا ہے۔ ان کا طرز اسلوب سحر انگیز اور عبارت میں تہہ داری پائی جاتی ہے ۔ ان کے فقرے لا جواب اور راست دل میں اترتے چلے جاتے ہیں ۔ انھوں نے ادب کی سماجیات کا بغائر مطالعہ کیا ہے ۔ انھیں ادب کی مختلف تحریکوں کا ادراک ہے۔ وہ ترقی پسندی ، جدیدیت اور پوسٹ ماڈرن ازم کے نشیب وفراز سے واقف ہیں۔ ان کی زبان سیدھی ہوتے ہوئے بھی تخلیقی سحر انگیزیوں سے معمور ہوتی ہے۔ یہ لسانی وفکری گہرائی ہمیں ان کے افسانچوں میں جا بجا دکھائی دیتی ہے ۔ پڑھتے ہوئے قاری کا دل اور دماغ دونوں بے کراں نشاط وانبساط میں ڈوب جاتے ہیں ۔ مکر وفریب ، کذب و بہتان اور تصنع کی نقاب سماج کے چہرے سے اترنے لگتی ہے ۔ سچائی اور حقیقت سامنے آنے لگتی ہے ۔ عارف خورشید قاری کو سماج کا آئینہ دکھاتے ہیں ۔ ان کے افسانچے پڑھتے ہوئے ہمیں بے طرح لبنانی مفکر خلیل جبران کی حکیمانہ تحریریں یاد آجاتی ہے ۔ وہی کیفیت ، وہی انداز ، وہی فلسفیانہ نکات ''وقت کے چاک پر'' ہمیں دکھائی دیتے ہیں ۔ عارف خورشید ایک روشن خیال ، لبرل دانشور ادیب ہیں ۔ ان کی معرکتہ الآراء تصنیف ''وقت کے چاک پر'' اپنی جلو میں حشر سامانیاں لیے ہوئے ہے ۔ اس کتاب کا ہر ورق نا قابل فراموش ادبی شاہکار ہے ۔ قاری ، عارف خورشید کا ہم سفر بن جاتا ہے ۔ وہ ان کے تخیل کے نگار خانے کی سیر کرنے لگتا ہے ۔ اس کا دامن خیال وفکر کے گوہر آبدار سے بھر جاتا ہے ۔ عارف خورشید نے تین ادبی شخصیتوں قاضی سلیم ، جاوید ناصر اور رشید انور پر خاکے لکھے ہیں ۔ انھوں نے قاضی سلیم کے فن اور

شخصیت کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔قاضی سلیم کی سرآج پر تضمین دل کو چھونے لگتی ہے۔

آتما میری تڑپتی ہے سلگتے تن میں
جیسے بے چین ہو شوریدہ کرن درپن میں
کیا قیامت سی گزر جاتی ہے اک اک چھن میں
جب سے تجھ عشق کی گرمی کا اثر ہے من میں
تب سے پھرتا ہوں اداسی ہو برہا کے بن میں

قاضی سلیم کا خیال تھا کہ شاعری پڑھنے کی نہیں، سننے کی چیز ہے اور انھوں نے اپنی نظم 'نوحہ' سنائی۔عارف خورشید نے قاضی سلیم کے شعروں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی نظموں میں غزل کا ڈکشن بولتا ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے قاضی سلیم کے اشعار کا حوالہ بھی دیا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

پھول کھلے ہیں آج تو کل یہ کہاں رہیں گے
میری روح کے سناٹوں میں راگ بسے ہیں

(لحن)

شور و فغاں میں کیسے جئیں گے
محبت کا سہارا بے بسی کا انتہا ہے

(اس جنم میں)

اب میرا ہاتھ ہے
اور ہاتھ کی یہ زندہ حرارت شائد
تم کو محسوس ہو بدلے ہوئے موسم کی طرح

(دوسری کربلا)

یہی وہ ڈور ہے جس سے بندھی ہے کائنات اپنی
ذرا بھی فرق آئے تو بکھر جائے حیات اپنی

(جائزہ)

گلی گلی میں چیختا ہے دھاڑتا ہے خوف
دلوں کو جیسے چیرتا ہے پھاڑتا ہے خوف

(وعید)

حسن کی ہر جنبش مشکوک یہ سہمے ہوئے دل
جانے کب پہلے اس انداز سے دھڑکے ہوں گے

(لمس گذیدہ)

لے کے ہزار نامۂ اعمال ہاتھ میں
مصروف تھا کشاکشِ فکر نجات میں

(عروس البلاد)

عارف خورشید نے قاضی سلیم کے تعلق سے ایک دلچسپ واقعہ بھی بیان کیا ہے۔لکھا ہے کہ قاضی سلیم نے ایل ایل بی جامعہ عثمانیہ سے کی تھی۔وہ اورنگ آباد میں عدالت میں حاضر ہوتے، پیشیاں بڑھواتے اور ہوٹل میں پہنچ کر وحید اختر اور بشر نواز سے ملاقاتیں کرتے۔شعر وشاعری کا ماحول گرم رہتا۔اس طرح ایک دن انھوں نے پیشی تبدیل کرنے کی درخواست کی لیکن فاضل جج نے پیشی آگے بڑھانے سے انکار کر دیا۔دوستوں کے پاس جانے میں تاخیر ہوگئی اس اثناء میں وحید اختر اور بشر نواز نے ان پر طنزیہ شعر لکھ ڈالے۔

قاضی سلیم کان ملاحت سلام علیک
اے فیل شاعری کے مہاوت سلام علیک
بے ننگ و نامِ بزمِ وکالت سلام علیک
تو آتے آتے کونسی محفل میں رہ گیا
شاید الجھ کے دامنِ قاتل میں رہ گیا
دن رات پیتا پھرتا ہے سڑکوں پہ بیڑیاں
سو بار چڑھ چکا ہے عدالت کی سیڑھیاں

عارف خورشید نے قاضی سلیم کی پیشہ وارانہ زندگی پر بڑا دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔

''قاضی سلیم شاعری کی وجہ سے وکالت نہیں کر سکے۔ منسٹری نہیں ملی۔ اندرا گاندھی نے غالباً یہ سوچ کر کہ شاعر ہے اسے کیا منسٹر بنائیں نظر انداز کیا۔''

خود قاضی سلیم نے اپنے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا۔

''وکالت نہیں کر سکا۔ اس لیے ابا جان نے خاندان بھر میں مجھے نالائق ٹھہرایا۔ اس نالائق کے لیبل کو ہٹانے کے لیے سیاست میں داخل ہوا تو گھر میں عزت ہوئی۔ شاعری کی وجہ سے نامزد ہوا تھا اس لیے ابا جان نے میری شاعری پر اعتراض بند کر دیا اور سمجھا کہ شاعری سے بھی فائدہ ہو سکتا ہے۔''

یہ امر مسلمہ ہے کہ قاضی سلیم بڑے شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا کینوس وسیع تر تھا۔ انھوں نے اختر الایمان کی طرح نظم کو ایک جہت دی اور معنی و مفاہیم کا در کھول دیا۔ مرزا غالبؔ کی طرح قاضی سلیم بے اولاد رہے، البتہ انھوں نے ایک لڑکی کو گود لیا تھا۔ انھیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ ان کی حیات Event Full نہیں رہی۔ حالانکہ ان کے پڑھنے والے ان کی زندگی کو بھرپور اور کامیاب تصور کرتے ہیں۔ ان کی زندگی ہی میں ان کی شاعری بھی ایونٹ فل رہی۔ ان کا شعری مجموعہ ''نجات سے پہلے'' ادبی دنیا میں منفرد مقام رکھتا ہے۔ انھیں حیات ہی میں عزت، شہرت اور نیک نامی ملی۔

عارف خورشید نے مشہور افسانہ نگار حمید سہروردی پر ''وہ ایک افسانہ طراز'' کے عنوان سے خاکہ مرتب کیا ہے۔ یہ خاکہ بھی نہایت معلوماتی اور دلچسپ ہے۔ اس میں جدید افسانوں اور قدیم کہانیوں کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ ایک جگہ حمید سہروردی نے اپنے افسانے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے:

''چھوڑو بھی۔ میرے افسانے تمھیں پسند نہیں آتے۔ تمھیں علاء الدین والی اور جاسوسی دنیا پسند آتے ہیں اور نہیں تو کیا وہیں باتیں لکھتے ہو جو روز دیکھتے ہیں۔ جن سے ہم چھٹکارا چاہتے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے بھولنا چاہتے ہیں تو تم علاء الدین کی کہانی میں خود کو بھولنا چاہتے ہو۔ دھوکا دینا چاہتے ہو۔''

عارف خورشید نے حمید سہروردی کی شخصیت کو بھرپور خراج تحسین پیش کیا ہے۔ انھیں

جدید افسانہ نگار تسلیم کیا ہے۔ اس خصوص میں انھوں نے شمس الرحمٰن فاروقی کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ افلاک میں گلبرگہ کے نمائندہ قلمکاروں کے انتخاب میں حمید سہروردی بھی ہیں۔

عارف خورشید نے اورنگ آباد کے ایک اہم شاعر جاوید ناصر پر ''پرانا غم کہانی بن گیا ہے'' کے عنوان سے پُر اثر خاکہ لکھا ہے۔ انھوں نے جاوید ناصر کی زندگی کے اتار چڑھاؤ، دھوپ چھاؤں کا تفصیلی احاطہ کیا ہے۔ بقول جگر مراد آبادی:

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

کے مصداق جاوید ناصر پر بھی مے نوشی نے منفی اثرات مرتب کیے۔ ان کی صحت گرتی گئی اور ملک عدم کو سدھار گئے۔ زندگی میں تو ان کی شاعری پر وار کیے جاتے رہے۔ ان کی وفات پر تعزیتی جلسے میں ان کی شاعرانہ عظمتوں کا اعتراف کیا جانے لگا۔ اس پر عارف خورشید نے ایسے لوگوں کے دوہرے پن کو بے نقاب کرتے ہوئے ترش لہجے میں لکھا ہے کہ:

''تمھاری نظموں کو بے معنی، تمھارے اشعار کو دولخت، تمھاری باتوں کو بناوٹی، تمھارے علم کو کتابی کہنے والوں کو آج تمھارے فن کی انفرادیت پر بڑا ناز، تمھارے انداز گفتار پر بڑا فخر، تمھاری دوستی پر غرور، تمھارے گناہ میں معصومیت نظر آنے لگی ہے۔ یہ کیسے لوگ ہیں جو تمھیں دفن کر کے آنے کے بعد یہ نہیں سوچتے کہ انھیں اسی مٹی میں دفن ہونا ہے۔''

عارف خورشید نے منافقانہ رویے کی قلعی کھولتے ہوئے جاوید ناصر کو ایک شعر کے ذریعہ خراج عقیدت پیش کیا ہے:

اٹھ اٹھ کے آسماں کو بتاتی ہے دھول کیوں
مٹی میں دفن ہوگئے کتنے صدف یہاں

عارف خورشید نے آخری خاکہ ''جتنے اس پیڑ کے پھل تھے'' معروف افسانہ نگار رشید انور پر لکھا ہے۔ انھوں نے مرحوم کے افسانوں کا مجموعہ ''روپیوں کا پیڑ'' کا مکمل جائزہ لیا ہے۔ کتاب کے سرورق پر روپیے بکھرے پڑے ہیں اور پیڑ ننگا کھڑا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پیسہ تو کمایا جاتا ہے لیکن

صبر وسکون اور قرار اور محبت کی چھاؤں میسر نہیں آتی ۔ یہ ایک علامت ہے کہ روپیوں کا پیڑ بے سایہ ہے۔ پیڑ تلے جو سکے بکھرے پڑے ہیں اس میں ایک بھی روپیہ ہندوستانی نہیں ہے ۔ یہ بھی ایک علامت ہے۔ایک جملہ بڑے پتے کا ملتا ہے۔ ''جب پیسہ نہیں تھا تو بھائیوں میں مثالی اتحاد تھا۔جب پیسہ آیا تو مثلالی اختلاف ساتھ لایا۔'' یہ فقرہ عہد حاضر میں دولت کی حرص وہوس کی عکاسی کر رہا ہے۔ دولت کس طرح رشتوں کے پر کتر دیتی ہے۔ انسان کو تنہائیوں میں ڈھکیل دیتی ہے۔ لیل ونہار میں تلخیاں گھول دیتی ہے۔ انجام افسوس ناک ہی نہیں عبرتناک ہوتا ہے۔ عارف خورشید نے اس بارے میں معنی خیز اشعادرج کئے ہیں۔

دھوپ مرنے پہ رہ گئی پیچھے
چھاؤں کی آرزو اسے تھی بہت
جان نکلی ہے پیڑ کے نیچے

افسانہ نگار رشید انور کے خاکے کا اختتام عارف خورشید صاحب نے پاکستان کے مشہور شاعر شکیب جلالی کے ایک شعر پر کیا ہے، جو دل وذہن کو دعوت فکر دیتا ہے:

آکے پتھر تو میرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پس دیوار گرے

عارف خورشید نے اپنی کتاب کا نام ''وقت کے چاک پر'' رکھا ہے۔ وقت کا پہیہ چلتا رہتا ہے، یہ تھمتا نہیں، اسے قیام میسر نہیں۔ اسی چاک کو انگریزی میں Cycle بھی کہا جاتا ہے۔ گوتم بدھ نے دوہزار سال پہلے اپنا خطبہ گیا کے ہرن کے باغ میں دھرم چکر پر دیا تھا۔انسانی دکھوں اور مصائب وآلام کوخواہش کا سبب بتلایا تھا۔ یہ نظریہ آج بھی صحیح معلوم ہوتا ہے۔خواہشات کے بطن ہی سے مسائل اور رنج والم پیدا ہوتے ہیں۔ انسانی ذہن پراگندہ اور روح کربناک بن جاتی ہے۔ عارف خورشید نے کتاب کا نہایت فصیح و بلیغ، فلسفیانہ نام رکھا ہے۔ اس سے ان کی دانشوری جھلکتی ہے۔ انھوں نے اورنگ آباد کی زرین ادبی روایات کو آگے بڑھایا ہے۔ اورنگ آباد صدیوں سے تصوف، الہیات، سیاسیات اور علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ کیسے کیسے انمول نگینے اس خاک سے چمکے۔ اور دنیا کی نگاہوں کو خیرہ کر گئے۔ آج بھی اس شہر جاویداں میں عارف خورشید جیسے بے مثال شاعر وادیب وانشاء پرواز اورناقد ادب موجود ہیں۔ جن کی نگارشات کے آفتابوں سے دور دور تک روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ ☆☆☆

وقت کے چاک پر

وصیل خان

عارف خورشید ایک کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں اور شاعری بھی بڑے متوازن انداز میں کرتے ہیں۔نثر ہو یا نظم نگاری ان کا بیانیہ ایک خاص وجدانی کیفیت کے ساتھ عصر حاضر کے سماجی و معاشرتی زاویوں کی کثافتوں اور لطافتوں کو اس مشین کی طرح چھانٹنا اور الگ کرنا چلا جاتا ہے جو واٹر فلٹر پلانٹ میں نصب ہوتی ہے۔کہیں کہیں ان کی یہ صفائی مہم اسلوب اور بیانیہ کو گنجلک اور ژولیدہ ضرور کردتی ہے لیکن اس سے اصلی مقصد مجروح نہیں ہونے پاتا نہ ہی افسانے اور کہانی کی بُنت اور اس کے نشیب و فراز پر کوئی خاص اثر پڑتا ہے۔یہی سبب ہے کہ کہانی رواں دواں رہتی ہے حال ہی میں ان کی تازہ ترین کتاب ''وقت کے چاک پر'' موصول ہوئی جس میں شجر ممنوعہ، رات چاند، داستان مرکب ہے اور بے آواز شہادت کے عنوان سے کُل چار افسانے اور چار ہی خاکے قاضی سلیم ،حمید سہروردی ، جاوید ناصر اور رشید انور پر تحریر کیے گئے ہیں اور اس کے بعد کل اکیاون افسانچے شریک کتاب کئے گئے ہیں۔افسانوں ،خاکوں اور افسانچوں میں جو قدر مشترک پورے جوش اور جرأت وعزم کے ساتھ پائی جاتی ہے وہ ان کے لہجے کا کھرا پن اور صاف گوئی ہے۔وہ سماج کے رستے ناموروں سے قاری کو نہ صرف آشنا و آگاہ کرتے ہیں بلکہ اس کے سدباب اور تدارک کے لئے بھرپور تحریک چلاتے ہوئے لہو میں حدت بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔بے راہ روی، گمراہی اور صنف نازک کے ساتھ عامیانہ جنسی تلذذ کے حصول کو وہ سماجی برائیوں کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔افسانہ ''سات چاند'' اس لحاظ سے اہم درجہ پر فائز ہوتا ہے جس میں اس نفرت انگیز اور متعدی بیماری کو انتہائی پراثر اور عملی تجربے کے ساتھ عمل اور ردعمل کی تھیوری کے ساتھ سمجھانے کی سعی سعید کی گئی ہے محض جنسی تلذذ کی تلاش انسانی تخلیق کا مقصد نہیں، نسل آدم کی بقا وتحفظ کا انحصار اعلی اخلاقی اقدار میں مضمر ہے اس تھیوری کی انھوں نے بڑے فلسفیانہ انداز میں تفہیم کی کوشش کی ہے۔سات چاند کا یہ اقتباس دیکھیں:

''کل اتوار ہے وہ اس خیال سے دیر تک ٹی وی دیکھ کر بیڈ روم میں داخل

ہوا۔ بیوی ابھی تک جاگ رہی تھی اس کی آنکھوں نے خود سپردگی کا اشارہ
کیا تو یہ انجان ہوگیا۔ لائٹ بند کی اور گلابی مچھر دانی درست کر کے لیٹ
گیا۔ سوچتے سوچتے اس کے ذہن کے اندھیرے میں ایک جگنو چمکا۔
دوسری عورت کی جو چیز آپ Enjoy کر لیتے ہیں وہ آپ کی بیوی میں کم
ہو جاتی ہے۔ اس کی سانس تیزی سے چلنے لگی، اس نے کئی بار استغفار
پڑھا۔ اگر ایسا ہوتا رہا تو......اب آخری چیز......''

افسانہ نگار چونکہ ایک طویل عرصے سے درس و تدریس جیسے مقدس عمل سے وابستہ رہ چکا ہے، تعلیمی سطح پر آج جو گراوٹ اور سوقیانہ رنگ حاوی ہو چکا ہے جس نے سماج اور معاشرے کے خمیر کو ہی پراگندہ کر دیا ہے اس کا متاثر ہونا فطری بات تھی۔ اس نے اپنے غم و غصے کو جب صفحۂ قرطاس پر بکھیرا تو بے آواز شہادت جیسا حیرت انگیز اور انگشت بدنداں کر دینے والا افسانہ وجود میں آیا۔ یہ اقتباس دیکھیں جو موجودہ دور میں سفاکیت، مطلب براری، خودغرضی اور طرح طرح کی بدعنوانیوں کو اجاگر کرتے ہوئے ان نام نہاد مقدس چہروں سے نقاب سرکاتا ہے۔ جس کی جرأت اب عام انسانوں میں سرعت کے ساتھ مفقود ہوتی جا رہی ہے۔

''صدیوں کی خاموشی کے بعد وہ پھر گویا ہوئی۔ ایک مدرس رمضان کے
آخری عشرے میں اعتکاف میں بیٹھتا ہے اور رجسٹر پر دستخط بھی کرتا ہے۔
دوسرا جماعت میں کرسی پر پیر اٹھا کر بیٹھ جاتا ہے اور پنج سورہ پڑھتا رہتا
ہے۔ جب طلبہ شور کرتے ہیں تو چلاتا ہے۔ چپ بیٹھو حرام زادو! میں پنج
سورہ پڑھ رہا ہوں۔ باتیں کرو گے تو گناہ ملے گا۔ گناہ کس کو ملے گا بیشتر
تعلیمی ادارے جاہلوں کی سرپرستی میں چل رہے ہیں۔''

خاکہ نگاری ایک الگ طرز نگارش کی متقاضی ہوتی ہے۔ جس میں افسانوی یا شعری رنگ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ عارف خورشید یہاں قدرے کمزور دکھائی دیتے ہیں اور ان کا قلم چلتے چلتے افسانوی اور شعری روش پر چل پڑتا ہے جس سے تھوڑے ہی وقفے کے لیے سہی ایک انقباضی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور خاکوں کو بے رنگ کر جاتی ہے لیکن اس سے قطع نظر ان خاکوں میں بھی وہ تیکھا لب و لہجہ ہر جگہ

نظر آتا ہے جو ان کے طرز نگارش کا اہم وصف ہے جو انھیں ادب کی اس صنف (خاکہ نگاری) میں بھی ہم عصروں میں سر بلند کرتا ہے۔ ''وقت کے چاک پر'' عارف خورشید کی ایسی تخلیق ہے جس پر مختلف زاویوں سے بہت کچھ لکھے جانے کی گنجائش موجود ہے۔ افسانوں، خاکوں اور افسانچوں کے تناظر میں مجموعی طور پر وہ ایک اہم قلمکار کی صورت میں ابھرتے ہیں لیکن جنسی تلذذ کا بیانیہ اور اس سے زیادہ رغبت و دلچسپی انھیں اصل موضوع سے کچھ دیر ہی کے لیے سہی منحرف کر دیتی ہے اور قاری بھی افتاں و خیزاں والی کیفیت سے دوچار نظر آنے لگتا ہے اور اس کی کیفیت مسافروں سے لدی پھندی اس کشتی جیسی نظر آنے لگتی ہے جو طغیانی کے سبب ہچکولے کھا رہی ہو۔ افسانوں کی بہ نسبت افسانچوں میں وہ زیادہ بولڈ دکھائی دیتے ہیں۔ چند سطروں یا لفظوں میں بڑی بڑی باتیں کرنا نہایت آسان عمل دکھائی دیتا ہے لیکن حقیقتاً یہ عمل پتّے کو پانی کر دینے والا ہے۔ عارف خورشید اس عمل سے بڑی آسانی سے گزرتے ہیں۔ زبان و بیان پر قدرت اور شگفتہ و شیریں طرز نگارش نے بھی اس کٹھن اور مشکل راہ میں ان کا بڑا ساتھ نبھایا ہے ہم انھیں بہت عظیم افسانہ نگار، شاعر یا تخلیق کار تو نہیں گردان کر سکتے لیکن ان کی فنی جہات، فکری بلندیوں اور حصول مقصد کے پیش نظر انھیں غیر معمولی فنکار کے درجے پر ضرور فائز کرنا چاہیں گے۔

☆☆☆

اجلے لفظیات کا چمکتا آبشار

احمد عثمانی

اچھا ہوا کہ عارف خورشید نے اس ناولٹ کے کسی پنے پر تاریخ کے ہندسے نہیں ابھارے۔ تاریخ نہ دینے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ یہ ناولٹ "لہولہو آرزو" آرزو اور تمنا کی طرح ہر صدی کے سینے میں زندہ اور تابندہ ہے۔ بقلم خود عارف خورشید:

"یہ روشن کہانی، گل چراغوں اور بولتی خاموشیوں میں لکھی گئی۔ محمود شکیل کی واہ واہ پر سر اٹھا کر دیکھا تو استحسانِ فن کے جگنو، ڈاکٹر مظہر محی الدین، محمود ہاشمی، ثریا ہاشمی کی آنکھوں میں جگمگاتے نظر آئے اور روشنی میں ڈاکٹر ثاقب انور خاں، ڈاکٹر یوسف عثمانی، ڈاکٹر مجید بیدار و ادریس محمد فاروقی کے چہرے دکھائی دیے۔

ابھی شاعیں منعکس ہوئی تھیں کہ مولانا عبدالرشید ندوی مدنی، نورالحسنین، سید رضوان اللہ، ابوبکر رہبر اور وجاہت قریشی حاضر ہوگئے۔ میں کہانی سناتا رہا اور تاثر چہروں پر پڑتا رہا۔ کسی نہ کسی موڑ پر ہر چہرہ اسی کہانی کا کردار بنتا دکھائی دیا۔"

عارف خورشید کا اس طویل ساختیے کے بعد ناول کا سفر شروع ہوتا ہے۔ یہ ساختیہ اس ناول کے سفر سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے ہنری جیمس کا ایک اور ساختیہ ناگزیر ہے کیوں کہ یہ اس ناول کو پر کھنے سے جڑا ہوا ہے اور بھائی عارف خورشید نے کرداروں کو اپنے سامنے لا کھڑا کیا ہے اور ان کے چہروں پر تاثر پڑ رہے ہیں۔

"کردار کیا ہے؟ وہ واقعے کا تیقن نہیں ہے؟ واقعہ کیا ہے؟ اگر وہ کردار کی وضاحت نہیں کرتا؟ کوئی تصویر یا کوئی ناول کیا ہے اگر وہ کردار کے بارے میں نہیں ہے؟ کردار کے علاوہ ہم ناول یا تصویر میں تلاش ہی کیا کرتے

ہیں اور حاصل ہی کیا کرتے ہیں؟ اگر کوئی عورت اس طرح کھڑی ہو کہ وہ
اپنا ہاتھ میز پر ٹکائے آپ کو ایک خاص انداز میں دیکھے تو یہ ایک واقعہ ہے یا
اگر یہ ایک واقعہ نہیں ہے تو میرا خیال ہے کہ کہنا بہت مشکل ہوگا کہ پھر یہ اور
کیا ہے۔''

عارف خورشید نے جو پہنچا اور نکل لیا، جو پہنچا ہی نہیں ایسے کردار کو اپنے اداریے میں سمیٹ لیا ہے۔ ناول، افسانہ، نظم، غزل ان ہی پہنچنے اور نہیں پہنچنے اور نکل جانے والے کرداروں کے لیے لکھا جاتا ہے یا سنایا جاتا ہے۔

ناولٹ قدیم داستان کا پرتو ہے۔ جو لوگ الاو کے گرد بیٹھ کر طوطا پری، رستم وسہراب، امیر حمزہ کی داستانیں سنتے تھے وہ اب ناولٹ پڑھ رہے ہیں اور پڑھتے رہیں گے کیوں کہ یہ ہی ناولٹ داستان سے افسانہ اور افسانے سے ناولٹ اور ناولٹ سے ناول بن گئی ہے۔

عارف خورشید کے ناولٹ ''لہولہو آرزو'' میں لفظ لفظ حقیقتوں میں پرویا ہوا ہے۔

''سیپ میں موتی بنتے ہی کیا وہ سمندر کی گہرائی میں نہیں اتر جاتی؟ میرا دل
سمندر ہے اور اس میں تمھاری محبت گہرائیوں میں اترتی جارہی ہے۔ اس کو
زمانے کا پیراک نکال پائے گا؟
لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، وامق عذرا تو اتنی گہرائی میں نہیں گئے
ہوں گے اس لیے پیراک انھیں نکال لایا۔ (لہولہو آرزو ۳۵)

عارف خورشید کا یہ ناولٹ چھوٹا سہی لیکن اس میں الفاظ کا آبشار ہے۔ آرزو کا سمندر ہے۔ لہولہان تمناؤں کا کشت وخون ہے۔ عارف خورشید نے اس ناولٹ میں اپنی جامد آرزو کو حرکت دے کر ایک پھڑ پھڑاتا ہوا بت تراشا ہے۔ جو پڑھنے والے کی توجہ پوری طرح اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور پڑھنے والا پوری طرح اس آبشار کی پھوار سے لطف اندوز ہوتا ہے کیونکہ اس بڑے ناول میں مجھے روایتی اور تمثیلی علامتوں کا دریا لہریں مارتا نظر آتا ہے لیکن نا تو اس میں روایت شکنی کا زنگ ہے نا ہی تمثیلی علامتوں کا بوجھل پن ہے نا ہی کہیں اس کا تاثر متاثر ہوا ہے۔

اس ناول کی ترتیبی ومعنوی انسلاکات کی کھوج میں جٹنے پر یہ بات سامنے آئی کہ شعری

اظہار نثر کے لیے بڑا تریاق ثابت ہو سکتا ہے۔ جو نثر کے بوجھل پن پر زہر کو ختم کر سکتا ہے۔ عارف خورشید نے یہی کیا کہ ان کے ناول میں کہیں بھی بوجھل پن نہیں ہے اس میں شعریت سے بھرپور استعفادہ کیا گیا ہے۔

یہاں جناب حامدی کاشمیری کا ایک مثبت ٹکڑا جوڑنا بھلا لگتا ہے۔

> انسان ایک حیاتیاتی Phenomenon ہے۔ فطری عروج و زوال کا پابند، تاہم سماجی، جذباتی اور جمالیاتی سطح پر زندگی کرنے سے اسے باطنی طور پر قدروں کا ادراک ہوتا ہے اور زندگی کی تدریجی زوال کے نتیجے میں قدروں کی زوال آمدگی ایک اذیت ناک صورت حال کو جنم دیتی ہے۔

یہی صورت حال 'لہولہو آرزو' میں لہو بن کر اس کے رگ و پے میں سنسناتی ہے، رواں دواں ہے۔

> احساس کا شبنمی سورج، شگفتہ و شائستہ تصورات کی دنیا کیسے لوگ ہوں گے وہ جنھیں سب کچھ مل جاتا ہے۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں ملا۔ (صفحہ ۲۸)

بہت ہی معتبر اور معزز نقاد ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ نے تحریر فرمایا:

> اس ناولٹ کی روح، اس کی جذباتی انتہا پسندی ہے جو اس کے ڈانڈے کہیں اس کچی پکی رومانیت سے جوڑتی ہے، جس کی ترجمانی کا سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور قاضی عبدالغفار کرتے تھے اور کہیں رومانیت کی توسیع تہذیب بھی کرتی ہے۔

اس چٹکی بھر ناول میں ایٹم بم کی طرح بے قرار خیالات کی چنگاریاں بھری ہوئی ہیں اور بیانیہ اس قدر تیز لیکن سجا سجایا ہے کہ پڑھنے والا اس بیانیہ کی شگفتگی میں گم ہو جاتا ہے۔

> میری سمجھ بوجھ، قابلیت، دولت، شہرت لے لو اور کم عمری کی حماقتیں لوٹا دو۔ وہ گناہ کا شوق اور خوف، وہ حدود کی دیوار کا منہدم ہوتا سماں وہ جگنوؤں کی چمک پر چنگاریوں کا گماں وہ سب وقت کی رفتار کے ساتھ دوڑتے مناظر بن گئے۔ (صفحہ ۲۲)

''لہولہو آرزو'' میں عارف خورشید نے جس ہیرو کی تخلیق کی ہے یا جس کردار کو بے پناہ

سوچ وفکر کا احساس دیا ہے وہ مصنف کی جادوگری ہے۔ کہیں کہیں تو نثر کو شعر میں ڈھال دیا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کہانی کا کردار بہت ہی ہنرمند، سلیقہ منداور ذہنی طور پر تندرست ہے۔ اس کے ساتھ ہی علمی استعداد بھی خاصی رکھتا ہے کیوں کہ گماں ہوتا ہے کہ شدت جذبات کے ساتھ ہی جب وہ کلام کرتا ہے ہر لفظ سے بہاروں کا گماں ہوتا ہے۔

> آواز کے قدموں کا خیالات کی مٹی پر ثبت ہو جانا ایک تصوراتی معجزہ ہے جو مجھ جیسا پیامبر ہی کر سکتا ہے۔ (صفحہ ۳۳)

> جانے کون جذبہ...... جو گناہ کی ڈگر سے پرے کرتا رہا اور پھر رفتہ رفتہ خود میں قید ہو کر خود سے آزاد ہونے کی دعا مانگنے لگا۔ (صفحہ ۱۲)

مولانا شبلی نعمانی نے لکھا۔

> شعر ایک قسم کی مصوری ہے۔ فرق یہ ہے کہ مصور صرف سادی اشیا کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ برخلاف اس کے شعر ہر قسم کے خیالات، جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہے...... اس بناء پر کسی چیز کا بیان جب اس طرح کیا جائے کہ اس شے کی اصل تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے تو اس پر شعر کی تعریف صادق آئے گی۔ مولانا کا نظریہ نقدِ ادب افلاطون ارسطو سے جاٹکراتا ہے۔

> ''محبت ایک شعلہ ہے جو کہیں بھی، کسی کے بھی دل میں کائنات کے کسی حصے میں بھی، روحوں کے بامقصد سفر میں بھی، اندر بھی، باہر بھی، کسی کے آگ دکھانے پر بھی خود بہ خود بھی لپک سکتا ہے...... (صفحہ ۳۲)

محبت کی کہانیاں تو بہت لکھی گئیں۔ مشہور بھی ہوئیں۔ کیونکہ کہانی انسانی ذہن ودل میں ہوتی ہے۔ پروفیسر شافع قدوائی کا یہ ساختہ میری وکالت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

> کہانیوں سے دلچسپی نہ صرف ہماری معاشرتی، تہذیبی اور تخلیقی کائنات کی تشکیل کا ابتدائی اور مستقبل کا حوالہ بھی ہے۔

عارف خورشید کی نثر نا صرف جاندار ہے بلکہ شاندار ہے۔ ہر ٹکڑے پر شعر کا گماں ہوتا ہے جو

ایک نثر نگار فن کار کے خلاف ذہن کو اجاگر کرتا ہے۔ بوجھل واقعہ جو کہ محبت کہلاتا ہے، بہت پرانا ہو چکا ہے۔ اس کو الفاظ کی لڑیوں میں پرو کر قدیم کے دلدل سے نکال کر جدید عہد میں لا کھڑا کرنا یہ کمال ہے۔ اس کمال کو بخوبی انجام تک عارف خورشید نے پہنچایا ہے۔ شعور کی رو جو ادھر ادھر بھٹکتی ہے اسے عارف خورشید نے صحیح سمتیں دی ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ہر عہد کا ادب یا ہر نیا رجحان جب احساس اور شعور کی نئی کائنات کی دریافت کرنے کے عمل سے گزرتا ہے تو ان ہی پرانے لفظوں کے Deep Structure تخلیقی عمل کے فشار سے بدل جاتے ہیں۔

اسی طرح شمس الرحمٰن فاروقی فرماتے ہیں:

> زبان ایک پہلے سے موجود حقیقت ہے اور ہم زبان ہی کے حوالے سے ہر شے کو پرکھتے ہیں۔

یہاں ہم اگر زبان کے وسیلے سے ''لہو لہو آرزو'' کو پرکھیں تو ہمیں عارف خورشید کی زبان کا حوالہ دینے میں انتہائی مسرت ہوتی ہے کہ انھوں نے الفاظ کی بے ساختگی سے ماحول پیدا کیا ہے وہ بہت ہی پُر اثر ہے۔ پڑھنے والا چاہتا ہے کہ اسی قسم کے الفاظ کی چادر تنی رہے اور وہ اس میں دھنسا رہے۔ ایک ساختیہ ملاحظہ کیجیے۔

> منظروں کے گھاؤ خاموشی سے سہتا رہتا ہوں۔ زخموں کے علاوہ بھی بہت کچھ اپنے دماغ، جسم اور روح، تصورات کے سنہری خواب اور حقیقت کے دہکتے الاؤ سب کے ساتھ بہہ رہا ہوں۔ (صفحہ ۲۳)
>
> ''تاریک محرابوں میں زندگی کرنے کا فلسفہ بڑی حفاظت سے رکھ کر محراب کو آستانہ بنا دینا ہمارا حق مادری رہا ہے، ہم اپنے خون میں رواں سچائی کو چھوڑ کر اپنی ہی جوتیاں سامنے رکھے سجدوں میں مصروف ہیں۔ مگر میں شبینہ سے معذور تمھاری یاد کے پتھر رکھے آستانے کے آستانے بنائے جا رہا ہوں۔'' (صفحہ ۳۶)

یہاں ہم اسے تسامح ہی کہیں تا کہ اس داستان گو کے اندر اتنا شعور بھرا ہوا ہے کہ وہ زندگی کرنے کے فلسفے کو تاریک محراب میں حفاظت سے رکھا دیکھ کر ناقد بن گیا ہے۔ لیکن خود بھی اس زندگی کرنے کے فلسفے سے گریز کرتے ہوئے شبینہ سے معذور ہوش سے اور اپنی ہی جوتیاں سامنے رکھ کر سجدے کرنے والوں کو تاڑ لیتا ہے لیکن زندگی کرنے کے فلسفے سے خود کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا بلکہ یاد کے پتھروں سے آستانے سجائے پھرتا ہے۔

عارف خورشید نے جب داستان گو کو اتنا شعور عطا کیا تو انھیں چاہیے تھا کہ وہ زندگی کرنے کے فلسفے سے کچھ تو فائدہ اسے پہنچاتے۔ لیکن مصنف کی شعوری رو برساتی نالے کی طرح بے سہارا بھٹکتی پھرتی ہے۔ اس کے باوجود اس برساتی نالے کہ رو میں بڑی کشش ہے۔ جیسا کہ انسانی جبلت اور فطرت ہے کہ وہ سمندر میں اٹھتی بے قابو لاٹوں، لہروں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اسی طرح اس ناولٹ کو پڑھنے پر بڑا خوشگوار اثر ہوتا ہے۔ جس کو ہم صرف عارف خورشید کا کمال کہہ سکتے ہیں۔

☆☆☆

کہانی کی کھوج

راہی فدائی

اردو ادب میں روایات کی پاسداری بڑی سختی سے کی جاتی ہے، چاہے روایت کی بنیاد کسی غیر معقول عنصر پر کیوں نہ رکھی گئی ہو۔ مثلاً ہمارے نقادوں سے ابتدا میں غزل میں تغزل کی روایت پر اس قدر اصرار کیا کہ آج بھی ہم اسی کو سچ مان کر عشقیہ مضامین سے غزل کا دامن بچاتے ہوئے کافی شرمسار نظر آتے ہیں۔ غزل ہی کی طرح افسانوں اور ناولوں کا معاملہ بھی ہے۔ فکشن کی شروعات میں ہم نے افسانے اور ناول میں کہانی اور کرداروں کی موجودگی پر زور دیا مگر جب ۱۹۶۰ء کے بعد جدید افسانے اور نئے طرح کے ناول لکھے گئے جن میں بظاہر مذکورہ دونوں عناصر ناپید تھے تو ایک واویلا مچ گیا، ''قصہ گم شد'' کے ماتمی نعرے بلند کیے گئے اور کہانی کی مرگِ ناگہانی پر خوب مرثیے پڑھے گئے۔ اس پروپیگنڈے سے ہندوستان کے افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں کا متاثر ہونا لازمی تھا، اور پھر ۱۹۸۵ء کے بعد ہمارے ادبی چارٹر پر ''کہانی پن کی بازیافت'' کی تحریر نمایاں ہوئی تو کم سواد نقادوں نے اطمینان کا سانس لیا، اس کے بعد طمانیت کے اس سمندر میں کس نے ہلکا سا تموج بھی برپا کرنا چاہا تو اس کے خلاف طوفان بدتمیزی کی فضا پیدا کی گئی۔ ایسی ناشائستہ صورت حال میں ''لہو لہو آرزو'' جیسا ناولٹ تخلیق کرنا عارف خورشید جیسے جیالوں ہی کا کارنامہ ہے۔

عارف خورشید کا ناولٹ ۱۹۹۰ء میں تحریر کیا گیا ہے اور یہ فنی اعتبار سے ''خودکلامی'' (Monologue) کی تکنیک کے زیر اثر وجود پذیر ہوا ہے۔ عارف نے خودکلامی کو تخلیقی سطح پر اس قدر بلند کر دیا کہ یہ ایک قابل قدر ادب پارہ کی صورت اختیار کر گیا۔

''لہو لہو آرزو'' کسی مرتب و مربوط کہانی کا نام نہیں مگر اس میں ایسا بھی نہیں ہے کہ کوئی کہانی سرے سے ہی نہ ہو اور یہ تحریر کسی دیوانے کی بڑ کی طرح محسوس ہو رہی ہو بلکہ اس ناولٹ میں کہانی پن کی ایک زیریں لہر موجود ہے جس کا لطیف تموج کہانی کے وجود کا احساس ضرور دلاتا ہے۔ اس مقام پر یہ

معلوم کرنا بے محل نہ ہوگا کہ کہانی کس کیفیت کو کہا جاتا ہے اور اس کی موجودگی کی دلیل کیا ہوگی ۔ کہانی دراصل کسی حقیقی یا غیر حقیقی کردار کے تصوراتی اور تخیلاتی واقعات و حادثات کے بیان کا نام ہے ۔ اس تعریف کی روشنی میں کہانی کے بے شمار روپ اور سیکڑوں رنگ ہوتے ہیں جیسے گھریلو قصے ، عشقیہ داستانیں ، مافوق الفطرت کرداروں کے واقعے ، تاریخی ، سیاسی ، سماجی کہانیاں اور شخصی اور انفرادی حالات وغیرہ وغیرہ و مجمل ۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ شعر کے دو مصرعوں میں بعض اوقات ایک طویل کہانی پوشیدہ رہتی ہے اور اسی طرح ایک تخلیقیت سے معمور جملہ مکمل افسانے کے مترادف ہوتا ہے ۔ غرض اس بحث سے ہماری مراد یہ ثابت کرنا ہے کہ ہر تخلیق چاہے وہ نظم ہو یا نثر خود اپنی جگہ ایک افسانہ اور ایک کہانی ہے ۔ اگر اس مفروضے کو آگے بڑھائیں تو یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ افسانے یا ناول میں کہانی کا برملا اظہار ضروری نہیں ہے ، یہ اس لیے کہ اس میں غیر محسوس طریقے میں کہانی اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے رہتی ہے جس کو کہانی پن سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔

عارف خورشید کے ناولٹ ''لہو لہو آرزو'' مذکورہ دعوے کی بہترین دلیل ہے ، جس میں ظاہراً کہانی کا تسلسل نہ ہوتے ہوئے بھی 'کہانی پن' کا احساس موجود ہے ۔ وہ یہ کہ ایک پروفیسر اپنے ناکام عشق کو اپنے باطن میں چھپائے ہوئے تصورات و خیالات میں اپنے معشوقہ سے نہ صرف ہم کلام ہوتا ہے بلکہ اسے اپنے جذبات سے آگاہ بھی کرتا ہے اور اس کے ذہنی رویوں کو سمجھنے کی سعی لاحاصل بھی کرتا ہے ۔ اس طرح وہ خود کو مطمئن کرنے اور اپنے آپ کو آسودہ کرنے کی کوشش کرتا ہے ، اس غیر فطری عمل سے اس کا اضطراب بے حد بڑھ جاتا ہے ، آخر کار اس کے توقعات کے خلاف نتیجہ سامنے آتا ہے ۔

یہ ناولٹ ایک بزدل شریف زادے کی نفسیات کے گرد دائرہ در دائرہ گھومتے ہوئے اس نکتے تک پہنچ جاتا ہے جو حقیقتاً مرکزی نکتہ ہے ۔ عارف خورشید نے اپنی اعلیٰ تخلیقی اُپج کو بروئے کار لاتے ہوئے واحد متکلم کردار کے تصورات و احساسات کی ترجمانی بڑے ہی عمدگی و شائستگی سے کی ہے ۔ موصوف نے موقع بہ موقع اور جابجا ایسے بلیغ جملے استعمال کیے ہیں جس سے زبان و بیان پر ان کی خلاقانہ قدرت کی غمازی ہوتی ہے ۔ مزید زندگی کے متعلق موصوف کے فلسفیانہ نقطۂ نظر اور استدلالی فکر نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے ۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں:

'' زندگی لمحۂ جاوداں اور سلگتی خاموشی کے اس سفر میں کئی روپ بدلتی

ہے۔ غور و فکر کے کئی زاویے بنتے اور ٹوٹتے ہیں ۔ نظریات کی جنگ جاری و ساری ہے، نیتوں کے زلزلے آتے رہتے ہیں ۔ مگر یہ سب کچھ میری زندگی میں کیوں نہیں ہوا؟''

''زمانہ چاہے لاکھ کروٹ بدلے، دستانیں چاہے اپنے روپ بدل بدل کر جنم لیتی رہیں ۔ بات تو پرکار کی اس نوک پر آ کر رک جاتی ہے۔ جس کی گردش سے دائرے بنتے اور ٹوٹتے ہیں۔ محبت کے اس پرکار کی گردش نے میری زندگی کے محیط کو جگہ جگہ سے شکستہ کر دیا ہے اور درد کو جاوداں۔''

''محبت کو لذت کے پیمانے سے ناپنا روحوں کو لباس پہنانا ہے۔ جب کہ لباس کا تعلق جسم سے ہے، ہم ایک دوسرے کا لباس ہوتے اگر جسم ہوتے ہم ایک دوسرے کے ہیں ۔ دور تک ایک دوسرے میں سمائے ہوئے۔ صدیوں تک ایک دوسرے میں بسے ہوئے ۔ نگاہوں کا تصادم، محبت میں آہیں، شکوے، وفا بے وفائی کا گلہ، یہ سب روحوں کی حد تک ناجائز ہے۔ جس طرح جسموں کی حد تک بغیر رسم ادا کیے ایک دوسرے کا لباس ہونا ناجائز۔''

''میرے لبوں پر کئی کہانیاں آئیں ۔ میں نے کبھی بھی لبوں سے لبوں کو کہانی سنانے اور جسموں سے جسموں کا افسانہ بنانے پر یقین نہیں کیا۔ تمھارا تصور ایک ہی لے پر بجنے والا دماغی ساز ہے جو جسموں کو ثانوی اہمیت دیتا ہے۔''

''نیک اور شریف انسان بھی اپنے دل میں گناہ کی آرزو رکھتا ہے ۔ وہ تصورات میں سب کچھ کرتا رہتا ہے اور گنہگار نہیں ہوتا اس لیے کہ گناہ کر گزرنے کے بعد شروع ہوتا ہے اور ثواب نیت ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ یہ اچھی گنجائش ہے۔ گناہ کی ہمت نہ ہو تو تصورات سے ہی لطف لیا جائے ۔ ایسے گناہگاروں کا تصور کتنا پختہ ہوتا ہے کہ وہ گناہ کر کے لطف

اندوز ہونے والے کو پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔"

بہر حال عارف خورشید نے اس ناولٹ کے ذریعے افسانوی ادب میں نہ صرف ایک بے باکانہ تجربہ کیا ہے، بلکہ ہمارے نام نہاد نقادوں کے تقلیدی ذہن اور کوتاہ فکر کو آئینہ بھی دکھایا ہے۔ راقم الحروف کو امید ہے کہ اب نہ سہی مستقبل میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی بلکہ اس ادب پارے کی صحیح قدر و قیمت کا بھی تعین کیا جائے گا۔

☆☆☆

لہولہو آرزو

رحمٰن عباس

اردو میں ناول نگاری کو کچھ لوگ داستانوں کی فضا کا ارتقا تصور کرتے ہیں۔ مجھے نہیں پتہ یہ بات کس حد تک درست ہے۔ پریم چند کی غیر تہہ دار حقیقت نگاری کی صورت ناول اپنی واضح شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ لیکن بطور ناول نگار پریم چند اتنے ہی کارگر ہیں جس حد تک شعور کی رو کا دفتر بیان کرنے کے لیے عینی آپا کو کچھ نقاد یاد کرتے ہیں۔ ترقی پسندوں کی سپاٹ سماجی حقیقت نگاری نے ناول کو فائدہ کم، نقصان زیادہ پہنچایا۔ اس عہد کے ناول اخباروں کی خبروں کے 'جذباتی بیان' کے علاوہ اور کیا ہیں۔ جدیدیت کے دور میں یوں بھی ناول کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ جدید نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کی صلاحیتیں افسانے سے ترقی پسند عناصر اور فارم کے کلاسیکی لوازمات کو ختم کرنے میں لگی رہیں۔ آج ایسا لگتا ہے فاروقی کی صلاحیتیں فکشن کی تنقید کی تعمیر میں صرف ہوتیں تو اردو ناول کا کچھ بھلا ہوتا۔ دو ایک شعری بیانیہ تحریروں کو فاروقی نے ناول کے طور پر اچھالنے کی بہت کوشش کی لیکن یہ وہ تحریریں تھیں جنھیں جدید افسانے کے چیستان کا وسیع روپ کہا جا سکتا ہے۔

گزشتہ صدی میں بہ مشکل ہمارے پاس پانچ چھ انفرادی کاوشیں ہیں جو عمدہ ناول کہی جاتی ہیں۔ ان کا تعلق نہ ترقی پسندی سے ہے نہ جدیدیت کی گمراہی سے۔ یہ وہ ناول ہیں جن میں آدمی اور سماج ایک دوسرے سے متصادم نظر آتے ہیں۔ خارجی عوامل (سیاسی اور مذہبی) کس طرح آدمی اور باطنی زندگی کو متاثر کرتے ہیں اس کا احساس ان ناولوں میں جاری ہے۔ مثال کے طور پر خدا کی بستی، نادار لوگ، زمین اور بستی کو دیکھ لیجیے۔ ان ناولوں کے باوجود اردو ناول میں ہمہ گیری اور زندگی کی سنگلاخ صداقتوں سے روبرو ہونے کا مادہ آج بھی نظر نہیں آتا۔ ہمارا ناول اتنا ہی Kistch کا شکار ہے جتنا ہمارا علمی، سماجی، فلسفیانہ، معاشی اور عمرانی شعور Dogmatism کی زد میں ہے۔ اردو ذہن کی

ناپختگی کا احساس اردو ناول کی صورت حال سے ہوتا ہے۔

ناول کی تنقید اردو میں برائے نام ہے۔ ناول کی تنقید کے نام پر گمراہی کا ایک دلدل ہے۔ اس کا سبب تہذیبی زوال، علمی زوال اور دنیا کے ناول سے ہماری واقفیت کی کمی اور اپنے لوگوں کو پروموٹ کرنے کی غیر ذمے دارانہ روش ہے۔

اس پس منظر میں عارف خورشید کے ناولٹ ''لہولہو آرزو'' پر ایک چھوٹا سا مضمون لکھنا میرے لیے واقعی دشوار ہے۔ عارف خورشید اورنگ آباد (مہاراشٹر) کی مشہور شخصیت ہیں۔ عارف خورشید نے افسانے، افسانچے، خاکے لکھے ہیں، شاعری کی ہے اور مضامین بھی لکھے ہیں۔ عارف دوستوں کے دوست اور غیر دوست نقادوں کے بھی دوست ہیں، جنھوں نے ان کی تخلیقات پر خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ عارف خورشید شہر اورنگ آباد میں نورالحسنین، شاہ حسین نہری، سحر سعیدی، اسلم مرزا اور دیگر اردو قلمکاروں کے ساتھ مل کر مہمان ادیبوں کو شہر کی زیارت کراتے ہیں اور شہر کی تاریخی روایت سے واقف بھی کراتے ہیں۔ اردو کی ادبی صورت حال پر وہ ہر بات جانتے ہیں اس لیے اس موضوع پر وہ وقت ضائع نہیں کرتے اور نہ ہی کسی کو فوراً اپنی تخلیقات سناتے ہیں۔ عارف خورشید پر جوش قلم کار ہیں اور بہت ہی مہذب آدمی ہیں۔

''لہولہو آرزو'' کے عنوان سے ان کا ناولٹ ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ انتساب میں انھوں نے لکھا ہے:

> ''اس کی محبت نے ہمیشہ میرے خودسر جذبوں کی نفی کی اور مجھے ضبط و تحمل کی راہوں پر گامزن کرنے کی کامیاب کوشش بھی۔ اور کیا عجب کہ وہ خود بھی اس کہانی کا کردار محسوس کرے۔''

یہ بیان اس بات کا عندیہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس ناولٹ کی کہانی جس معشوقہ کے بارے میں لکھی گئی ہے وہ بھی اس ناول میں خود کو بطور کردار محسوس کر سکتی ہے۔

عارف خورشید نے اس ناولٹ میں قارئین کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ روشن کہانی گل چراغوں اور بولتی خاموشیوں میں لکھی گئی ہے...... اردو ادب نے بے شمار ناولٹس کا ذخیرہ دیا ہے۔ ''لہولہو آرزو'' ان دھڑکتے دلوں کی آواز ہے جو بے آواز دھڑکن کے مسیحا ہیں۔ مصنف نے اپنے ناولٹ

پر اظہار خیال کر کے بہت سے قارئین کے لیے ایک سبیل معنی کی نکالی ہے تا کہ جب وہ یہ ناول پڑھیں تو ترسیل کی ناکامی کا شکار نہ ہوں اور غالباً اسی لیے ''حرف معتبر'' کے عنوان کے تحت ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ کا ایک پر مغز مضمون بھی ناول میں شائع کیا گیا ہے۔ جس کو پڑھنے کے بعد ناولٹ کو پڑھنے کے لیے کچھ لوگ بے قرار ہوں گے اور کچھ لوگ مضمون پر ہی اکتفا کریں گے۔

عارف خورشید کا یہ ناولٹ ایک تجرباتی تحریر ہے اور تجربے کی سطح پر اس میں ہیئت اور اسلوب کا ایسا امتزاج ہے۔ جس سے یہ تحریر ایک طویل نثری نظم بن گئی ہے۔ ناولٹ میں ایک عشق اور اس عشق کی کیفیات سمائی ہوئی ہیں۔ ناولٹ میں تجرید کا عنصر شامل ہے۔ پلاٹ غیر منظم ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جدیدیت اور پلاٹ سے عاری کہانیوں کا کچھ اثر عارف خورشید نے قبول کیا ہو۔ ستر سے اسّی کے عرصے میں یوں بھی جن لوگوں نے لکھنا شروع کیا ان میں سے بیشتر ہیئت پرستی کا شکار ہوئے تھے کہ اس زمانے میں شب خون تحریک شباب پر تھی اور شمس الرحمٰن فاروقی کا فرمان عام تھا کہ کہانی پلاٹ کی قید سے آزاد ہو اور معنی کی سطح پر گنجلک ہو۔ عارف خورشید نے پلاٹ کا تجربہ ضرور کیا ہے لیکن ان کا یہ ناولٹ گنجلک اور بے معنی تحریر نہیں ہے۔ اس میں شعری زبان اور استعاروں کی بھرمار ہے۔ جذبات کا سیلاب نہیں بلکہ سونامی ہے۔ جس میں عارف خورشید خود بھی بہہ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کا قاری بھی بہہ کر عشق کی کارگزاری کا گواہ بنے۔ غالباً اسی لیے ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ نے لکھا کہ:

> ''اس ناولٹ کی روح اس کی جذباتی انتہا پسندی ہے۔ جو اس کے ڈانڈے کہیں اس کچی پکی رومانیت سے جوڑتی ہے۔ جس کی ترجمانی سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور قاضی عبدالغفار کرتے تھے اور کہیں اس رومانیت کی توسیع وتہذیب بھی کرتی ہے۔''

ناولٹ کے کینوس پر عاشق اپنی کیفیات دل کا پر شور نغمہ سنا رہا ہے۔ قاری کو اسی نغمے میں معشوقہ کے کردار کو دریافت کرنا ہے۔ واحد متکلم اس ناولٹ کا راوی ہے۔ جس کی جذباتی دنیا میں تلاطم واقع ہے اور اسی تلاطم میں عارف خورشید آدمی کی جذباتی زندگی کی تفسیر تلاش کرنے کی دعوت قاری کو دے رہے ہیں۔ عشق کے موضوع پر اردو فکشن میں بہت کم لکھا گیا ہے اور جو لکھا گیا ہے وہ بہت بامعنی نہیں ہے۔ چار اچھے رومانی حقیقت پسند ناول ہماری ادبی تاریخ میں ہمارے پاس نہیں ہیں جن میں

مادام بواری، Love in the time of choleraیا کنڈیرا کے ناولوں کی جھلک بھی مل جائے۔ ایسے میں عارف خورشید نے اس موضوع کو منتخب کیا، یہ بات بھی قابل تحسین ہے۔

ناولٹ کے راوی کا دکھ اس بات میں پوشیدہ ہے کہ اس نے اپنی محبوبہ سے شادی نہیں کی اور اب اس کو کسی طور فراموش بھی نہیں کر رہا ہے۔ جس کے سبب اب میری خاموشی پر یہ الزام بھی لگا کہ میں دماغی توازن کھو چکا، میں بعض اوقات بے ربط باتیں کرتا ہوں۔ میں خود کلامی کے مرض میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ یہ احساس...... شاید صحیح ہو۔ مگر سارا صحیح، سارا سچ غلط اور جھوٹ ٹھہرا۔ صرف ٹھہرا رہا تو وہ لمحہ جب تم بھی اور میں بھی...... ایک دوسرے کی آگ ایک دوسرے میں انڈیل کر ٹھنڈے ہو جانا چاہتے تھے۔ اس لمحے، میں بڑی سرعت سے تم سے الگ ہو گیا تھا اس لیے وہ لمحہ وہیں ٹھہر گیا اور آج تک وہیں ہے۔" یہ بیان ناول کی اساس کا اظہار ہے۔

ناولٹ میں مذکورہ بالا ایک لمحے اور اس لمحے سے پیدا ہونے والے غم کی تفسیر ہے۔ یہ تفسیر بیان کرنا میرا کام نہیں ہے بلکہ اس کے لیے آپ کو یہ ناولٹ خود پڑھنا ہوگا ممکن ہے آپ کے لیے یہ ناولٹ ویسا تجربہ نہ ہو جیسا میرے لیے رہا ہے۔ اس ناولٹ کی قرأت میں جس بات نے مجھے مایوس کیا وہ یہ ہے کہ یہ بہت مختصر ہے۔ ممکن ہے یہی بات دوسرے قارئین کو اچھی لگے۔ میری فکشن کی پیاس جلدی بجھتی نہیں ہے۔ میں نے فکشن پڑھنے کی شروعات 'لیس مزریلبرل' سے کی تھی جس کی ضخامت ایک ہزار پانچ سو صفحات تھی۔ چنانچہ عارف خورشید کا ناولٹ ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میرے ساتھ کتابی صورت میں رہا۔ البتہ جذبات کی جو سونامی اس ناولٹ میں انھوں نے جزیٹ کی ہے وہ کئی دنوں تک رہی اس کا شاید ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں اگر محبت کا بیان کرنا چاہوں گا تو ایسا شعری آہنگ ایک تو میرے بس کی بات نہیں اور دوسرے شاید میرا مزاج مجھے اس کی اجازت بھی نہ دے۔ میں عصمت جاوید شیخ کی اس بات سے متفق ہوں کہ 'مجھے امید ہے کہ عارف خورشید کے تخلیقی اظہار کے کنوارے راستوں پر چلنے کی یہ کوشش ان کے ادبی سفر کا شاندار آغاز ہوگا۔"

عصمت جاوید کی پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی ہے آج عارف خورشید کے پاس کئی افسانے ہیں اور ایک ناول پر وہ محنت بھی کر رہے ہیں۔ میں پر امید ہوں کہ عارف خورشید کا آئندہ شائع ہونے والا ناول ان امکانات کا حامل ہوگا جس کے اشارے اس ناولٹ میں پوشیدہ ہیں۔ ☆☆☆

﴿افسانہ﴾

قضائے عمری

عارف خورشید

میرا وجود داستان بنا اور میں ایک ناہموار راہ پر چل پڑا۔ اگر تو سمندر ہے تو میں قطرہ اور پھر قطرے اور سمندر کے خواص میں تفریق کا منبع یاد ہانہ کہاں سے گردانا جائے؟

وہ میرے سامنے مشتعل جذبات واحساسات کا نشانہ اپنی نگاہوں میں سمائے کمرے میں چلے گئے۔

وقت کی دہلیز پر میرے قدم پڑنے لگے۔ میرا یہ ایک ہی تو بیٹا ہے جو اپنی ہر خوشی کی تکمیل میں سرگرداں رہتا ہے تو اچھا لگتا ہے۔ بہو بھی تو جیسے اسی کے لیے بنائی گئی ہے۔ میرے جسم کی حرارت میرے اندر گردش کرتے لہو کو ماضی کی طرف سرکا رہی ہے۔

کمرے سے ہنسی کی آواز، مدھم سرگوشی، پھر خاموشی اور اندھیرا...... میرا دھیان ذرا اِدھر اُدھر ہوا تو نگاہ خالی بستر پر پڑی...... مرجانے کی تمھیں بڑی جلدی تھی...... مرجاتیں...... میرے ساتھ مرتیں ...... میرے بعد مرتیں...... نہیں...... میرے بعد نہیں...... ورنہ شاید تم بھی...... میری طرح ٹھنڈی آگ میں جلتی رہتیں...... نہیں جلتیں...... تم تو بہو سے جھگڑا کرتیں اور وہ بحث وتکرار کرتی تو تم مطمئن ہو جاتیں۔ مگر میں تو بیٹے پر خفا ہوتا ہوں تو وہ سر جھکا کر سن لیتا ہے اور پھر بہو کے غصہ کا نشانہ بھی بن جاتا ہے کہ ابا جان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کیوں کرتے ہیں آپ...... سرگوشیاں...... غائب بالکل غائب......

میرا ذہن بھی ایسا ہی سوچ اور تھکن کے داروں سے نکل کر صفر پر آجاتا تھا۔ بالکل خالی ہوجاتا تھا۔ تب ساری سرگوشیاں، تکیہ کی ساری کہانیاں بالکل خاموش ہوجاتی تھیں۔ خالی خالی لمحہ کتنا اچھا لگتا تھا۔ خالی لمحہ طویل نہیں ہوسکتا تھا؟ لمحہ طویل ہوتا تو لمحات میں بدل جاتا اور لمحات ہر جائز وناجائز کے بند توڑ کر آگے نکل جاتے۔ لمحہ لمحہ ہی رہا، اس لیے آج یادوں کے کھلے کمرے میں مقید بھی ہے اور محفوظ بھی۔

کمرے کے دروازے کے کھلنے کی آواز...... اور پھر...... وہ خفا ہو رہا ہے۔ میں نے تم سے

کئی مرتبہ کہا کہ حمام (Latrine) کا بلب جل گیا ہے مجھے یاد دلاؤ میں بدل دوں گا...... مگر تم...... تم کو فرصت کہاں...... ہلکا سا غصہ...... شاذ یہ خاموش ہے۔ غصہ اور خاموشی...... جو مطمئن ہو جانے کا علی الاعلان ثبوت پیش کر رہا ہے۔

پیشاب تو مجھے بھی آ رہا ہے...... مگر...... اس عمر میں بھی اپنی قوتِ برداشت آزما رہا ہوں۔ اگر میں بھی کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تو وہ شرمندہ ہو جائیں گے۔ شرمندہ تو میں ہو جاؤں گا۔ اس لیے کہ دن اور راتیں تو ان ہی کی ہیں۔ میرا تو کچھ بھی نہیں۔ اپنا سب کچھ جو میں انھیں دے چکا۔

تم بھی اسی طرح باہر نکل کر...... لہنگے میں...... بہو بھی اگر لہنگے میں ہو گی تو...... وہ سوچے گا ...... ابا جان کو نیند نہیں آتی...... دن بھر بیٹھے اونگھتے رہتے ہیں۔ آنکھ کھل گئی اور سامنے جو نظر آ گیا اسے نصیحتیں کرتے رہتے ہیں اور رات میں...... بس جاگتے رہتے ہیں۔ اب انھیں فکر کاہے کی ہے۔ سو کیوں نہیں جاتے...... گڈو نے ایک مرتبہ پوچھا تھا: ''دادا جان آپ کو لیند آلہی ہے سو دائیے نا'' (دادا جان آپ کو نیند آ رہی ہے سو جائیے نا) اس کو کیا معلوم ڈال پر جھولتی چڑیا موسم سے کس قدر لطف اندوز ہوتی ہے۔ میں بھی ماضی کی ڈال پر بیٹھا جھولے لیتا رہتا ہوں۔ مگر آج تک پینگ بڑھا کر ڈالی چھونے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اچھا ہوا لڑکا ہے۔ لڑکی ہوتی تو اب تک شادی کر دینی پڑتی...... اپنے آپ کو بالکل کم عمر سمجھتے ہیں آپ...... اور میں کہتا بیگم اپنی شادی جلدی ہو گئی...... میرے کئی کلاس میٹس ابھی تک کنوارے ہیں...... کنوارے یا غیر شادی شدہ...... تم بحث کے موڈ میں ہو...... اور جملوں سے کھیلنا تمہاری عادت ہے...... اردو کے لیکچرر سے خدا کسی کی شادی نہ کرائے...... اور پھر تم اپنی فتح پر مسکراتیں اور کہتیں...... اچھا اچھا لائٹ آف کر دیجیے۔ ارے یہ کیا کیا...... نائٹ بلب تو جلایئے...... جلاتا ہوں بابا...... مگر روشنی نہیں ہو گی۔ وہی نائٹ بلب جو آدم نے جلایا تھا؟ کیا اس غار میں نائٹ بلب تھا جس میں آدم و حوا رہتے تھے؟ انسان سب کچھ کرنا چاہتا ہے مگر...... ہلکی روشنی میں...... کھل کر کیوں نہیں کرنا چاہتا؟ کون سمجھاتا کہ اندھیرا ہو تو ایک دوسرے میں سما جائیں گے اور پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کون کیا ہے؟ اور پھر...... صبح جلدی اٹھنا...... مجھے نہا دھو کر جلدی جانا ہے...... بغیر نہائے دھوئے کب وقت پر پہنچتے ہیں آپ......

وہ لوگ تو سکون سے سو گئے شاید......

اب نہ کوئی آواز...... نہ سرگوشی...... اور میرے دماغ میں

سرگوشیوں کی بازگشت...... ماضی کے دائرے اور پھر حالت بالکل اس ریٹائرڈ کھلاڑی کی طرح جو اسٹیڈیم میں بیٹھا سوچ رہا ہے کہ ہمارے زمانے میں میچ ٹیلی کاسٹ نہیں ہوتا تھا۔صرف اخبار میں نام آجاتا ہوگا تو لوگ خوش ہوتے ہوں گے اور اس سے پہلے...... اگر اسی طرح سوچتا رہا تو وحشیانہ اور جاہلانہ زندگی تک پہنچ جاؤں گا...... نہیں پہنچ سکوں گا۔اس لیے کہ تاریخ صحیح نہیں ملتی، جو تاریخ ترتیب دے دی گئی ہے بس وہی صحیح ہے۔مورخ شاید دنیا کا سب سے لاپرواہ انسان ہوتا ہے۔اسی لیے تو اہم ترین شخصیات کے بارے میں لکھتے ہوئے احتیاط کا دامن جگہ جگہ ہاتھ سے چھوٹتا نظر آتا ہے۔

وحشیانہ جاہلانہ زندگی اچھی ہوگی...... ننگے جسم...... نہ کسی کو شرم نہ حجاب...... نہ دل میں برائی...... زبان پر مٹھاس...... نہ سیاست نہ مصلحت...... نہ مذہب نہ جواز...... نہ شدت نہ اعتدال نہ اقرار نہ انکار...... نہ نفی نہ مثبت...... نہ خدا نہ منکر...... میں ایسی باتیں کرتا تو تم اکثر کہتیں۔تمھیں انجینئر نہیں فلسفی ہونا چاہیے تھا۔اکثر تم کو نیند نہیں آتی اور میں سکون کی نیند سونے لگتا تو کہتیں...... خودغرض کہیں کے...... مطلب نکل گیا منہ پھیر کر سو گئے اور پھر نیند بھی ایسی کہ پھر صبح کی خبر...... اور وہ بھی کئی بات جلتا چولھا چھوڑ کر باورچی خانے سے آؤ اور صاحب بہادر کو اٹھاؤ...... اور اس خوف سے مرے جاؤ کہ کہیں پھر پکڑی گئی تو سارا نظام درہم برہم...... کالج جانے میں دیر...... صبح صبح ایسا ہوتا تھا۔ایسا پھر کچھ دنوں سے ہو رہا ہے۔میری عارضی زندگی کی رات ختم ہوگئی اور مستقل زندگی کا اجالا پھیل رہا ہے۔مگر ابھی بھی عارضی صبح کا جھلملاتا دھندلکا صبح کاذب تو نہیں۔

رات اس قدر بھیانک ہوتی ہے۔رات تو بہت خوبصورت ہوتی تھی وہ میرے اندر کا پھڑ پھڑاتا کالا کبوتر یا سفید کوا...... جانے کہاں گم ہوگیا ہے۔اب تو صرف یادوں کے سائے اور نگاہوں کی پرچھائیاں ابلتے خون میں گردش کرتی ایک مدھم۔انمٹ۔بجھی بجھی سی...... رہ رہ کر یاد آتی...... آخری سانس کی ایک لے...... ارے میں تو اب بھی...... وہی ہوں...... بے وفائی تو وہ کر گئی...... نہیں...... زندگی نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا...... ورنہ وہ تو...... اپنا سب کچھ...... کبھی اس نے روکا نہیں ہمیشہ ساتھ دیا...... انکار نہیں کیا...... وہ میری ہر جائز و ناجائز خواہش کا احترام کرتی رہی...... وہ جنت میں ہوگی...... جنتی عورتوں کو غلمان ملیں گے...... نہیں میری بیوی کے ساتھ غلمان...... میں برداشت نہیں کر سکتا۔اور مجھے حوریں...... نہیں میں یہ بھی...... مگر میں مرد ہوں...... حوریں تو مرد کو ملنی ہی چاہیے...... نہ حوریں نہ

غلمان ......بس جو بیوی وہی حور جو مرد وہی غلمان ......اور وہ جس نے وعدہ کیا تھا کہ مر کر ضرور ملیں گے ......وہ بھی ملے گی تو انکار کر دوں گا۔ مگر وہ تو حور کی شکل میں ملے گی نا......کیا اس کا شوہر اس کے ساتھ ہوگا؟......نہیں وہ میرے ساتھ ہوگی کیونکہ اس کا وعدہ تھا...... وہ دنیا کوئی دھوکہ بازوں کی تھوڑی ہوگی ......جہاں وعدہ کر کے پھر جانا ہی عقلمندی ہے......اگر ایسا ہوا تو میں خدا سے شکایت کر دوں گا کہ اس نے مجھ سے یہاں ملنے کا وعدہ کیا تھا...... پھر دیکھوں گا کہ وہ بچ کر جائے گی کہاں!......خدا تو بہت بڑا بادشاہ ہے۔ وہ ضرور انصاف کرے گا...... اگر خدا نے فیصلہ سنایا کہ جہاں وعدہ کیا تھا وہیں اس کو پورا کرنا چاہیے......چلو تم دونوں پھر سے دنیا میں چلے جاؤ اور اب ایک دوسرے کو دھوکہ مت دینا......وہ تو تیار ہو جائے گی......مگر میں اپنی بیوی کو غلمان کے پاس چھوڑ کر نہیں جاؤں گا......اگر اس نے بھی کسی سے وعدہ کیا ہوا ہو تو......نہیں ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسا اس کا بھی شوہر سمجھتا ہوگا......اور میری بیوی بھی...... بیچاری معصوم......سب ہی معصوم ہیں اور کوئی معصوم نہیں......

گڈو کھیلتے کھیلتے سو گیا...... چابی کا گھوڑا دوڑ رہا ہے۔ جب تک چابی باقی رہے گی وہ دوڑتا رہے گا۔

اب مجھے جلدی سے غسل کر کے قضاء پڑھ لینی چاہیے۔

☆☆☆

قضائے عمری۔ تجزیہ

ڈاکٹر عظیم راہی

عارف خورشید کے تخلیقی جہات کا جہاں بڑا وسیع وعریض ہے اور اس جہان تخلیق میں ان کے فکشن کی ایک بڑی سلطنت آباد ہے۔ نثر کی دنیا میں انھوں نے فکشن اور غیر فکشن دونوں کو خوب آباد کیا ہے۔ جہاں ایک طرف فکشن میں افسانہ، افسانچہ اور ناولٹ کو انھوں نے اپنے انداز سے ایک نیا پن عطا کیا ہے، وہیں غیر فکشن کے جہان میں خاکے تخلیق کیے اور تبصرے تحریر کیے ہیں۔ افسانے میں موضوع اور تکنیک کا امتزاج انھیں اچھوتا پن عطا کرتا ہے تو افسانچے میں تیکھا، بیباک طنز بھرا چونکا دینے والا لہجہ ان کی شناخت بن گیا ہے اور خاکوں میں افسانوی رنگ اس قدر گہرا دکھائی دیتا ہے کہ اکثر خاکوں پر افسانے کا گمان ہونے لگتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ ادبی شخصیت کا جیتا جاگتا سراپا ہوتے ہیں۔ خاکہ نگاری میں یہی ان کا کمال ہے۔ نثر کی دنیا میں ان کی تخلیق کے اسی ہنر کے نمونے خاکوں کے دونوں مجموعے ''تنظیم کثیر رنگی'' اور ''رنگِ امتزاج'' میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ افسانوں اور افسانچوں کے چار چار مجموعے بالترتیب ''سنہری رت کا فریب''، ''احساس کا زخمی مجسمہ''، ''قافلے والو سچ کہنا'' اور ''اور یادوں کے سائبان''، ''آنکھوں کی زبان'' (مشترکہ مجموعہ)، ''آتشیں لمحوں میں'' اور ''اور کچھ بھی نہیں کہانی میں'' بطور خاص قابل ذکر ہیں، جن میں ان کے فن کا کمال پوری طرح موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ذائقہ بدلنے کے لیے شاعری کے میدان میں زور آزمائی کرتے آئے ہیں۔ ان کی شاعری کے تین مجموعے ''ٹوٹا ہوا آئینہ''، ''دھول کی شال'' اور ''سوچ کے جزیرے'' شاعری کے گلشن میں بھی گل رات رانی کی بھینی بھینی خوشبو بن کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ اس تمہید سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ عارف خورشید ادب کی دنیا کے ایک پاور فل، ہمہ جہت، تخلیق کار ہیں اور ان کا اصلی میدانِ تخلیق نثر کی یہ دنیا ہے اور فکشن میں انھوں نے کئی قابل ذکر افسانے لکھے ہیں، جن میں سفر سفر زندگی، سنگی احاطۂ دل، یہ شام بھی کہاں ہوئی، احساس کا زخمی مجسمہ، آکاش بیل، اڑائی ہوئی گلی، اس طرف کھلنے والا دریچہ، پہنچان، قافلہ والو سچ کہنا، بے آواز شہادت، سات چاند اور شجر ممنوعہ وغیرہ مثالاً پیش کیے جا سکتے

ہیں۔مجلّہ سہ ماہی ''ذہن جدید'' کے افسانوں کے انتخاب میں ان کا ایک افسانہ ''الساس'' شامل ہے۔

عارف خورشید کے افسانوں میں موضوع کی سطح پر تنوع تو بتدریج پیدا ہوا ہے لیکن تکنیک اور جدت کے اعتبار سے یہ خوبی ان کے ہر افسانے میں شروع سے ہی نمایاں طور پر موجود ہے۔ان کے ابتدائی دور کے رومانی افسانوں میں تکنیک کا بدرجۂ اتم استعمال ہوا ہے اور رومان جیسے فرسودہ موضوع کو بھی انھوں نے تکنیک کی جدتوں کے ساتھ ندرت اور نیا پن دینے میں کامیابی حاصل کی ہے اور پھر رومان کی دنیا سے نکل کر زندگی کے دیگر موضوعات بھی ان کے پاس سمٹ آئے ہیں اور اس میں ان کا کلیدی موضوع عورت اور عورت کے مسائل سے عبارت ہے جو تقریباً ان کے ہر افسانے میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔عارف خورشید کے افسانوں میں محض سپاٹ بیانیہ نہیں ہوتا ہے وہ تکنیک کا خوب استعمال کرتے ہیں۔کہیں خود کلامی تو کہیں شعور کی رو کی تکنیک، ساتھ ہی برجستہ مکالمے اور جاندار کرداروں کے ذریعے اپنے افسانے میں کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔افسانے کے ان اہم اجزائے ترکیبی کے ساتھ ہی شاندار زبان بھی لکھتے ہیں اور موضوع کی سطح پر اکثر مرد عورت کی نفسیات کی گتھیوں کو سلجھاتے ہیں۔یہاں ان کے مختلف افسانوں پر تفصیل سے بات کرنے کا موقع نہیں ہے۔میں فی الحال ان کے ایک اہم اور قابل ذکر افسانے ''قضائے عمری'' کا تجزیہ پیش کرنے پر اکتفا کر رہا ہوں جو اُن کے افسانوں کے دوسرے مجموعے ''احساس کا زخمی مجسمہ'' میں شامل ہے، جو ۱۹۹۱ء میں نوائے دکن پبلی کیشنز اورنگ آباد کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا۔میر عنایت علی کی مرتب کردہ ''مٹی میرے دیار کی'' جو، مرہٹواڑہ کے اردو افسانہ کی انتھالوجی ہے، اس انتخاب میں بھی یہ افسانہ شامل ہے۔(یہ کتاب ۲۰۰۱ء میں اورنگ آباد سے شائع ہوئی تھی)

زیر نظر افسانہ میں ایک ایسے باپ بیٹے کے رشتوں کی ان محبتوں کا اظہارِ بیان ہے جو اپنی اپنی حدوں میں رہ کر اپنی سرگرمیِ زیست میں مصروف ہیں۔افسانہ مختصر ہے اور اس کا تھیم اس سے بھی زیادہ مختصر۔لیکن کہانی پوری طرح کھلتی ہے اور قاری پر تاثر بھری کیفیت طاری کر دیتی ہے۔اختصار اور تکنیک خود کلامی اس افسانہ کی خوبی ہے۔بقول محمود ہاشمی:

> ''عارف خورشید کے افسانوں کی ایک خوبی اختصار اور لفظوں کی کفایت ہے جو اُن کے اسلوب کو تہہ دار بناتی ہے۔'' (ص ۱۲)

اس افسانہ میں بھی یہی کیفیت ملتی ہے۔ باپ کی خود کلامی کے ذریعے اس افسانہ میں پوری کہانی کو بیان کر دیا گیا ہے جو شعور کی رو تکنیک میں آگے بڑھتی ہے، لیکن نہایت مختصر انداز میں اور لفظوں کی کفایت شعاری یہاں بھی ان کے اسلوب کو تہہ دار بناتی ہے۔ باپ اس افسانہ کا کلیدی کردار ہے جس کی بیوی مر چکی ہے، جو بیٹے اور بہو کے ساتھ رہتا ہے اور ان کا بیٹا یعنی (ایک چھوٹا بچہ) اس کا پوتا بھی ضمنی کردار کے طور پر افسانے میں کہانی کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ باپ اپنی بیوی کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد تنہا ہو گیا ہے، حالانکہ گھر میں بیٹا اور بہو بھی رہتے ہیں لیکن ان کی سرگرمیوں میں اسے اپنی بیتی ہوئی زندگی یاد آتی ہے۔ گزرے ہوئے وقت کے وہ کیف آگیں سارے لمحے یاد آنے لگتے ہیں جو اس نے کبھی اپنی بیوی کے ساتھ گزارے تھے۔ تنہائی کا احساس اور سوا ہو جاتا ہے۔ ان لمحوں کی سرگوشیاں کانوں میں شہد انڈیلنے لگتی ہیں تو کبھی بیٹا اور بہو کی سرگوشیوں میں مدغم ہو کر اس کے لیے سوہان روح بن جاتی ہے اور وہ ان بیتے لمحوں میں کھو جاتا ہے اور بے اختیار وہ پل یاد کرنے لگتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے افسانہ کا یہ ایک اقتباس جس سے کہانی کا پورا منظر نامہ سامنے آجاتا ہے:

> ''وقت کی دہلیز پر میرے قدم پڑنے لگے۔ میرا یہ ایک ہی تو بیٹا ہے جو اپنی ہر خوشی کی تکمیل میں سرگرداں رہتا ہے تو اچھا لگتا ہے۔ بہو بھی تو جیسے اس کے لیے بنائی گئی ہے۔ میرے جسم کی حرارت میرے اندر گردش کرتے ہوئے لہو کو ماضی کی طرف سرکا رہی ہے۔ کمرے میں ہنسی کی آواز، مدھم سرگوشی پھر خاموشی اور اندھیرا۔ میرا دھیان ذرا اِدھر اُدھر ہوا تو نگاہ خالی بستر پر پڑی۔ مر جانے کی تمھیں جلدی تھی۔ مر جاتیں...... میرے ساتھ مرتیں...... میرے بعد مرتیں، نہیں...... میرے بعد نہیں...... ورنہ شاید تم بھی...... میری طرف ٹھنڈی ٹھنڈی آگ میں جلتی رہتیں...... مگر میں تو بیٹے پر خفا ہوتا ہوں تو وہ سر جھکا کر سن لیتا ہے اور پھر بہو کے غصے کا نشانہ بھی بن جاتا ہے کہ ابا جان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کیوں کرتے ہیں آپ...... سرگوشیاں...... غائب بالکل غائب...... (ص ۸۰۔۷۹)

دراصل زیر نظر افسانہ نورالحسنین کے لفظوں میں ''دو نسلوں پر محیط ہے۔ باپ

اور بیٹا لیکن باپ اپنی عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا ہے جہاں صرف یادیں اور تصورات باقی ہیں۔ بیٹا اور بہو زندگی کی مسرتوں سے گزر رہے ہیں۔ باپ ان کی زندگی کا خاموش تماشائی ہے اور ان کی مسکراہٹوں میں اپنی مرحوم بیوی کو یاد کرتا ہے لیکن کہیں بھی مقابلہ آرائی نہیں ہے اور نہ ہی عامیانہ جذبات کا شکار ہوتا ہے۔ باپ کے کردار میں عارف خورشید نے ایک ایسا کردار تخلیق کیا ہے جو زندگی سے بھرپور بھی ہے اور وقت کے تقاضوں سے سمجھوتے کرنے کا اہل بھی ہے۔''

اصل میں باپ بیٹے کے درمیان تہذیب کی دیوار بدستور قائم رہتی ہے۔ دونوں اپنے رشتوں کے دائرے میں اپنی سرگرمیوں میں مصروف عمل ہیں، کہیں کوئی ٹکراؤ ہے اور نہ ہی کوئی کسی کے مدمقابل ہے۔ اسی لیے دونوں کے درمیان کوئی مکالمہ نہیں ہے بلکہ شعور کے رو کے بہاؤ میں وہ حال کے معمولاتِ زندگی میں اپنی ماضی کے معمولاتِ حیات کو یاد کرنے لگتا ہے جب اس کی شریک زندگی اس کی شریک سفر تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد اب وہ ان ساری کیفیات سرگوشیوں اور کیف و سرور کے ان لمحوں میں، بہو اور بیٹے میں دیکھنے لگتا ہے، محسوس کرنے لگتا ہے اور آخر میں جو صورتحال سامنے آتی ہے وہی افسانہ کا نقطۂ عروج اور کہانی کا اختتام ہے۔ شاید اسی سبب افسانہ کی تکنیکی خوبیوں کی تعریف کرتے ہوئے مجموعہ کے پیش لفظ میں محمود ہاشمی یوں رقمطراز ہیں:

''قضائے عمری، خودکلامی کے اسلوب میں لکھا ہوا عارف خورشید کا وہ افسانہ ہے جس میں زمانی اور مکانی کے تصورات ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے خودکلامی کے اس کرب اور اس اندوہ کی بازیافت کے عمل سے گزرتے ہیں جو افسانہ نگار کا اصل مقصد ہے۔'' (ص ۱۳)

عارف خورشید اپنے افسانوں میں بڑی خوبصورت زبان لکھتے ہیں اور کہیں کہیں بڑے فلسفیانہ جملے تحریر کرتے ہیں اور کئی اہم حقیقتوں کے انکشافات بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں جیسے یہ جملہ دیکھیے:

''مورخ شاید دنیا کا سب سے لاپروا انسان ہوتا ہے اسی لیے تو اہم شخصیات کے بارے میں لکھتے ہوئے احتیاط کا دامن جگہ جگہ ہاتھ سے

چھوٹتا نظر آتا ہے۔'' (ص۸۲)

اسی طرح کئی فلسفیانہ جملے بھی افسانے کے درمیان اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے میں یہاں رقم کرنے سے قاصر ہوں۔اس کے ساتھ ہی افسانے میں کہیں کہیں علامتوں کا استعمال بھی خوب ہوا ہے جو معنی خیز ہے اور محل نظر بھی۔موقعے کی مناسبت سے افسانہ میں گہری معنویت پیدا کرتا ہے مثلاً یہ کہنا کہ:

''گڈو کھیلتے کھیلتے سو گیا ہے۔چابی کا گھوڑا دوڑ رہا ہے۔جب تک چابی باقی رہے گی وہ دوڑتا رہے گا۔'' (ص۸۴)

افسانہ کا پلاٹ نہایت مربوط اور مبسوط ہے جو مرکزی کردار کے ذریعے رواں دواں انداز میں اپنے اختتام کو پہنچ کر مکمل ہوتا ہے اور متاثر کرتا ہے۔آخر میں باپ کا یہ احساس کہ:

اب مجھے جلدی سے غسل کر کے قضائے عمری پڑھ لینی چاہیے۔(ص۸۴)

پورے افسانے کی جان بن گیا ہے جو افسانے کا عنوان بھی ہے۔اس کا مرکزی خیال اور اس اچھوتے افسانے کا کلائمکس بھی ہے۔ باالفاظ دیگر باپ خود کلامی کی کیفیت میں اپنے سارے احساسات کو بیان کر کے آخر میں یہ محسوس کرتا ہے اور شدت احساس کی یہی کیفیت اس افسانے کا اصل مقصد اور کہانی کا نازک سا تھیم اور اس کا نقطۂ عروج ہے جو ایک دم اچانک آ کر نہ صرف قاری کو چونکا تا ہے بلکہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔یقیناً قارئین بھی اس خوبصورت افسانے کو پڑھ کر اس عجیب سی کیفیت کا احساس اپنے اندر پائیں گے۔امید ہے کہ عارف خورشید کا یہ افسانہ اردو فکشن کے معتبر ناقدین کی توجہ مبذول کروانے میں کامیاب رہے گا۔

☆☆☆

﴿افسانہ﴾

دل ہوا ہے چراغ

عارف خورشید

کمرے کا خالی پن احساس کی چنگاریوں کا درپن سناٹے میں کوئی چیز ہوتی ہے؟ سناٹے میں سناٹا ہوتا ہے! پھر میں کیا ڈھونڈ رہا ہوں۔ شاید لمس کی لذت کا وہ شائبہ جو میری روح میں رچ بس گیا ہے۔ شاید تمہاری چاہت جسے سمجھنے میں وقت لگا۔ شاید تمہارے غصہ کا وہ اپنا پن جس کا میں متلاشی تھا یا شاید.....تم.....تمہاری ہر ادا.....

....

ابھی جو آہٹ میں نے سنی وہ تمہاری تھی۔ میں دھوکا کیسے کھا سکتا ہوں؟ ایک ہوا کا جھونکا تھا۔ جس نے دروازہ کھولا اور اندازہ آ گیا۔ مجھے ویسی ہی راحت ملی جیسی تمہاری آمد سے ملتی تھی۔ یہ ہوا کا جھونکا ہے یا تم۔ کیا تم جنت کی ہوا ہو گئی ہو اور اپنی نیکی کی خوشبو بکھیر رہی ہو.....

....

بند آنکھوں سے کچھ نظر نہیں آتا۔ تم کیسے نظر آ رہی ہو۔ کیا تم آنکھوں سے دل میں اتر گئی ہو۔ مجھے تم چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی دکھائی دے رہی ہو۔

....

تم شام کو کھانے کے بعد باورچی خانے میں ہر چیز اس کی صحیح جگہ پر سلیقہ سے رکھ کر آتی تھیں۔ تمہارے آنے تک میں انتظار کرتا۔ بعض وقت تاخیر کی وجہ سے ناراض ہوتا تھا.....

....

عشاء پڑھ کر لیٹ گیا ہوں۔ تم ابھی تک کیوں نہیں آئیں۔ کب آؤ گی۔ تمہاری آواز آ رہی ہے۔ اجی، ابھی آئی۔ اجی یہ "ابھی" کتنی دیر کا ہے۔

اب تو فجر کی اذان ہو رہی ہے۔ کیا میری آنکھ لگ گئی تھی۔ تم نہانے گئی ہو۔ حمام سے پانی کے گرنے کی آواز آ رہی ہے۔ نہانا ہو جائے تو کہنا ورنہ کل کی طرح آج بھی فجر کی نماز.....

ابا جان ابھی نکلتا ہوں۔

....

جب میں فجر پڑھ کر داخل ہوتا تو قرآن شریف رحل پر رکھنے سے قبل ہی چائے ٹیبل پر رکھ دیتی تھیں۔ چائے ابھی تک نہیں آئی۔ ایک پارہ پڑھ چکا ہوں۔ چائے لاؤ بھئی.....چائے کب سے لا رہی ہو۔ ہائیں.......جلدی لاؤ.....

ابا جان آپ نے تو چائے پی لی۔ خالی کپ وہ رکھا ہے۔

....

اسکول سے کب آئے۔ جاؤ ڈریس اتارو، منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھاؤ،

دادی اماں کہاں گئی ہیں۔

تم سامنے بیٹھی ہو۔ بتاؤ میں کیا جواب دوں۔ ایک چیخ ہے جو میرے اندر دھنس کر رہ گئی ہے۔

....

وہ روز آنہ اسکول سے آنے کے بعد اپنے کمرے میں سلام کرنے آتے۔ بیٹھ کر پٹر پٹر باتیں کرتے۔ تم موڈ میں ہوتیں تو سنتیں کبھی ڈانٹ کر بھگا دیتیں۔ بعض وقت ہم دونوں کی تنہائی میں وہ مخل ہوتے تو تمھیں اچھا نہیں لگتا۔ تم تھیں تو تنہائی ہی ہوئی تھی۔ مجھ پر تھوڑا سا رحم کرتیں۔ اپنے حصے کی تنہائی ساتھ لے جاتیں۔ خالی پن کا یہ ہجوم سناٹا تو نہیں بن پاتا......

....

مجھے کس نے جگایا۔ کمرے کا دروازہ تو اندر سے بند ہے۔ موذن کی آواز پر آنکھ کھل گئی ہوگی۔ مگر، میں نے تمہارا لمس محسوس کیا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کبھی تمہاری آواز میری سماعت سے ٹکراتی ہے۔ کبھی لمس بن جاتی ہے اور احساس اپنی حدیں پا کر پوری شدت سے موجیں مارتا ہے......

....

تم بھیگ کیوں رہی ہو۔ بھیگو مت، طبیعت خراب ہو جائے گی۔ ارے اپنے آپ کو کم عمر سمجھ کر اچھل کود رہی ہو۔ اندر آجاؤ.....

ابا جان ابھی آئی۔

....

کبھی تم دکھائی دیتی ہو۔ بیٹی کی آواز آتی ہے، کبھی بیٹی دکھائی دیتی ہے اور آواز تمہاری آتی ہے۔

آتی ہو کہ میں وہاں آجاؤ۔ ابھی آیا.....

اُوہو۔ اُوہو۔ دادا جان بھی بھیگ رہے ہیں۔

....

بارش کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی۔ شادی کا تیسرا مہینہ اور تمہیں ڈر کہ کوئی دیکھ لے گا۔ وہ امی جان دیکھ رہی ہیں۔ ارے میری ماں اتنی تنگ نظر نہیں ہے۔ تم کیوں ڈر رہی ہو۔ کچھ نہیں کہیں گی۔ مگر تم کہاں ماننے والی ہو۔ تم بھاگ کر کمرے میں چلی گئیں اور میں اکیلا کھڑا ہوں۔
بالکل اکیلا........

....

پاکستان تم نے ساتھ چلنے کی ضد کی تھی۔ کیوں؟ میں تو اپنے بھائی سے ملنے جا رہا تھا۔ تم مجھے کتنا چاہتی تھیں۔ تم چاہتی تھیں میرے دل میں تمہارے علاوہ کوئی نہ ہو۔ یہ تمہاری بے پناہ محبت تھی! تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ اصل زندگی ترسٹھ سال کی ہوتی ہے۔

حضورؐ کی عمر ترسٹھ سال تھی۔ اس کے بعد تو آدمی نفعے میں جیتا ہے۔

میں اور کتنا نفعے میں جیوں، تمہارے بغیر یہ کیسا نفع ہے......

....

افطار کا وقت قریب آ گیا ہے۔ تم کہاں ہو؟ تم نماز کے لیے گل داونی باندھے سامنے سے آرہی ہو۔ کتنی اچھی ہو۔ آؤ، میرے قریب بیٹھ جاؤ۔ آؤ.....

اچھا ابا جان

....

میں کب سے کھڑکی میں کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تم سامنے سے آرہی ہو۔ حجاب سے

صرف تمہارا چشمہ نظر آرہا ہے۔تم کہاں چلی گئیں۔دروازے تک تو میں نے تمہیں آتے ہوئے دیکھا ہے......

....

تم تھیں تو گھر میں سہانا پن تھا۔ترتیب تھی سلیقہ تھا۔بے ترتیبی پڑی چیزیں بھی اچھی لگتی تھیں۔جیسے آسمان پر تارے۔جیسے دریا پہاڑ کہیں ہرا بھرا کہیں اجاڑ۔جیسے بستی کے کچے پکے مکانات۔جیسے موسم برسات میں بادلوں سے چھنتی دھوپ چھاؤں۔جیسے گاؤں کی کنواری بانس کا چھپر پکڑے کسی کا انتظار کررہی ہو۔تم میرا انتظار کررہی ہو.....

اب تو ہر چیز سلیقہ سے اس کی جگہ پر ہے۔اس کے باوجود یہ اداسی !اتنا تو کرسکتی تھیں۔میرے حصے کا سہانا پن چھوڑ جاتیں.....

....

شاپنگ جلدی جلدی کرنا۔بھاؤ تاؤ کرنا مجھے ایسا لگتا ہے جیسے روپیہ دو روپیہ کے لیے تم دکاندار کی خوشامد کررہی ہو۔تم خوددار عورت ہو۔مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تم کسی کی خوشامد کرو.....

داداجان آپ رک کیوں گئے ادھر کیا دیکھ رہے ہیں۔

....

شادی کے بعد سے دیکھ رہی ہوں۔ٹیلر تمھاری مرضی کے مطابق نہیں سیتا۔تمھارے مزاج میں جو باریکی ہے اس کو سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔آنکھیں کھول کر دیکھو میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں۔دیکھ تو رہا ہوں۔تم کہاں ہو۔آواز تو بہو کے کمرے سے آرہی ہے......

....

بڑھاپے کی وجہ سے تم چڑچڑے ہوگئے ہو۔بوڑھا صرف میں ہوا ہوں۔

ہنس رہی ہو بولو ۔بولو......

....

تم سامنے بیٹھی ہو۔سوچتا ہوں تمھارے پاس جاکر بیٹھ جاؤں۔

بہت مضمحل ہوگیا ہوں نا۔اس لیے یہ فاصلہ زیادہ محسوس ہورہا ہے۔اپنا کمرہ ایسا کتنا بڑا

ہے۔ بارہ بائے بارہ کا تو ہے۔ اس کو دو سے تقسیم کیا جائے۔ ہاں دو سے، ایک تم ایک میں دو ہوئے نا۔ تو تین، چھ حاصل ہوتا ہے۔ میں نے تمھاری قبر تین بائے چھ کی کھدوائی تھی۔ میرے لیے بھی تمھارے بازو اسی سائز کی قبر احتیاطاً بنوا لیتا ہوں۔ اگر بیٹا کہیں اور قبر کھدوادے گا تو فاصلہ بڑھ جائے گا، جو میں مر کر بھی نہیں چاہتا....

....

میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔ اپنی سوچ اور فکر کے ساتھ رہتا ہوں۔

میں نے اپنے تصورات کی دنیا سجا رکھی ہے۔ میں ان میں سے نہیں جو سب میں رہ کر اکیلے رہتے ہیں۔ میں ان میں سے ہوں جو اکیلے رہ کر بھی انجمن میں رہتے ہیں۔ تمھارے جانے کے بعد یہ فرق کیوں مٹ گیا ہے۔ میں سب میں رہ کر بھی اکیلا رہتا ہوں اور اکیلا رہ کر تو اکیلا ہی ہوں۔ تم بولتی کیوں نہیں ہو۔ بولو گی بھی کیسے تمھاری سادہ لوحی ان فلسفیانہ باتوں کو سمجھ نہیں سکتی۔ اب بھی خاموش ہو۔ تمھاری انا کو اس طرح ٹھیس پہنچتی تو تم شیرنی کی طرح بپھر جاتی تھیں.....

....

اپنے زمانے میں عاشق چراغ کی لو سے ہاتھ جلا لیا کرتے تھے۔ اب بلیڈ سے ہاتھ پر نام لکھتے ہیں اور نام کے حروف سے رستا خون ان کے اطمینان کا سبب بن جاتا ہے۔ میرے چراغ میں تیل کم رہ گیا ہے۔ میں اپنا ہاتھ تمھاری یاد کی لو سے جلا نہیں سکتا۔ اس لیے صبح تک اطمینان میسر نہیں آتا۔ یہ سلسلہ آخر کب تک چلتا رہے گا۔ اس میں تیل ڈال دو یا چراغ گل کر دو.......

....

میرے کمرے میں میرے ساتھ اور کون رہتا ہے۔ تم رہتی ہو۔

تم نہیں رہتیں میرا یقین ہے کہ تم ہی رہتی ہو۔ میں گمان اور یقین کے بیچ لٹک رہا ہوں۔

ابا جان اتنی گرمی ہو رہی ہے اور آپ پنکھے کو دیکھتے بیٹھتے ہیں چلاتے کیوں نہیں؟ لائٹ تو ہے!

بہو، میرے اندر اندھیرا ہے۔ باہر لائٹ ہونے سے دکھائی دیتا ہے۔ اندر اجالا ہونے سے سجھائی دیتا ہے۔ میرا دل تو اندھیاری گلیوں میں بھٹک رہا ہے.....

ابا جان آپ خاموش کیوں ہیں۔اچھا، بیٹھے رہنے میں بٹن دبا دیتی ہوں۔

....

تمھاری سوچ دوسری عورتوں سے مختلف تھی۔تم کسی کو بھی رائے دیتیں کہ بیوہ سے شادی کرنا بہتر ہے۔تم کہتیں کسی کی ماں مرجائے تو اس کی دنیا مرجاتی ہے اور باپ مرجائے تو صرف باپ مرتا ہے۔

تم کو بیٹیوں کا گھر میں رہنا پسند نہیں تھا۔تم کہتیں ٹھیک ہے حضور کو بیٹیاں پسند تھیں مگر وہ تمہاری طرح گھر میں بلا کر نہیں رکھتے تھے؟ جہاں کی چیز وہیں اچھی لگتی ہے۔کیا مجھے محبت نہیں۔میں تو ماں ہوں۔میری محبت تو اسی میں ہے کہ وہ اپنے شوہر کے پاس رہیں۔میں بھی میکہ جا کر رہنے لگتی تو۔ رہنا تھا میں نے منع کب کیا۔

اب کہہ رہے ہو جب کہنا تھا نا، جی۔

کب.....

اور میں خاموشی سے سوگیا۔تمھاری جیت مجھے اپنی جیت لگتی تھی۔اس اعتبار سے میں کبھی نہیں ہارا اور تمھاری جیت بھی تمہیں ہار لگتی تھی۔اس لیے ہمیشہ تمہاری ہو۔

مگر اب.....میں سچ مچ ہار گیا ہوں.....

....

اور میں خاموش سے سوگیا۔تمہاری جیت مجھے اپنی جیت لگتی تھی۔اس اعتبار سے میں کبھی نہیں ہارا اور تمھاری جیت بھی تمہیں ہار لگتی تھی۔اس لیے ہمیشہ تم ہاری ہو۔

مگر اب.......میں سچ مچ ہار گیا ہوں.......

دل کے دروازے پر کس نے دستک دی۔روح کے آئینے میں یہ کس کا عکس نظر آرہا ہے۔تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔تم سے امید تھی کہ تم واپس آؤ گی۔

میں اتنی شدت سے چیخ رہا ہوں۔بچے بازو کے کمرے میں ہیں۔آواز دیتے ہی آجاتے ہیں۔اتنی چیخ پکار بھی انھیں سنائی نہیں دے رہی ہے.....

....

تم رنگ و نور کا دریا تھیں۔تم خلوص و محبت کا سرچشمہ تھیں۔تم منظر میں پوشیدہ خوبصورتی کا راز تھیں۔تم فضا میں محفوظ خوشبو تھیں۔تم ناز و انداز کی شان تھیں۔تم خاندان میں ہر ایک کا بیان تھیں۔ یہی خوبیاں تھیں کہ میں خاموش بھی ہوں تو کبھی بہو، کبھی بیٹا، کبھی بیٹی، اور روز پوتا پاتی تمھارے بارے میں کوئی نہ کوئی بات کرتے ہیں......

....

میں نے بیٹے سے کہہ دیا ہے کہ میرے لیے اخباروں میں یا مسجدوں میں دعا کے لئے اپیل مت کرنا......

....

ہیلو، ہیلو۔ ابا جان کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ اجی کہاں ہیں آپ۔ فوراً گھر آیئے۔ سنئے ڈاکٹر کو لیتے آیئے۔ بہت تڑپ رہے ہیں۔ جلدی آیئے۔

کہاں تھے آپ اتنی دیر کر دی۔

ٹرافک کتنی ہے۔ تمہیں معلوم ہے۔ ہٹو یہاں سے۔ آیئے ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر دیکھ رہا ہے اور میں بازو کے کمرے سے مسلسل بیوی کی آواز سن رہا ہوں۔

ابا جان بڑبڑا رہے تھے۔ میں برابر سن نہیں سکی۔ بہت تڑپ رہے تھے۔ کبھی رو رہے تھے کبھی خوش ہو رہے تھے اور پھر خاموش ہو گئے۔

....

ہٹو یہاں سے ڈاکٹر کا دھکا لگے گا۔

روح کو نہیں لگتا۔ دھکا تو جسم کو لگتا ہے۔ اب تو تم بھی روح ہو۔ تمھارا جسم تو سامنے پڑا ہے۔

چلو چلتے ہیں۔

ابھی نہیں۔ تم کو قبر میں اتارنے اور سوال جواب کے بعد۔

کیا کیا ہوتا ہے میں سب بتاتی ہوں۔ تم نیک اور معصوم آدمی ہو۔ بڑی آسانی سے گزر جاؤ گے۔

ہم دونوں ساتھ رہیں گے۔

ہاں ہم دونوں ساتھ رہیں گے۔ بار بار کیا کہہ رہے ہو۔

بیٹی بہت رو رہی ہے۔اس کی شادی ہو جاتی تو اچھا تھا۔

فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔تمھارا بیٹا تمھارے جیسا ہے۔ڈاکٹر تمھاری نبض دیکھ رہا ہے۔

اس کو کہاں ملے گی۔

ہنسو مت وہ سن لے گا۔

اگر وہ روح ہوتا تو سن سکتا تھا وہ تو جسم ہے جس کے حواس محدود ہیں۔تمھیں مجھ کو زندگی میں دکھ بھی دینا چاہئے تھا۔یہاں نہیں دے سکو گے۔

ملتے ہی تم کیسی الٹی باتیں کر رہی ہو۔

یہ باتیں دنیا کے لیے الٹی ہیں۔ دنیا منفی اور مثبت پر چلتی ہے۔ یہاں مثبت ہی مثبت ہے۔چلو اچھا ہے تم کو جمعے میں ملانے کی تیاری ہو رہی ہے۔عید المومنین ہے۔

اور آج ہماری بھی عید ہوگی۔

☆☆☆

دل ہوا ہے چراغ۔تجزیہ

شاہ حسین نہری

تجربہ پسند ہمہ جہت فنکار عارف خورشید کے اس افسانے کا ماجرا محض ایک نکتہ ہے۔بات صرف اتنی ہے کہ ایک شخص کی بیوی کا انتقال ہوگیا ہے۔اب وہ اپنی بقیہ زندگی بیوی کے ساتھ بیتے ہوئے دنوں کی یاد اور اس کے تصور میں گزار رہا ہے، یہاں تک کہ وہ خود مر جاتا ہے۔مرنے کے بعد ''دوسری دنیا'' میں اس کی بیوی اس کا استقبال کرتی ہے اور یوں روحوں کی شکل میں پھر مل جاتے ہیں۔اس طرح میاں بیوی کی آپسی محبت اور تعلق خاطر کو اجاگر کیا گیا ہے۔ابتدائی حصے میں ایک جملہ ہے ''......کیا تم جنت کی ہوا ہو گئی ہو اور اپنی ......کی خوشبو بکھیر رہی ہو....'' اس جملے سے سرسری گزر جانے والے کو آخری حصہ آنے تک صاف طور پر پتہ نہیں چلتا کہ بیوی کی عدم موجودگی کا سبب کیا ہے۔وہ لڑ جھگڑ کر میکے جا کر رہ گئی ہے۔یا کہیں چلی گئی ہے اور پتہ نہیں چل رہا ہے کہ کہاں گئی ہے یا خلع لے کر رخصت ہوگئی ہے یا مر کر عدم آباد کو آباد کیا ہے۔

اس فسانہ میں عارف خورشید نے فنی برتاؤ کا ایک تجربہ کیا ہے؛ وہ یوں کہ گزشتہ زندگی کے مختلف مناظر کے تصورات کو حال کے واقعاتی حوالوں کو التباسی سطح پر منسلک دکھایا ہے۔

افسانہ ''دل ہوا ہے چراغ'' ایک فنطاسی (FANTACY) ہے۔''دل ہوا ہے چراغ'' اس فنطاسیہ افسانے کا بہت مناسب اور دل کش عنوان ہے کیونکہ سارا ماجرا ''دل'' یعنی جذبات کی روشنی میں اظہار کی صورت پکڑتا ہے۔اس فنطاسی کے مختلف پہلو ہیں۔

اولاً یہ کہ دل کے چراغ کی روشنی میں واقعات ہوتے دیکھنا امر واقعی سے زیادہ جذبات کی بنیاد پر تصوراتی جھمکڑے خلق کرنا ہے۔ثانیاً یہ کہ جو ہے اس کے بجائے وہ نظر آرہا ہے جو تصور میں ہے۔یہ طلسم بار بار ٹوٹتا ہوا دکھایا گیا ہے۔

ثالثاً یہ کہ زندگی کے مختلف مواقع اور زمانوں یعنی زندگی کے تسلسل کو محض چند نقطے ڈال کر بیان کے بغیر چھوڑ دیا گیا ہے۔یہ وقفے یا بار بار آنے والا یہ درمیانی خلا سامع یا قاری کو خود اس کے اپنے

تصور کی دنیا میں لے جاتا رہتا ہے۔ رابعاً یہ کہ ماجرا بظاہر واحد متکلم کی زبانی متشکل ہو رہا ہے لیکن جب کسی دوسرے کردار کی موجودگی کا احساس دلایا جاتا ہے، اس کی حرکات وسکنات سے یا پھر آواز کے ذریعے، تو غائب راوی کی موجودگی کا التباس ہوتا ہے۔

خامساً یہ کہ دیگر کرداروں کے اعمال پر واحد متکلم کو خود اپنا یا اپنی بیوی کا التباس ہوتا ہے۔ سادساً یہ کہ بنیادی کردار کی زبانی کہلوایا گیا ہے کہ وہ اپنی سوچ اور فکر کے ساتھ رہتا ہے، یعنی امر واقعہ کچھ بھی ہو اس کی سوچ اور فکر اسے جو کچھ دکھاتی ہے وہی گویا امر واقعہ ہو جاتا ہے۔

سابعاً یہ کہ واحد متکلم یعنی بنیادی کردار کو خود اس کی مری ہوئی بیوی اس سے گفتگو کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ثامناً یہ کہ بنیادی کردار کے مرنے کے بعد کے احوال کی منظر کشی اور بیان بھی ہے، اس طرح کی ''اس دنیا'' میں اس کی مری ہوئی بیوی اس کا استقبال کرتی دکھائی گئی ہے۔

اب دیگر بعض باتیں!

عارف خورشید کے زیادہ تر افسانے عورت اور مرد کے تعلق سے سروکار رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے بعض لوگوں کو ان کے افسانوں میں جنس (SEX) کی ''کثرت'' محسوس ہوتی ہے۔ معاشرتی زندگی میں مرد عورت ایک دوسرے کے لیے ''لباس'' ہونے کی بات کو چھوڑ کر بات مکمل کیسے کی جاسکتی ہے۔ تذکیر و تانیث (GENDER) کے علاوہ جنس (SEX) کا بھی کوئی نہ کوئی پہلو ذکر میں آ ہی جاتا ہے۔ اس افسانے میں بھی ایسے وقوعے آ گئے ہیں لیکن انداز بہت سنبھلا ہوا ہے۔

''دل ہوا ہے چراغ'' کا یہ عنوان حالانکہ استعاراتی ہے لیکن عارف خورشید نے اس افسانے کے لیے اپنے عام اسلوب اور انداز کے بجائے بالکل سادہ بات چیت کی زبان استعمال کی ہے، زبان و بیان میں خوش نمائی کی خصوصی کوشش نہیں ہے، حالانکہ ایک دو جگہ ذرا فلسفیانہ قسم کے جملے بھی در آئے ہیں۔

عارف خورشید کے بیانیے کا ایک پہلو، ان کے دیگر افسانوں کی طرح ''دل ہوا ہے چراغ'' میں بھی موجود ہے کہ وہ استفہامیہ و شرطیہ الفاظ اور ان کی علامتیں حذف کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے افسانوں کو پڑھنے پڑھانے کے بجائے یا پڑھنے پڑھانے کے ساتھ ساتھ سننے سنانے کی چیز بھی بنا دیتے ہیں۔

یہ ملفوظ اگر بنیادی کردار کی موت پر ختم ہو جاتا تو یہ ایک ''خبریہ'' یا ''خبرنامہ'' ہوتا حالانکہ خبروں کو بھی دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ فوت شدہ بیوی کے ''دوسری دنیا'' میں ایک اور بات اپنے شوہر کے استقبال کے بیان واحد متکلم کرنے پر اختتام ہوتا ہے اسے مکمل ''افسانہ'' بنا دیا ہے۔ یہ محض المیہ ہوتا۔ دوسری دنیا میں روحوں کے ملن نے اسے ظاہراً المیہ لیکن درحقیقت ایک ایسا طربیہ بنا دیا ہے جس پر الم انگیز فضا سایہ فگن ہے۔

بظاہر ایک پٹے ہوئے موضوع کے باوجود فنی برتاؤ کے وجہ سے عارف خورشید کا یہ افسانہ ''دل ہوا ہے چراغ'' ایک کامیاب اور اثر انگیز افسانہ ہے، جس میں زمانی احساس اور مکانی ابعاد کو گڈمڈ کر کے ایک دل کش فنطاسی کی تخلیق کی گئی ہے۔ یہ فنطاسیہ اس کے باوجود عملی زندگی کے چند مظاہرے کی تفسیر و تعبیر بھی ہے۔

☆☆☆

افسانہ

آکاش بیل

عارف خورشید

تمہارے گھر کے چبوترے پر جنازہ رکھا ہوا ہے۔ اندر صحن میں پانی گرم ہو رہا ہے۔ غسالہ کو لینے ابھی تک کوئی نہیں گیا۔ تمھارا بھائی قبرستان میں گورکن کو جگہ بتانے گیا ہوا ہے۔ والد اور چھوٹا بھائی کفن خریدنے گئے ہیں۔ سامنے کے چبوترے پر دری بچھی ہوئی ہے۔ اس پر محلے کے بوڑھے ٹوپیاں پہنے باتوں میں مصروف ہیں، میں بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

ایک بوڑھے نے کہا: ''خدا جانے آج کل کی لڑکیوں کو کیا ہو گیا ہے، ذرا سی بات پر خودسوزی کر لیتی ہیں۔ والدین نے کیا غلط کہا تھا کہ اپنے سسرال چلی جاؤ۔ نا ندتی بیٹی اور کماتا بیٹا ماں باپ کو اچھا لگتا ہے۔'' دوسرے بڑے میاں نے اظہار خیال کیا: ''سب ٹی وی کا اثر ہے۔ اپنے زمانے میں ٹی وی نہیں تھا اور نہ ایسی باتیں سننے کو ملتی تھیں۔ عورت اپنے مقام پر تھی۔ اب ذرا دیکھو! لونڈوں کا کیا حال ہو گیا ہے۔ عاشقیاں، چھیڑ چھاڑ، توبہ توبہ!''

میں کہنا چاہ رہا تھا کہ آپ کے زمانے میں تو اس سے زیادہ ہوتا تھا۔ ہمارے اجداد نے ایک پر اکتفا نہیں کیا۔ بیویوں کے علاوہ گھر میں ایک آنگن جھاڑنے والی ہوتی تھی، ایک اوپر کا کام کرنے والی، ایک پکانے والی اور سب کے بچوں کی شباہت ہمارے چچا جان سے ملتی تھی۔ آپ لوگوں نے یہ سب کہاں سے سیکھا تھا؟ بچے ٹی وی سے بگڑ رہے ہیں، کیا آپ کو جانوروں نے غلط راہ دکھائی تھی؟ آج کا نوجوان ایک جملہ کس دیتا ہے، ایک آدھ سے محبت کر کے شادی کر لیتا ہے تو آپ سے برداشت نہیں ہوتا۔

مگر موقع نہیں تھا اس لیے خاموش بیٹھا اپنے بزرگوں کی کم عقلی کا ماتم کرتا رہا۔ تمھارے جسم پر سفید چادر ہوگی۔ تم زمین پر سیدھی لٹا دی گئی ہوگی اور اطراف میں عورتیں کلام پاک کی تلاوت میں مصروف ہوں گی۔ تم بہت خاموش مزاج تھیں۔ کبھی کبھی ایک آدھ جملہ ایسا کہہ دیتیں کہ اس کا اثر مجھ پر کئی دنوں تک رہتا تھا۔

''اگر اتنا ہی شوق ہے تو کوٹھے پر جاؤ۔'' تمہارا یہ جملہ بجلی بن کر میری محبت کے نشیمن پر گرا تھا۔ میں نے تمھیں اپنی روح سے چاہا ہے، تمھارے جسم سے نہیں۔ محبت کرنے والوں کے درمیان جسم کی کیا اہمیت؟ تم تو اس جذبے سے بھی نا آشنا تھیں کہ دونوں ایک دوسرے کو دل سے چاہنے لگیں اور ان میں جسمانی تعلقات بھی پیدا ہو جائیں تو وہ عورت اس مرد کی منکوحہ ہو جاتی ہے۔ پتھروں کے زمانے میں یہی ہوتا ہوگا۔ عورت اپنی نفسانی خواہش کی تکمیل کے لیے جس مرد کو منتخب کر لے وہ اس کا شوہر ہو جاتا ہوگا۔ اگر وہ اس مرد کو چھوڑ کر دوسرے کے ساتھ...... تو اس مرد سے اس کا رشتہ خود بخود منقطع ہو جاتا ہوگا۔ اس حرکت کو ترقی یافتہ زمانے نے طلاق اور دوسری شادی کا نام دیا۔ اگر مرد دوسری عورت سے تعلقات پیدا کر لے تو وہ اس کی دوسری بیوی کہلاتی ہے۔

''تم میری پتھر کے زمانے کی منکوحہ ہو۔''

تمھارے رشتہ دار خالی جنازہ اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔ تم کو نہلا کر کفنا دیا گیا ہے۔

میں جانتا تھا کہ تم اپنے شوہر کو مجازی خدا کا مرتبہ نہیں دے سکیں۔ میں وجوہات بھی جانتا ہوں۔ تم اگر اسے قبول کر لیتیں تو وہاں سرد لاش اور یہاں دہکتا ہوا الاؤ نہ ہوتیں۔ نکاح کے بندھن میں تم زانیہ اور بغیر نکاح کے تم باوفا بیوی تھیں۔ ایسی صورت میں تمھارا خلع لینا ضروری تھا۔ میں نے کہا تھا اگر وہ طلاق کے لیے تیار نہیں ہے تو تم تجدید نکاح کر کے اپنے آپ کو ذہنی اور جسمانی طور پر تیار کر لو۔ آخر کب تک تاریکی میں خود کو تلاش کرتی رہو گی؟

تمھارا جنازہ باہر لایا جا رہا ہے۔ اندر سے عورتوں کے رونے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ جنازے پر تازہ پھولوں کی چادر ہے۔ رشتہ دار پھولوں کے مرجھانے سے پہلے تمھیں سپرد خاک کر دینا چاہتے ہیں۔ آج سے دس سال قبل تم سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ جب تمھارے دل سے میں نے اپنے نام کی دھڑکنیں سنیں تو تم سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں شادی شدہ ہوں۔ اس کے بعد تو تم میرے اور قریب آ گئی تھیں۔ پھر تم میری بیوی سے ملیں۔ تمھیں میری بیوی بھی اچھی لگنے لگی۔ تب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ تم میری ہو۔

مگر تمھاری شادی کے رقعے نے مجھے منجدھار میں اکیلا کر دیا۔

تمھارا جنازہ کاندھوں پر اٹھا لیا گیا ہے۔ میں بھی کاندھا دینے کے لیے آگے بڑھا اور لوگوں کے دھکوں

سے پیچھے ہٹ گیا۔ زندگی میں تمھیں سہارا دینے میں ناکام رہا اس لیے ہاتھ باندھے تمھارے جنازے کے پیچھے پیچھے چل رہا ہوں۔

شادی کے بعد جب تم سے ملاقات ہوئی تو تم بے اطمینانی کا مجسمہ تھیں۔ تم نے بتایا تھا کہ وہ شخص تمھارا شوہر بننے کے قابل نہیں۔ ذہنی ہم آہنگی ہو ہی نہیں پائے گی۔ وہ کم فہم، بدذوق، تنگ نظر اور بدمزاج ہے۔ اگرچہ دراز قد اور اچھا خاصا مرد ہے مگر خلوص و محبت کی گرمی اس کی بانہوں میں نہیں۔

میں تم سے ناراض تھا مگر تمھارے حالات سن کر مجھے ہمدردی ہوگئی تھی۔ میں نے پوچھا تھا: ’’تم نے شادی کیوں کی، کیا تم بنا ہوا مرد نہیں چاہتی تھیں؟‘‘ تم نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اب تم سماج کے ان کاندھوں پر ہو جنھوں نے تمھیں آگ کے حوالے کر دیا اور تم اپنی ضد کے ساتھ ستی ہوگئیں۔

میں کنوارا نہیں ہوں۔ کیا اس لیے تم بھی مجھے کنواری...... تم نے ساری پہنتے ہوئے جواب دیا تھا۔ ’’لذتوں کے پیام و سلام کا سلسلہ جسم کا مرہونِ منت نہیں۔ ذہن سے بھی اس کا تعلق نہیں۔ خوبصورتی سے بھی نہیں۔ مجھ سے خوبصورت تو تمھاری بیوی ہے۔ محبت صرف محبت ہے۔‘‘

گلی کے موڑ سے جنازہ اب سڑک پر آگیا ہے۔ راستہ چلتے کئی لوگ سروں پر دستیاں ڈال کر کاندھا دینے کے لیے بڑھ رہے ہیں۔ سامنے سے آتی موٹر گاڑیاں رک گئی ہیں۔

تمھاری شادی کے دو ماہ بعد تم اپنے شوہر سے الگ ہوگئی تھیں۔ وہ تمھیں مار ٹھوک کر قابو میں کرنا چاہتا تھا مگر محبت کی لگام تو میرے ہاتھ میں تھی۔

تم اکثر اس کی احمقانہ باتیں سناتیں اور ہم دونوں خوب ہنستے۔ تم نے بتایا تھا کہ تمھارے انکار کی وجہ سے اسے شک ہو گیا ہے۔ ہوگا کیسے نہیں۔ دو ماہ میں آٹھ مرتبہ وہ بھی زبردستی ہے...... اور اس کا ردعمل یہ ہوتا کہ وہ تمھیں رات رات بھر سزائیں دیتا۔ مگر تم، تم تھیں۔ اپنی ضد کی پکی اور تم صبح بہت خوش ہوتیں کہ تمھاری عصمت بچ گئی۔ تم خوف و ہراس کی راتیں کاٹتیں۔ دو ماہ کا یہ اذیت ناک دور گزر گیا۔ تم اپنے میکے لوٹ آئیں۔

یاد ہے۔ ہاں تمھاری ہر بات یاد ہے۔ یہ تم جواب دے رہی ہو یا میرے اندر سے کوئی بول رہا ہے۔ میرے اندر سے سوائے تمھارے کون بول سکتا ہے۔ اگر تمھارے شوہر کی جگہ میں ہوتا تو سب کچھ جانتے بوجھتے تمھیں اتنا چاہتا کہ تم اپنے آئیڈیل کو بھول جاتیں۔ مرد جھوٹی عورت کو برداشت نہیں

کرتا۔ عورت جھوٹی نہیں ہوتی۔ مرد عورت کو سیل بند ڈبہ سمجھتا ہے۔ بعض وقت تم ایسی باتیں کرتیں اور شرما کر لپٹ جاتیں اور بعض وقت اتنی عالمانہ باتیں کرتیں کہ سمجھنا مشکل ہوتا۔

میں نے تمھاری زندگی سے ان دو ماہ کے شب و روز نکال دیے تھے اور چاہتا تھا کہ تم خلع لے کر مجھ سے شادی کر لو۔ تم نے انکار کیا تو مجھے حیرت ہوئی تھی۔ تم نے مجھ پر عیاشی کا الزام بھی لگایا تھا۔ عیاش تو حاصل کر لینے کے بعد فرار ہو جاتا ہے، وہ محبت کا غم تھوڑی پالتا ہے۔

تمھارا پڑوسی جس کا پیام تمھارے والد نے ٹھکرا دیا تھا وہ اب تک کنوارا ہے اور جانے کس سوچ میں تمھارے جنازے کے ساتھ چل رہا ہے۔

میں اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تم سے پہلی بار...... دوسری بار...... تیسری بار...... اس مسلسل ناکامی نے جب ضمیر مردہ کر دیا تو چوتھی بار تم نے کہا تھا۔ ''آج پتہ چلا کہ تم بھی مجھ سے متاثر تھے۔''

جنازہ مسجد کے قریب پہنچ رہا ہے۔ لوگ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ چلے جائیں گے اور محلے کے کچھ لوگ مسجد کے سامنے خوش گپیوں میں مشغول ہو جائیں گے۔

اب جنازہ میرے کاندھے پر ہے۔ کاندھا دینے کے شوقین مجھے زیادہ دیر برداشت نہیں کریں گے۔ میں جنازے کے سامنے دائیں جانب سے کندھا دے چکا ہوں۔ ابھی تین کاندھے باقی ہیں۔ میں کاندھا دے کر ہٹا تو محسوس ہوا کہ تمھارے بہت قریب ہو گیا تھا۔ تم میرے کان میں کہہ رہی تھیں ''بڑے شہروں کی گہما گہمی اتنا وقت تو دے دیتی ہے کہ وقت خود اپنے ہر لمحے سے لطف اندوز ہو کر نہال ہو جاتا ہے۔''

میرا دوست جو تمھارا شریک کار بھی ہے، مسجد کے باہر رک گیا ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ وہ تمھارے متعلق ایسی ناشائستہ باتیں کرتا ہے کہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے سامنے کہے تو مانوں۔ میں وہ باتیں تمھارے سامنے دہرا سکتا تھا اور نہ کوئی ثبوت پیش کر سکتا تھا۔ اس بے اعتمادی کا کیا جواب دیتا۔ تم کو مجھ پر اتنا بھی بھروسا نہیں، یہ سوچ کر میں کئی دن تک تم سے خفا رہا اور تم خاموشی کی وجہ پوچھتی رہیں۔

اب میں دایاں کاندھا دیتے ہوئے مسجد میں داخل ہو رہا ہوں۔

ہاں تو سنو! وہ کہتا تھا کہ تم اس کی ہر ادا پر فدا ہو۔ اس کی شیدائی ہو۔ وہ کہتا تھا کہ تم اکیلی ملتی ہو تو خود سپردگی کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ وہ تمھارے تصور میں اپنی بیوی کے ساتھ...... میں نے تم کو آگاہ کیا تھا کہ محتاط ہو جاؤ۔ اچھا تو تم اپنے شریک کار کو اس لیے کچھ نہیں کہتی تھیں کہ وہ تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ وہ تمھارے افسر کا منہ چڑھا ہے تو کہیں تمھارا تبادلہ نہ کرادے۔ وہ تمھارا سی۔ آر (C.R.) نہ خراب کروادے۔ اپنی عزت وناموس کے عوض نوکری...... لاحول ولا قوۃ

تمہارا جنازہ مسجد کے صحن میں رکھ دیا گیا ہے۔ میں دو کاندھے دے چکا ہوں، اب وضو کر کے چار رکعت سنت پڑھ لیتا ہوں۔

خدا کی قسم اگر میں عورت ہوتا اور مجھے میرے جیسا چاہنے والا ملتا تو کسی غیر مرد کی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ میرے چہرے سے اپنی نگاہ کی پیاس بجھائے۔ مجھ سے بات کرتے وقت میرا جائزہ لے۔ میرا خیال رکھے۔ میرا انتظار کرے۔ مجھ سے بے وجہ ہنس ہنس کر بات کرے۔ مگر کیا کروں مرد ہوں نا۔

اگر میں تمھیں پورا نہیں ملا۔ تو کیا تم پوری ملیں؟ یہ پورا اور ادھورا کیا ہوتا ہے؟ میں اس وقت کوئی جواب نہیں دے سکا تھا۔ اب سنو۔ سن رہی ہونا۔ اب تو تم ہر بات سن رہی ہو۔ پہلے میں پورا کا پورا اپنی بیوی کا تھا۔ بعد میں تم نے آدھا چرا لیا۔ تم نے بھی تو یہی کیا ہے۔ ہم دونوں چور ہیں۔

اتنا بلند قہقہہ! آواز باہر جائے گی۔ لوگ کیا سمجھیں گے؟ باہر سے قفل ہے۔ جماعت کو صرف سات منٹ رہ گئے ہیں۔ اس وقت تو بے فکری کے تیز رفتار گھنٹوں کی آواز خالی کمرے میں گونجتی تھی۔ گھڑی کو بھی ہماری موجودگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے کہ اس وقت ہم وہاں تھوڑی ہوتے تھے ہم تو جنت میں ہوتے تھے۔ تمھارے شوہر نے جو اذیتیں دی ہیں، کیا خدا اسے جنت عطا کرے گا؟ کیا میری بیوی کی خاطر تم وہاں بھی دوزخ میں رہنا پسند کروگی؟

الله اکبر الله اکبر الله اکبر الله

قدقامت الصلوة قدقامت الصلوة

فرض پڑھ لیتا ہوں۔

روح ہمیشہ فرار کا راستہ تلاش کرتی رہتی ہے، جسم اس کے لیے مناسب جگہ نہیں ہے۔

سمع الله لمن حمده ربنا لك الحمد

دو بیماریاں ایسی ہیں جن سے انسان کو چھٹکارا نہیں۔ایک یادداشت دوسری تخیلات۔

السلام علیکم و رحمة الله السلام علیکم و رحمة الله

''حضرات نماز جنازہ کے لیے چلیے۔''

میں تو شراب بھی پیتا ہوں۔سگریٹ اور پان کا ذکر کیا۔تمھارا شوہر تو چھالیا بھی نہیں کھاتا۔ آفس سے سیدھے گھر آجاتا ہے۔اس کے محلے میں اسے کوئی نہیں جانتا۔یہ اس کا سماجی رتبہ ہے اور میں تو سہاگ رات کو بھی اپنے دوستوں سے چھٹکارا پانے میں ناکام رہا تھا۔

الله اکبر

مجھے معلوم ہے تمھارا شریک کار اپنے افسر کے ساتھ تمھارے گھر تمھاری ازدواجی زندگی کی الجھنوں کو سلجھانے کے بہانے آیا تھا۔

الله اکبر

ان کی ہمت نہیں ہوئی ورنہ وہ ایک ایک کرکے پان سگریٹ لانے جاتے تھے اور......

الله اکبر

اصل میں وہ یہ سوچ کر آئے تھے کہ تم اتنے دنوں سے پیاسی ہو اور تمھارے شریک کار کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ تم اپنے آپ کو اس کے حوالے......

الله اکبر

میں ہی تمھیں پوری طرح سمجھ سکا تھا۔تم ہر بار بڑی خوش خوش آتیں اور مطمئن ہو کر رنجیدہ ہو جاتی تھیں۔بعض وقت روتی تھیں۔

السلام علیکم و رحمة الله السلام علیکم و رحمة الله

لاحول ولاقوة

تمھارا جنازہ اٹھایا جارہا ہے۔

تم نے ایک غلط بات کی تھی کہ میں تمھیں دس برسوں سے پریشان کر رہا ہوں۔تم ہی بتاؤ کہ کس نے کس کو پریشان کر رکھا تھا اور اب تو تم ہمیشہ کے لیے مجھے پریشانی کے عالم میں چھوڑ کر جارہی ہو۔

تمھارا جنازہ مسجد کے احاطے میں واقع قبرستان کی طرف جا رہا ہے۔ وہ سامنے تمھارا شوہر کھڑا ہے۔ اسے تمھارے رشتہ داروں کی ہمدردیاں حاصل ہیں۔ اگر وہ کاندھا دے گا تو میں کاندھا نہیں دوں گا۔ ادھورا رہا ہوں اس لیے چار کاندھے کیوں پورے کروں۔

جنازہ دیدار کے لیے رکھ دیا گیا ہے۔ غیروں کی طرح مجھے بھی وہاں سے ہٹ جانا پڑا۔

پرسوں کی ملاقات میں تم نے بتایا تھا کہ تمھارے والدین، بھائی، بھاوجیں زبردستی کر رہی ہیں کہ تم سمجھوتہ کرلو اور اپنے سسرال چلی جاؤ۔ تم نے بہت دکھ بھرے لہجے میں کہا تھا کہ کماتی لڑکی بھی ماں باپ پر بوجھ ہوتی ہے۔

اب تمھیں قبر میں اتار دیا گیا ہے...... تمھیں نہیں مجھے...... لوگ مجھ پر مٹی ڈال کر چلے جائیں گے۔ میں خاموشی سے دفن ہو گیا ہوں۔ واپس جاتے لوگوں میں جو میں ہوں وہ میں نہیں کوئی اور ہے۔

☆☆☆

آکاش بیل تجزیہ

مظہر سلیم

عارف خورشید کا افسانہ ''آکاش بیل''، پامال موضوع پر لکھا ہوا ایک خوبصورت افسانہ ہے جو محبت کے روایتی تکون ہیرو، ہیروئن اور ویلن پر مشتمل ایک عشقیہ کہانی ہے جسے عارف خورشید نے تکنیک، اسلوب اور فنکاری سے ایک اہم اور یادگار افسانہ بنا دیا ہے۔ اس افسانے کو خود کلامی، فلش بیک اور کیمرے کی تکنیک کے سہارے بُنا گیا ہے۔ یہ تکنیک کوئی نئی نہیں ہے۔ کئی افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں اِس کا استعمال کیا ہے۔ خاص طور پر جدید افسانہ نگاروں نے تو اس تکنیک میں نت نئے تجربے کیے ہیں۔ سریندر پرکاش، جوگندر پال، اقبال مجید اور بلراج مین را سے لے کر نورالحسنین تک سبھی نے اس تکنیک میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں اور اپنے افسانوں کو فنی طور پر مالا مال کیا ہے۔

''آکاش بیل'' اس افسانے کا ہیرو، خودسوزی کرنے والی ہیروئن کے جنازے میں آیا ہوا ہے۔ جنازے میں اکٹھا لوگوں کے درمیان بیٹھ کر وہ ان کی گفتگو سن رہا ہے۔ شعور کی رو اس کے ماضی اور حال کو بیان کر رہی ہے وہ بیک وقت کئی جہات میں سوچے جا رہا ہے۔ کبھی وہ مرحومہ کو مخاطب کر کے اس سے اپنی محبت اور دلی جذبات کو ظاہر کرتا ہے تو کبھی وہ جنازے میں شریک لوگوں کی گفتگو سنتا ہے۔ خود کلامی کے ذریعے محبت، نفرت اور زندگی کے دیگر مسائل کو بیان کرتا ہے۔

افسانے کے ابتدائی جملے ملاحظہ ہوں:

> ''تمھارے گھر کے چبوترے پر جنازہ رکھا ہوا ہے۔ اندر صحن میں پانی گرم ہو رہا ہے۔ غسالہ کو لینے ابھی تک کوئی نہیں گیا۔ تمھارا بھائی قبرستان میں گورکن کو جگہ بتانے گیا ہوا ہے۔ والد اور چھوٹا بھائی کفن خریدنے گئے ہیں۔ سامنے چبوترے پر دری بچھی ہوئی ہے۔ اس پر محلے کے بوڑھے ٹوپیاں پہنے باتوں میں مصروف ہیں۔ میں بھی ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔''

اس افسانے میں خود کلامی کے ذریعے افسانہ نگار نے مسلم معاشرے کا ایک ایسا منظر و ماحول

پیش کیا ہے جو بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے، یعنی کسی کی موت، جنازہ، گورکن، قبرستان، میت میں آئے ہوئے لوگوں کا ہجوم اور جنازہ لے کر قبرستان تک جانے کا منظر۔

افسانہ نگار بار بار فلش بیک میں چلا جاتا ہے۔ تخیلات کی وادی میں کھو جاتا ہے۔ مرنے والی اس عورت سے اپنی محبت کی چند تصویریں دیکھتا ہے، وہاں آئے ہوئے لوگوں کی باتیں سنتا ہے جو اس کی موت پر اپنے دل کا غبار نکال رہے ہیں۔ چہ مگوئیاں، کانا پھوسی اور پر اسرار گفتگو! ملاحظہ ہو:

> ''ایک بوڑھے نے کہا، خدا جانے آج کل کی لڑکیوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ذرا سی بات پر خودسوزی کر لیتی ہیں۔ والدین نے کیا غلط کہا تھا کہ اپنے سسرال چلی جاؤ۔ نا ندتی بیٹی اور کماتا بیٹا، ماں باپ کو اچھا لگتا ہے۔ دوسرے بڑے میاں نے اظہار خیال کیا: سب ٹی وی کا اثر ہے۔ اپنے زمانے میں ٹی وی نہیں تھا اور نہ ایسی باتیں سننے کو ملتی تھیں۔ عورت اپنے مقام پر تھی۔ اب ذرا دیکھو! لونڈوں کا کیا حال ہو گیا ہے۔ عاشقیاں، چھیڑ چھاڑ، توبہ توبہ!''

یہ ایک بیانیہ افسانہ ہے۔ خود کلامی کے ذریعے افسانہ نگار نے زندگی کی کچھ جھلکیاں دکھائی ہیں۔ نشیب و فراز، پیار، محبت، نفرت، عداوت، جہیز کے مطالبات، چھیڑ خانی، نوک جھونک، خودکشی، خودسوزی، عشق و عاشقی، امتحان میں ناکامی، یہ سب ٹی وی کے زیر اثر ہیں اور یہ ہمارے سماج کے برہنہ اور سفاک سچ ہیں جنھیں افسانہ نگار نے ایک عاشق نامراد کی نظروں سے دیکھ کر قاری تک پہنچایا ہے۔ کیونکہ ہماری زندگی اور موت کا ذمے دار میڈیا ہی ہوتا ہے۔ ایسی ہی معمولی خبریں جو اخبارات میں چھپتی ہیں ٹی وی پر دکھائی جاتی ہیں وہ باآسانی افسانے کا عنوان بن جاتی ہیں۔ موضوعاتی افسانہ دراصل صحافت کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ اس نوع کے افسانے شام تک باسی بھی ہو جاتے ہیں۔ زیر نظر افسانے کا موضوع بھی ایک لڑکی کی خودسوزی ہے۔ ایک عام سا پلاٹ ہے۔ معمولی سا واقعہ ہے۔ چھوٹی سی خبر ہے۔ مگر عارف خورشید نے اس معمولی موضوع کو خود کلامی کی تکنیک سے غیر معمولی اور متاثر کن افسانہ بنا دیا ہے۔ افسانے کا ڈھانچہ تکنیک کے ستون پر ہی ٹکا ہوا ہے۔ اگر اسے تکنیک کے سہارے نہ لکھا جاتا تو شاید یہ روایتی طرز کا ایک بھونڈا قصہ بن جاتا۔ مگر افسانہ نگار نے بڑی سوجھ بوجھ اور پورے ہوش و حواس

سے اس میں زندگی کے وہ رنگ بھرے کہ یہ روایتی سے جدید یا ایک دم فریش افسانہ بن گیا ہے۔

انتظار حسین نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے ملاحظہ ہو:

''ادب میں مسئلہ کسی واقعہ کو جذباتی اثر انگیزی کے ساتھ بیان کر دینے کا نہیں ہوتا۔ یہ کام صحافت اور خطابت بھی بڑی خوبی سے انجام دیتی ہیں۔ ادب میں مسئلہ ایک تجربے کو اپنی تہوں اور گہرائیوں سمیت گرفت میں لانے کا ہوتا ہے۔ تجربہ لکھنے والے کی گرفت سے کبھی اس وجہ سے نکل جاتا ہے وہ اسے اپنی ذات کا حصہ نہیں بنا سکتا اور کبھی اس باعث گرفت سے نکل جاتا ہے کہ وہ اس تجربے سے اپنی ذات کو علیحدہ کر کے اسے نہیں دیکھ سکتا۔'' (علامتوں کا زوال۔ انتظار حسین)

یہ افسانہ بھی خالص موضوعاتی ہی ہے۔ مگر تکنیک اور خود کلامی کے اسلوب نے اور واحد متکلم یا راوی کے جادو نے اس پر صحافتی رنگ چڑھنے سے بچا لیا ہے۔ نہیں تو یہ بھی اخبار کی ایک سنسنی خیز خبر سے زیادہ تاثر نہیں دے پاتا۔ ادب اور صحافت کے درمیان ایک لکشمن ریکھا ہوتی ہے جو بہت ہی نازک ہوتی ہے۔ عارف خورشید اپنے آپ کو اور اپنے فن کو اس لکشمن ریکھا سے بچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انہوں نے ایک پامال و بوسیدہ موضوع کو نیا رنگ روپ دیا ہے۔ اپنے احساسات و جذبات کو تجربات کے حوالے سے بڑی گہرائی و گیرائی کے ساتھ اپنی ذات کا حصہ بنا دیا ہے۔ اس سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ ذاتی تجربہ و مشاہدہ ایک معمولی سے موضوع میں بھی جان ڈال دیتا ہے۔

افسانہ ''آکاش بیل'' دراصل شعور کی رو اور خود کلامی و واحد متکلم کا افسانہ ہے۔ شعور کی رو کی تکنیک میں کئی افسانہ نگاروں نے نہایت ہی اہم اور شاہ کار افسانے تخلیق کیے ہیں۔ خاص طور پر جدید افسانہ نگاروں میں سریندر پرکاش کا ''رونے کی آواز''، اقبال مجید کا ''ایک حلفیہ بیان''، جوگندر پال کا نادید، بیانات، بلراج مین را کا ''وہ''، سلام بن رزاق کا ''دودِ چراغ'' اور انور قمر کا ''مرگِ انبوہ'' وغیرہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

افسانہ نگار نے اِس افسانے میں کیمرہ تکنیک یعنی کلک کر کے منظر تبدیل کرنے کے گر کو بھی بخوبی استعمال کیا ہے۔ واقعات کو اس ترتیب سے رکھا گیا ہے کہ ہر واقعہ ایک مکمل تصویر دکھائی دیتا ہے

اور یکے بعد دیگرے واقعات منظر بنتے جاتے ہیں۔ اس افسانے میں جزئیات نگاری کو بھی بڑا دخل ہے۔ ملاحظہ ہو:

''تمھارا جنازہ باہر لایا جارہا ہے۔ اندر سے عورتوں کے رونے کی آوازیں آرہی ہیں۔ جنازے پر تازہ پھولوں کی چادر ہے۔ رشتے دار پھولوں کے مرجھانے سے پہلے تمھیں سپردخاک کردینا چاہتے ہیں۔''

اسی منظر سے جڑا دوسرا منظر دیکھیے:

''گلی کے موڑ سے جنازہ اب سڑک پر آگیا ہے۔ راستہ چلتے کئی لوگ سروں پر دستیاں ڈال کر کاندھا دینے کے لیے بڑھ رہے ہیں۔ سامنے سے آتی موٹر گاڑیاں رک گئی ہیں۔''

اس طرح کے منظر دکھانے کے بعد افسانہ نگار یعنی راوی بار بار فلش بیک میں چلا جاتا ہے اور مرحومہ سے اپنے عشق کی باتیں یاد کرتا ہے۔ اس کے ساتھ گزارے ہر لمحہ کو محسوس کرتا ہے۔ درمیان میں پھر واپس آجاتا ہے اور جنازہ کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا ہے۔ کبھی کندھا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ ملاحظہ کریں چند اور مناظر:

☆ ''جنازہ مسجد کے قریب پہنچ رہا ہے۔ لوگ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ چلے جائیں گے اور محلے کے کچھ لوگ مسجد کے سامنے خوش گپیوں میں مشغول ہوجائیں گے۔''

اور

☆ ''تمھارا جنازہ اٹھایا جارہا ہے۔''

اور

☆ تمھارا جنازہ مسجد کے احاطے میں واقع قبرستان کی طرف جارہا ہے۔

☆ ''جنازہ دیدار کے لیے رکھ دیا گیا ہے۔''

☆ ''اب تمھیں قبر میں اتارا جارہا ہے۔''

اس طرح افسانہ نگار نے مسلم معاشرہ میں ہونے والی کسی موت کا منظر، میت کو غسل دینے،

نماز جنازہ پڑھانے، قبرستان میں لے جانے اور قبر میں اتارنے تک ساری جزئیات بڑی خوبصورتی اور فنکاری کے ساتھ پیش کی ہے کہ لوگ جنازے میں شریک ہو کر اپنا سماجی و مذہبی فریضہ انجام دیتے ہیں اور مرنے والے کے بارے میں افسوس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ وہ قبرستان میں کھڑے ہو کر اپنے ذاتی مسائل پر بحث کرتے ہیں۔ تکرار کرتے ہیں۔ قہقہے لگاتے ہیں اور واپس لوٹ جاتے ہیں۔

''آکاش بیل'' اس افسانے میں کل تین کرداروں کی کہانیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور اپنی جزئیات کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں۔ ہیرو، ہیروئن اور ویلن سے منسلک ساری باتیں بیان ہوئی ہیں۔ ہیرو واحد متکلم میں سارا واقعہ بیان کر رہا ہے۔ وہ مرحومہ سے پیار کرتا ہے اسے دل و جان سے چاہتا ہے مگر اس لڑکی کی شادی کسی اور لڑکے سے ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر سے سمجھوتہ نہیں کر پاتی اور انجام کار ایک دن خودسوزی کر لیتی ہے۔ یہ افسانہ محبت کے اسی مثلث کو پیش کرتا ہے جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ اس میں حالات بھی ویلن کا کردار ادا کرتے ہیں۔ عارف خورشید نے ماضی کے واقعات کو ایک زنجیر میں اس طرح جوڑا ہے کہ انھیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک کڑی کو نکال دیا جائے تو بہت بڑا خلا پیدا ہو جائے گا۔ اس افسانے میں اسکرین پلے اور ایڈیٹنگ (Editing) تکنیک کا بھی بھرپور استعمال ہوا ہے۔ جیسے افسانہ نگار حال سے ماضی میں چلا جاتا ہے۔ پھر واپس آتا ہے اس درمیان وہ دو واقعے بیان کرتا ہے ایک حال کا اور ایک ماضی کا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے مربوط کرتا ہے۔

یہ جملے دیکھیے:

> ''تمھاری شادی کے دو ماہ بعد تم اپنے شوہر سے الگ ہو گئی تھی۔ وہ تمھیں مار ٹھوک کر قابو میں کرنا چاہتا تھا مگر محبت کی لگام تو میرے ہاتھ میں تھی۔''

افسانہ کے اختتام پر اپنی خود کلامی کے ذریعے افسانہ نگار نے ایک گہرا طنز کیا ہے۔ یہ اختتام افسانے کو نئی جہت اور نئی معنویت عطا کرتا ہے۔ چند جملوں میں اس نے اپنے پیار اور محبت، اپنی قربت اور اپنائیت کو اس طرح ظاہر کر دیا ہے کہ اِن جملوں سے محبت کی معراج کا پتہ چلتا ہے۔

ملاحظہ ہو:

> ''اب تمھیں قبرستان میں اتارا گیا ہے۔ تمھیں نہیں مجھے۔ لوگ مجھ پر مٹی ڈال کر چلے جائیں گے۔ میں خاموشی سے دفن ہو گیا ہوں۔ واپس جاتے

لوگوں میں جو میں ہوں وہ میں نہیں کوئی اور ہے۔''

''آکاش بیل''میں بیل زندگی کی تمثیل ہے۔ جسے ایک نہ ایک دن اپنی رعنائیوں کے ساتھ ختم ہونا ہے اور آکاش کی طرف لوٹ جانا ہے۔ یہی زندگی کی حقیقت ہے۔ آکاش بیل کی معنویت بھی یہ ظاہر کرتی ہے کہ ایسی بیل جو آکاش کی طرف بڑھتی ہے، اس کا رخ آسمان کی طرف ہوتا ہے۔ زندگی بھی اس بیل کی طرح پھلتی اور پھولتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے۔ آکاش بیل یہ افسانہ عارف خورشید کے یادگار افسانوں میں سے ایک ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے اس بات کا احساس شدید ہو جاتا ہے کہ عارف خورشید کے اندر ایک عظیم افسانہ نگار موجود ہے۔ وہ ہمہ جہت تخلیق کار ہیں۔ ادب کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ شاعری، خاکہ، تبصرہ، تنقید، افسانچہ نگاری اور افسانے نگاری وغیرہ۔ اگر وہ صرف صنفِ افسانہ پر پوری توجہ دیتے تو اردو زبان و ادب کو ایک اچھا اور عظیم افسانہ نگار مل جاتا۔

مگر ایسا ہو نہ سکا۔ کاش! ایسا ہو جاتا۔

☆☆☆

درد پھولوں کی طرح

ثلاثیاں

عارف خورشید

رات ساحل کو یاد آتا ہوں
لوٹ آتی ہیں تھک کے یادیں تو
صبح خود کو سمیٹ لاتا ہوں

روز سورج یہاں نکلتا ہے
پھر بھی خورشید کو خبر ہی نہیں
ایک عارف بھی ساتھ جلتا ہے

بوند بھر خون ہے روانی میں
جسم نے پیراہن نیا پہنا
اور کیا ہے نیا کہانی میں

اور کچھ بھی نہیں کہانی میں
میں ہوں ساحل پہ ہاتھ میں پتھر
دائرے بن رہے ہیں پانی میں

واپسی ہوگی کچھ تو لکھ کب تک
تو نہیں پھر بھی میری چادر میں
ہے ترے جسم کی مہک اب تک

پھر سے پھولوں کے وہ پیام آئے
لیکن اب کی بہار میں آخر
کیوں نہیں تم سے ہم بھی مل پائے

غزلیں

عارف خورشید

روشنی کی لکیر ہے شاید
یہ اندھیرا ضمیر ہے شاید

تجربے ڈھونڈتی ہے گلیوں میں
شاعری بھی فقیر ہے شاید

میں جو لوٹا حسد کی محفل سے
لوگ کہتے ہیں پیر ہے شاید

میری آواز میری منکر ہے
اور لہجہ نکیر ہے شاید

دل میں پیوست ہوگیا کیسا
اپنے عارف کا تیر ہے شاید

☆

یاد کس کی تھی جہاں سارا بجھا سا رہ گیا
روشنی دل میں ہوئی باہر اندھیرا رہ گیا

ہے عجب اک اضطرابی کیفیت سی رات دن
یوں تو ہوں اس کے بنا پھر کیوں میں اس کا رہ گیا

اب میری بینائی ہے وہ سانولی سی چاندنی
نقش سب دھندلا گئے بس ایک چہرہ رہ گیا

تب مجھے ترک تعلق پر ندامت کیوں نہ تھی
اب یہی دل میں کھٹکتا ایک کانٹا رہ گیا

مار ہی ڈالے ہے عارف انبساط زندگی
کچھ دکھوں کی یاد کے بل پر میں زندہ رہ گیا

افسانچے

عارف خورشید

دادا جان نے سڑک پار کرتی لڑکی کو دیکھ کر کہا: چوٹی لہرا رہی ہے
برقع اتنا تنگ کہ کولھوں کے ابھار صاف نظر آرہے ہیں۔
اس سے تو جذبات اور ابھرتے ہیں۔''
ہمارے تو ہاف نیکیڈ لڑکی دیکھ کر بھی......

☆

آپ ہر جنازے میں شریک ہوتے ہیں!
اس بہانے لوگوں سے ملاقاتیں ہو جاتی ہیں۔

☆

اپنے بیمار باپ کو ایک دواخانے سے دوسرے دواخانے کے چکر مارنے کے بعد
وہ نعش لے کر گھر لوٹا۔ اسے پتہ چلا کہ ڈاکٹرس کی ''جماعت'' گئی ہوئی ہے
اور کچھ ''اعتکاف'' میں بیٹھے ہیں۔

☆

رات میں جب تمہاری یاد آتی ہے تو میں موبائیل پر تمہیں دیکھ لیتا ہوں۔
میں بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرتی ہوں تو تم میرے ساتھ ہوتے ہو۔

☆

رمضان میں فساد ہوا۔ جماعت کے اراکین خوش ہو گئے۔
اس مقدس مہینہ میں انھیں دوسروں کی خدمت کا بھی موقع ملا۔
ایک گناہ گار خیال کی دستک پر میں چونکا
دستی دھونے والے کے ہاتھ خود بخود دھل جاتے ہیں۔

☆

آپ کو کس نے شاعر بنایا؟
انگلی کے اشارے سے دادا جان نے کہا: اس لڑکی نے......
اور آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔
کس لڑکی نے؟
اور پھر سے آنکھیں بند کر لی۔

☆

ہیلو، ہیلو، السلام علیکم
آپ آئے نہیں، آپ نے وعدہ کیا تھا۔
میں نے انشاءاللہ کہا تھا۔

☆

ایک لڑکی کی شکایت پر میں نے اُس لڑکے کو طلب کیا۔
دو تین چھڑیاں ماریں۔
اسٹاف روم میں بیٹھی معلمہ نے کہا: سر آپ کیوں مار رہے تھے۔
اپنے اسکول میں برسوں بعد ایک لڑکے نے کسی لڑکی کو چھیڑا ہے۔

☆

بہو آج چاند گہن ہے۔ تم کوئی کام مت کرنا۔
بس سیدھی لیٹی رہنا۔ ہم مانتے تو نہیں......
مگر، احتیاط کر لینے میں حرج کیا ہے۔
میرے دماغ میں گھنٹا بجا۔
ہم مانتے تو نہیں......
مگر، ماتھا ٹیک دینے میں ہرج کیا ہے۔

☆

پوپ کہانیاں۔تبصرہ

عارف خورشید

مصنف:مقصود الٰہی شیخ

قیمت:۱۸۰روپے

"GULBAN" 30-31 Hasan Gardan colony, Kanta Chihat, Lucknow-227105 سے حاصل کی جاسکتی ہے۔پیش لفظ علی سفیان آفاقی نے لکھا ہے۔

''مقصود الٰہی شیخ صاحب صرف ادب ذوق ہی نہیں بلکہ ادیب بھی ہیں۔ ان کی تحریریں رسائل وجرائد میں شائع ہوتی رہتی ہے لیکن انھوں نے اردو افسانے میں ایک نئی صنف کا اضافہ بھی کر دیا ہے۔ اس کو انھوں نے ''پوپ کہانی'' کا نام دیا ہے۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب منی کہانی موجود تھی تو اسی کو پوپ کہانی کا نام دے کر ''ایجادِ بندہ'' کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش بالکل حمایت علی شاعرؔ کی سی ہے۔ جو برسوں سے ثلاثی کے موجد کہلانے کی کوشش میں مبتلا ہیں اور آج تک وہ اپنے دعویٰ کی کوئی معقول دلیل پیش نہیں کر سکے۔ ولیؔ اورنگ آبادی کے دیوان میں ایک ثلاثی ہے۔حمایت علی شاعرؔ کا یہ دعویٰ بھی کھوکھلا ہے کہ انھوں نے تین مصرعوں کی وحدت قائم کی۔ اس لیے کہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے پاس تین مصرعوں کی وحدت مطلب تین مصرعوں میں ایک مکمل خیال موجود ہے۔حمایت علی شاعرؔ اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمی ہیں خدا جانے انھوں نے ایسا کیوں کیا؟

آگے آفاقی لکھتے ہیں:

''دراصل شیخ صاحب نے مشرق و مغرب کے امتزاج سے کہانی کی ایک نئی صنف ایجاد کی ہے۔''

آخر آ گئی نا ایجاد والی بات۔

خود مقصود الٰہی لکھتے ہیں:

''پوپ کہانی افسانہ، افسانچہ یا پارۂ لطیف سے جدا ہے۔ کچھ ہے تو اپنے گوناں گوں موضوعات (کی) اچانک آمد پر قلم بند کرنے کا نام ہے۔''

شیخ صاحب! ''اچانک آمد'' پر جو قلم بند کر لیا جاتا ہے اس کو ''فکر پارہ'' کہا جا سکتا ہے۔

پوپ کہانی نمبر ۱۱ ''جہنم کا ایندھن'' پانچ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جو منی کہانی کے زمرے میں بھی نہیں آسکتی۔ مقصود الٰہی شیخ کے ذہن میں خود پوپ کہانی کی ہیئت واضح نہیں ہے۔

کہانی نمبر ۱۲ ''جوڑ بے جوڑ'' چار صفحات پر ہے تو یہ کہانی ہوئی نا سیدھی سیدھی، یہ کہانیاں ہی ہیں اور جناب عالی ''اچانک آمد'' اتنی لمبی......؟ اور کہانیاں خود کہہ رہی ہیں کہ اس میں کرافٹ کتنا ہے۔ دیکھ بھال کر ایک منصوبے کے تحت لکھی ہوئی کہانیاں ہیں۔ ''اچانک آمد'' کے زمرے میں کیسے آسکتی ہیں۔

کہانی کی نثر کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں لکھنے سے کیا وہ ''پوپ کہانی'' ہو جاتی ہے؟ مقصود الٰہی کوئی بات طے نہیں کر پائے اور نہ اپنی ''ایجاد'' (بقول ان کے) کی واضح الفاظ میں تعریف کر پائے۔

ممتاز حسین نے ''پپو یار تنگ مت کر......'' کے عنوان سے جو بھی لکھا ہے اس پر بات کرنا تضیع اوقات ہے۔ صفیہ صدیقی کی کہانی ''کوہ نور'' مقصود الٰہی شیخ کا مزاحیہ قصیدہ ہے۔

سید ظفر ہاشمی نے ''یہ پوپ کہانی ہے'' میں لکھا ہے۔

''قارئین اس نوزائیدہ صنف پر اپنی رائے لکھیں کہ کیا اسے الگ صنف کا نام دیا جا سکتا ہے یا یہ مغربی سانچے میں ڈھلی منی کہانیاں ہی ہیں۔''

میں اس سے پورا پورا اتفاق کرتا ہوں۔ مغربی معاشرے کے مسائل سے متعلق یہ کہانیاں کہیں کہانیاں اور کہیں منی کہانیاں ہیں۔ صفیہ صدیقی کا دوسرا لطیفہ سماعت فرمایئے۔

''پوپ کہانی'' دل سے نکلی ہوئی آہ یا خوشی سے لگایا ہوا قہقہہ ہے۔''

اگر محترمہ سے افسانچے کے بارے میں پوچھا جائے تو کیا وہ کہیں گی: ''افسانچہ دل کو لگا جھٹکا

ہے اور قاری کو پھٹکا ہے۔'' اس تعریف کے بعد تو لوگ افسانچہ پڑھنا ہی چھوڑ دیں گے کہ انھیں ہارٹ اٹیک کا خطرہ لاحق ہو جائے گا اور کیا منی کہانی کی تعریف وہ یوں کرتیں: ''منی کہانی زندگی ہے اور اردو ادب کی بندگی ہے۔'' میری خواہش ہے کہ ان سے تمام اصنافِ ادب کی تعریف لکھوا لینی چاہیے تا کہ آئندہ نسلوں کے لیے اردو ادب کا بیش بہا سرمایا محفوظ ہو جائے۔

ڈاکٹر عمران مشتاق نے لکھا ہے:

''جاسوسی ادب کے تاجدار ابن صفی کے لائق ترین سپوت احمد صفی کہتے ہیں : پوپ کہانی کو اردو دنیا میں متعارف کرواتے ہوئے مقصود الٰہی شیخ کہتے ہیں کہ: یہ پڑھے پڑھائے بغیر پوپ کہانی کیا ہے؟ پوپ کہانیاں لکھی جانے لگی ہیں۔''

اس طرح کہنا تو بڑی جہالت ہے۔

آگے لکھا ہے: ''وہ اسے افسانہ یا افسانچہ نہیں سمجھتے۔'' وجہ؟ پھر کیا منی کہانی کو پوپ کہانی سمجھتے ہیں!

اور لکھتے ہیں:

''یہ زندگی کے ہر گوشے کو زیرِ قلم لانے میں معاون اور مددگار ہے۔ ہمارے اردگرد اور ہمارے اندر کی دنیا میں جو گزر رہا ہے اسے لطافت، نزاکت اور احساس طریقہ پر بے باکی سے ادا کرنے سے ایک پوپ کہانی وجود میں آتی ہے۔''

یہ بات کسی بھی صنف، بلکہ کسی بھی قسم کے فن، بلکہ فنونِ لطیفہ کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ مزید ہنسنا چاہتے ہیں آپ تو پوپ کہانی کی یہ تعریف مقصود الٰہی کی زبانی سنیے:

''یہ کیا ہے؟ میرے نزدیک یہ آزاد افسانہ ہے۔ آزاد افسانچہ ہے۔ آزاد شاعری ہے۔ قلب و سماعت پر سرعت سے اترنے والی صدا ہے، کبھی میٹھی، کبھی تلخ و ترش۔ کردار نگاری کی تفصیل، پلاٹ کی گھمن گھیریوں،

منظر نگاری سے ماورا یعنی کسی پابندی کی پابند نہیں ہے۔ بس ادائیگی میں
لوچ ہونا لازمی قرار دیا جائے گا۔ کسی لوک گیت کی طرح، کسی فارمیٹ کے
بغیر، دل کی بات کہنے کا آلہ وذریعہ۔ ٹپہ، رباعی، قطعہ، آزاد غزل۔ کبھی
مختصر کبھی کسی قدر طویل مگر افسانہ نہیں، ناول نہیں، ناولٹ یا افسانچہ نہیں۔
ماہیا مگر ہیر نہیں۔"

یہ پوپ کہانی کی تعریف ہے یا دیوانے کی بڑ ہے۔ مقصود الہٰی شیخ! کچھ گڑبڑ ہے۔ کہاں ہے؟ یہ معلوم کرنا آپ کا کام ہے۔ میری بات سے متفق ہوں تو ایک کتاب مجھے بھی بھجوائیے گا، ممنون رہوں گا۔

☆☆☆

رؤف صادق

عارف خورشید

شخص واحد ادیب بھی ہو اور مصور بھی تو اس کے خیالات فنی حدبندیاں پھلانگ کر ایک دوسرے پر منطبق ہو جاتے ہیں، بہ الفاظ دیگر ایک ہی طرح کی سائیکی سے فرار مشکل ہو جاتا ہے، مگر رؤف صادق ایسے ہمہ جہت فنکار ہیں کہ ان کا تخیل اپنے ذاتی اسلوب کے ساتھ ہر فن کے تقاضوں کا پاسدار نظر آتا ہے۔

غزلوں اور نظموں میں زندگی کے جمال اور جلال کی تصویریں ابھرتی ہیں۔ کلام میں پاکیزگی، اخلاص اور جذبات کی فراوانی کے ساتھ احساس کی نغمگی، مسائل کا حل تلاشتی لامتناہی کشمکش اور حاصل شدہ دنیا سے شکوہ شکایت کا حوصلہ قاری کو مضطرب کر دیتا ہے۔

زندگی سے ربط ضبط، تجربوں سے، مشاہدوں سے افہام و تفہیم اور نتائج سے پر خلوص رضامندی ان کا وتیرہ ہے۔

نثر بھی رواں اور شائستہ ہے۔ نقد بھی سوچی سمجھی جانچی پرکھی اور جانی بوجھی ہے۔ لفظ بھی تحریر کے زیور میں صحیح جگہ پر جڑے ہوتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں مصوری کا ذوق ہی دیگر فنوں میں آرائش جمال کا ضامن ہے۔ ان کے مصور کا ظاہر خاموش ہے مگر باطن میں مچلتی روحوں کی حیاتِ جاوداں اپنی تخلیقی توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

اپنے فن سے رؤف بھی اور اپنے آپ سے صادق بھی، اس طرح یہ رؤف صادق ہیں۔

خاکہ

آپ جیسا بھلا کہاں ہے کوئی

عارف خورشید

کسی کے بارے میں اپنے خیالات کے اظہار کی بھر پور صلاحیت ہو تو خاکہ ہوتا ہے۔ خاکے لکھے اس لیے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا صاحب خاکہ کی خوبیوں سے اپنی خامیوں کا موازنہ کرے۔ انسان میں اگر خالص خوبیاں ہوں تو وہ ہر سرحد پر ناکام ہو جائے گا۔

آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ڈاکٹر سید منیر الدین سحرؔ سعیدی اپنی تعین کردہ ہر سرحد پر کامیاب ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کون سی بات ان کی نظر میں خوبی اور آپ کے نزدیک خامی ہے۔

سحرؔ سعیدی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی آپ محسوس کریں گے کہ کسی پرانی فلم کا چھوٹا سا دیوان خانہ دیکھ رہے ہیں۔ مسند بچھی ہوئی۔ اس پر ایک لکڑی کا قلمدان رکھا ہے۔ جس پر کئی پن رکھے ہیں۔ پیڈ میں لگے کاغذ دھرے ہیں۔ اطراف گاؤ تکیہ رکھے ہیں۔ الماری میں مضراب، کمند ہوا، شعر خوشبوئے، شیخ چاند حیات و ادبی خدمات اور مضامین شیخ چاند سلیقہ سے جمی ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ یک لفظی، دوسرا دو لفظی، تیسرا سہ لفظی اور چوتھا جو زیر طبع ہے ''شعر میرا شوق انگیز'' چہار لفظی ہے۔ سلیقہ اور سحرؔ سعیدی کو کہیں بھی کبھی بھی الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ اخبارات تاریخ وار ایک پر ایک رکھے ہیں۔ اسی کے ساتھ ''ادبی تراشے'' کی جلدیں رکھی ہیں ساتھ ہی ماہ نامے رسالے اسی سلیقہ مندی کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ پڑھ لکھ کر تھک گئے تو کمر سیدھی کرنے کے لئے تخت معہ گدی تکیہ انتظار میں بچھا ہے۔ الماری کے ایک طرف پرانا ٹیپ ریکارڈر جوان کے بعد انٹیک پیس ہو جائے گا یا نانا جان کی نشانی کہلائے گا۔ اس کے باز و غزلیات برائے گانوں، کلاسیکی میوزک فلموں کے ساؤنڈ ٹریک کے Cassette ہیں۔

اس قدر صاف ستھرا کمرہ دیکھ کر خیال آتا ہے کہ گندہ ہو جانے کے خوف سے وہ بیوی کو بھی آنے کی اجازت نہیں دیتے ہوں گے۔ فجر سے عشاء تک معمولات ایسے ہیں کہ دوست احباب بھی ان کے گھر کم ہی جاتے ہیں اور اس عمر میں بھی موبائیل کبھی کبھی ہی اٹھاتے ہیں۔ ظاہر ہے جب کمرے میں

کوئی آتا جاتا نہ ہو تو بے جان چیزیں ہی ان کی یاد میں روئیں گی۔

روئیں گے کل جب ہماری یاد آئے گی سحؔر یہ در و دیوار پہ مسند کتب کاغذ قلم

سحؔر سعیدی کا قد پانچ فٹ پانچ انچ ہے۔ ناک طوطے کی مگر طوطا چشم نہیں۔ جس سے محبت کی ، دنیا بھر کے دکھ اٹھا کر اسی سے شادی کی۔ توجہ سے دیکھتی آنکھیں اور غور سے سنتے کان، چھوٹا سا مٹھائی لے کر کھاتا چوکڑے کے انتظار میں بچے کچے دانتوں پر اکتفا کریا منہ۔ ڈاڑھیں اوپر کی بائیں اور نیچے کی دائیں جانب کی گر جانے سے بیلنس فی الحال آوٹ ہے۔ انشاء اللہ چوکڑا بٹھانے کے بعد الائمنٹ ہو جائے گا۔ لب زیادہ کشادہ نہیں محتاط اتنے کہ کھل کر نہ کسی سے اختلاف نہ اتفاق کرتے ہیں۔ اپنی جتنی بساط ہے اس پر مہرے جماتے رہتے ہیں۔ دور دور تک پیشانی ہی پیشانی ہے۔ نگاہیں جب طویل سفر کے بعد تھک جاتی ہیں تو کہیں سر نظر آتا ہے۔ جی ہاں آپ صحیح سمجھے گردن کے قریب گدی پر ملائم بالوں کی جھالر جو ہوا کے جھونکوں سے کاندھے پر جھولتی رہتی ہے۔ ٹوپی اسی کپڑے کی جس کی شیروانی سلاتے ہیں۔ انھیں اطلاع نہیں آج کل اسی کپڑے کے سلیم شاہی جوتے بھی بنائے جا رہے ہیں ورنہ ڈریس کوڈ میں وہ بھی شامل ہو جاتے۔ جوانی میں جاذب نظر اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ کوئی بھی کام جوان کے سپرد کیا جائے سلیقہ سے اور دل لگا کر کرتے ہیں۔ مجموعی طور سے اپنے آپ سے اور دوسروں سے بھی ایماندار آدمی ہیں۔ میں نے جب بھی انھیں دیکھا مجھے لگا موصوف وضو کر کے آرہے ہیں۔ اللہ اکبر سنتے ہی آگے بڑھ کر صف میں شامل ہو جائیں گے۔ کراس سیکشن میں شادی کی اس لیے اپنی اہلیہ کے متعلق سوچتے ہیں کہ وہ پہلے مر جائے تو اچھا ہے۔ اس نے میرے لیے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ میرے بعد اس کا کیا ہوگا۔ میرا خاندان اس کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اسی لیے انھوں نے بھابھی کو ڈی ایڈ کروا کر سروس کروائی ہے۔ اب وہ بھی وظیفہ یاب ہیں۔ ان کو تین لڑکیاں ہیں۔ دنیا میں خسر کی بہو اور داماد کی ساس سے بنتی ہے۔ سحؔر سعیدی کے بیٹے کا بچپن میں انتقال نہیں ہوتا تو ان کی بہو سے تو بنتی ہی تھی۔ ان کے رکھ رکھاؤ کو لوگ تصنع کہتے ہیں میں ان کے تصنع کو رکھ رکھاؤ کا نام دیتا ہوں۔ قمیص، پاجامہ پر نمبر ڈلے ہوئے ہیں۔ قمیص نمبر ایک پاجامہ نمبر ایک کے ساتھ اس نمبر ایک شیروانی میں پہنتے ہیں۔ جوتوں کو بھی معلوم ہے کہ کونسی شیروانی کے ساتھ چلنا ہے۔ وہ بیچارے خود ڈبے سے چپ چاپ نکل کر ادب سے سامنے پڑے رہتے ہیں۔

اسکول کے زمانے میں سید منیر الدین تیل میں سر ڈال کر آتے تھے۔

چشمے رک کر نہیں رہ جاتے ہیں کہساروں میں

بقول شاہ حسین نہری بالوں کی اتنی زیادہ حفاظت نے انھیں گنجا کر دیا۔ان دونوں دوستوں میں حسب ذیل باتیں مشترک ہیں۔ دونوں شاعر ہیں۔ دونوں کی ایک لڑکی کا نام فریحہ ہے۔ دونوں فریحاؤں کے لڑکوں کا نام منیب ہے۔ دونوں صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں۔

سحؔر سعیدی کہتے ہیں ''میرا مزاج بچپن سے شاعرانہ ہے مجھ جیسا اردو کا ادنیٰ طالب علم جو الف ب ت سے ش تک پڑھا ہے۔ اس کو اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ ش سے شاعری ش سے شباب اور ش سے شراب شاعر ایک ش سے تو بچ سکتا ہے۔ دوسرے ش سے بچنا مشکل ہے اور پھر ایسے روایتی شاعر کا جو آج بھی زلف و کمر دوپٹہ و نظر کی شاعری کرتا ہے جب کہ علامہ اقباؔل نے ایسی شاعری نہیں کی مگر بہر حال وہ بھی شاعر تو تھے:

میں نے غزل میں اتنی توانائی صرف کی

میرا تعارف اب میری پہچان ہے غزل

سحؔر سعیدی روایتی غزل کے پاسدار ہیں۔ اس سبب ان کے کلام بلاغت نظام سے دوسری آوازیں سنائی دیتی ہیں، اس لیے کہ کلاسیکی شاعری کے موضوعات برتے ہوئے اور محدود ہیں، اس کا فریم چھوٹا ہے جیسے مصرع طرح پر آنے والی زیادہ تر غزلیں ہوتی ہیں۔ اس طرح روایتی غزل گو شعراء کی آوازیں ایک دوسرے میں مدغم بلکہ متصادم ہو جاتی ہیں۔ ایسا ہی سحر سعیدی کے ساتھ بھی ہوا اگر جدیدیت کے طرف مراجعت کرتے اور غزل کے ساتھ نظم رباعی، ثلاثی، اردو ہے سے بھی عشق فرماتے تو ان آوازوں سے چھٹکارہ پا سکتے تھے۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود فنکار اپنے زمانے سے متاثر ہوتا ہے۔ ان کے پاس ایسے اشعار بھی نکل آتے ہیں جس کی روایتی غزل گو شاعر سے توقع نہیں کی جا سکتی۔

''لگے ہیں چھاؤں کے دامن پہ دھوپ کے پیوند

زمین کو کون دریدہ لباس دے کے گیا''

مگر موصوف کو زندگی میں ایک ہی کے قائل ہیں۔ بیوی ایک نشاط، صنف سخن ایک غزل،

لباس ایک شیروانی، تحقیق ایک شیخ چاند، سواری ایک اسکوٹر، دشمن ایک اثر فاروقی مخلص دوست ایک سید ناظر علی۔

سحرؔ سعیدی کوئی بھی واقعہ، لطیفہ وغیرہ مکمل جزئیات کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر اور خود بھی مزے لے کر بار بار سیدھے ہاتھ کی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کو ملا کر چشمہ کی ناک درست کرتے ہوئے سنائیں گے یہ جانتے ہوئے کہ پہلی بار نہیں سنا رہے ہیں۔ کمال یہ نہیں ہے کہ کمال تو یہ ہے کہ کسی مرتبہ بھی نہ واقعہ کی ترتیب وتہذیب نہ لفظیات بدلتے ہیں بلکہ وقفہ اور وقفہ لازم بھی جوں کا توں رہتا ہے۔

آپ کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟ پوچھنے پر سحر سعیدی نے کہنا شروع کیا ''زمانۂ قدیم میں ماہ ربیع الآخر کو گیارویں کا مہینہ بھی کہا جاتا تھا۔ اس مہینے کی گیارہ تاریخ کو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جن کو عام طور پر غوث اعظم دستگیر کہتے ہیں۔ ان کی نیاز بہت اہتمام سے منائی جاتی تھی دوستوں اور عزیزوں کو نیاز کھانے پر مدعو کیا جاتا تھا ۱۹۵۸ء میں ربیع الآخر کی دس تاریخ کو والدہ نے مجھے قریب بلایا اور بڑی محبت سے کہا: آج تمہاری سالگرہ ہے شام میں میٹھا بھی پکائیں گے۔ میں نے پوچھا! میری پیدائش کس سنہ میں ہوئی تھی؟ کہنے لگیں سن تو یاد نہیں۔ صرف اتنا یاد ہے کہ گیارہویں کی دس تاریخ کو تم پیدا ہوئے تھے۔ میں نے کہا امی جان سن کے بغیر عمر کا حساب کیسے لگے گا۔ کچھ سوچ کر بولیں اس سال شیخ حبیب صاحب مدرس کی شادی ہوئی تھی۔ شیخ حبیب صاحب لوہ گاؤں میں نانا حضرت کے مکان کے مقابل کے مکان میں رہتے تھے۔ ملازمت ملی تو اورنگ آباد آ کر موہن ٹاکیز کے پیچھے آشٹی والی گلی میں رہنے لگے۔ میں دوسرے ہی دن ان کے مکان پر پہنچا۔ سلام کے فوراً بعد ان سے سوال کیا۔ آپ کی شادی کب ہوئی تھی؟ سنتے ہی انھوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور کہا تم کو میری شادی کی تاریخ سے کیا کرنا ہے۔ میں نے کہا میری پیدائش اسی سال ہوئی تھی۔ انھوں نے ڈائری نکالی اور اپنی شادی کی تاریخ فصلی میں لکھوادی۔ میں قاضی غلام احمد خان جو ڈنڈے باز قاضی کے نام سے مشہور تھے ان سے ۱۳۴۹ فصلی کا کیلنڈر مانگا۔ انھوں نے فوراً اپنے دفتر کے ایک بستے میں سے کیلنڈر نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ کیلنڈر میں مجھے عیسوی، فصلی اور ہجری تینوں سال کی تاریخیں متعلقہ دن کے ساتھ مل گئیں تو بڑی مسرت ہوئی۔ اس طرح کی چھوٹی سی تحقیق کے بعد میں نے اپنی تاریخ پیدائش اور دن دریافت کر کے انھیں ڈائری میں نوٹ کرلی۔ اسی دن سے مجھے ڈائری لکھنے کا شوق ہوا۔

سوال پوچھنے کی غلطی سے یہ تو پتہ چلا کہ بہت پہلے سے ایک محقق ان کے اندر سانس لے رہا تھا۔ مگر اب ہمت نہیں ہوئی کہ پوچھوں جناب آپ کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟ یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں۔

سحرؔ سعیدی لکیر کے آدمی ہے۔ لکیر مارتے ہیں اور اسی پر چلتے ہیں۔ وہ لکیر ان کی دانست میں سیدھی ہوتی ہے۔ مزاج مذہبی لوگوں کی طرح بے لچک ہے مگر ذہن مذہبی نہیں۔ میوزک کے دلدادہ پرانی فلموں کے عاشق، مینا کماری اور مدھو بالا کے طرفدار، لتا منگیشکر کے قائل، مدھو بالا کے ذکر پر رنجیدہ ہو جاتے ہیں اور اس کو زندگی میں محبت نہیں ملی پر افسوس کرتے ہیں۔ غلط رویۂ بے عملی، بدکرداری، بدمزاجی، ہٹ دھرمی کوئی برائی جیسے عورت میں ہوتی ہی نہیں۔ ساری برائیاں مرد ہی میں ہوتی ہیں۔ اور یہ سب مرد کرواتا ہے یا کرتا ہے۔ بیچاریاں معصوم ہوتی ہیں۔ ہر حال میں مورد الزام مرد ہی کو ٹھہراتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب بھی اہلیہ سے بحث ہوتی ہوگی تو اپنے آپ کو لعنت وملامت کرتے ہوں گے۔ زندگی میں دوسری عورت کے قائل نہیں۔ فنکار کی طرح سوچتے تو ایک سے زیادہ کے ہوتے اور مسلمان کی طرح سوچتے تو فائدے میں رہتے ایسا نہ ہو کہ اپنی ہی سوچ کے سبب حوروں سے محروم رہ جائیں اور وہاں بھی ایک کے ساتھ رہنا پڑے۔ میں تو حوروں میں گھرا رہوں گا۔

''صلے کا فیصلہ اعمال کی بنیاد پر ہوگا
اسی کی فصل کاٹے گا یہاں جو بیج بوئے گا''

سحرؔ سعیدی ہمیشہ اگر ساری زندگی کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا عورت کے طرفدار ہے۔ جب یونیورسٹی میں سروس پر تھے تو کئی لڑکیوں کے گھر جا کر شکایت کی کہ وہ عاشقی کر رہی ہے۔ بگڑ گئی ہے۔ کسی مرد کے گھر جا کر کبھی نہیں کہا کہ تیرا شوہر دوسری عورت کے چکر میں پڑا ہے۔ اسے بچا اور ہمیشہ سروس تعلیم وغیرہ کے لیے عورت کی ہی کی سفارش کی۔

''اک یہی تو ہے ان میں اچھائی
مجھ کو کہتے ہیں وہ برا سائیں''

سحرؔ سعیدی ذات کے سید ہیں مگر ایک مرتبہ جس سے ناراض ہو جاتے ہیں پھر اس کے تعلق سے ان کا دل زندگی بھر صاف نہیں ہوتا۔

ان کا دوست ادھر نور جہاں کے عشق میں گرفتار ہوگیا۔ ادھر شیر افگن کو اطلاع ملتے ہی اس نے خودکشی کرلی۔ حالانکہ اکبر کے دربار میں انارکلی کے علاوہ بہت سی کنیزیں ہر سال داخلہ لیتیں اور شہزادے سلیم اپنے باپ اکبر اعظم سے نظریں بچا کر زیادہ سے زیادہ، سے مستفید ہوتے یہ سلسلہ برسوں چلتا رہا۔ جب اکبر جلال میں آیا تو سلیم جلاوطن کر دیا گیا۔ جہاں سے اس نے بغاوت کی اور دوبارہ محل میں داخل ہوگیا۔

جب دوست کے ساس سسر کی آنکھوں سے سانچے موتی ٹپکے تبھی اس ہمدرد نے ٹھان لی تھی کہ وہ کچھ کرے گا۔ علم نفسیات سے دلچسپی اور تجربات سے اس نے سلیم کو کہیں بھی کامیاب نہیں ہونے دیا اور اس طرح کی منصوبہ سازی کی کہ وہ اپنے راستے پر آجائے۔ جب وہ راہ راست پر آگیا اور اس کی زندگی کی گاڑی اپنی صحیح رفتار سے چل نکلی تب اس ہمدرد کو احساس ہوا کہ شہزادہ خودغرض اور احسان فراموش ہے۔ چھوڑیئے بھی اس قصہ کو۔ ایک شعر سنئے:

”میں اس کی سب خطائیں درگذر کردوں یہ ممکن ہے
مگر جو زخم سینے پر لگے ہیں کون دھوئے گا“

سحؔر سعیدی کو نفسیات سے دلچسپی رہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مضمون کی حیثیت سے نفسیات پڑھنا اور تجربات کی روشنی میں نفسیات سے مسائل حل کرنا الگ ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے ایسے دوست کے پیچیدہ مسائل حل کئے جو خود کالج میں نفسیات پڑھاتا تھا۔

برہما نندن دیش پانڈے کے مکان پر پابندی سے عید ملن کا پروگرام ہوتا تھا۔ سحؔر سعیدی شیر خورمہ گھر سے بنا کر لاتے اور دیش پانڈے نمکین کا انتظام کرتے جو قومی یکجہتی کا بہترین نمونہ تھا اور آخر میں دوست محمد خان کی غزل گائیکی برداشت کرنا پڑتی تھی۔ سحؔر سعیدی اس سے بھی ناراض ہوگئے اور یہ سلسلہ بھی ختم ہوا۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کی صحبت میں کہانی کا مزا آتا ہے۔ ان کی صحبت میں خجستہ بنیاد کی نشانی کا مزا آتا ہے۔

”یاد ماضی کے اجالوں میں بہت دیر تلک
ڈوبا رہتا ہوں خیالوں میں بہت دیر تلک“

اپنے ماضی میں اس قدر جیتے ہیں کہ حال کب ماضی ہو اور میں اس میں جیوں کے انتظار میں

دعا کرتے رہتے ہیں۔

''یاد ماضی سکون ہے یارب
تیز کر اور حافظہ میرا''

شراب کبھی نہیں پی۔ کیوں نہیں پی؟ انٹرویو میں یہ سوال بھی کر لیتا تو اچھا تھا۔ حرام ہے اس لیے نہیں پی، تو موسیقی کب سے حلال ہوگئی۔ اس کا پتہ چل جاتا۔ شرابیوں سے سخت نفرت کے باوجود ان سے ملنا ان کی مجبوری رہی ہے۔ نان قلیہ کلب ۲۵ سال تک چلا اس کے خاتمہ کی وجہ شرابی بنے جو چور راستے سے کلب میں داخل ہو گئے تھے۔

میں نے بچپن سے اپنے آپ کو چھڑا کر جوانی کا دامن پکڑا ہی تھا کہ یہ گانا میرے کان پر پڑا۔ ''پان کھائے سیاں ہمار'' میں نے سوچا کہ پان تو بہت سے لوگ کھاتے ہیں اس میں اس کے سیاں کا کیا کمال ہے؟

سحرؔ سعیدی نے ۱۹۵۸ء سے پان کھانا شروع کیا۔ گلمنڈی میں امرت بھنڈار کے پاس پان والا تھا۔ جو انھیں مدراس کے نرم اور پیلے پان دیتا تھا۔ یہ ان کا مخصوص پان والا تھا۔ اس کے علاوہ اور کہیں سے وہ پان نہیں لیتے۔ موہن ٹاکیز کے پیچھے آشٹی والی گلی میں چونے کی دکان تھی اس سے چونا لیتے جو مٹی کی ہانڈی میں بناتا تھا۔ کتھا کانپور والا۔ اس میں جائے فل، زعفران کا پاؤڈر بنا کر تیار کیا جاتا تھا۔ روز آنہ آفس جانے سے قبل لال کپڑا (مدرا) بچھا کر اس پر سنگل پان چھ اوپر اور چھ نیچے کی قطار میں سجائے جاتے۔ ان کی ڈنٹھل اور نوک توڑ دی جاتی تھی۔ چونا کتھا لگا کر گلوریاں بنائی جاتیں اور ایک ڈبیہ میں رکھ لیتے۔ ساتھ ہی مخمل کا بٹوا ہوتا جس کے ایک خانے میں کتری چھالیہ، چکنی سپاری دوسرے میں، تیسرے میں لونگ الائچی اور چوتھے خانے میں زردے کی ڈبیہ رکھی جاتی تھی اور اس کا پھندہ جیب کے باہر لٹکتا چھوڑ دیا جاتا تھا۔

۲۰۰۰ء میں ڈاکٹر نے تمباکو منع کیا تو انھوں نے پان کھانا ہی چھوڑ دیا کہ بغیر زردے کا پان گناہ بے لذت ہے۔ ۴۲ سال مسلسل اس اہتمام سے پان کھاتے رہے۔ اب میری سمجھ میں آگیا۔ سیاں کے پان کھانے میں کیا کمال ہے۔

سحرؔ سعیدی نے شیخ چاند پر تحقیق کا زبردست کارنامہ انجام دیا۔ جس کا سہرا سید ناظر علی کے سر

بندھتا ہے۔انھوں نے ایک معمولی ۲ رانچ کالم پر چھپی تحریر سحر سعیدی کو دے کر تحریک دلائی کہ آپ میٹرک پاس ضرور ہیں مگر شاعر ہیں اور ایم اے اردو سے اچھی اردو جانتے ہیں۔آپ ڈائرکٹ ایم اے کر سکتے ہیں۔اس طرح موصوف ایم اے اردو ہوئے تو پی ایچ ڈی کی سوجھی اور نظر شیخ چاند پر ٹھہری۔

سید ناظر علی ان کے مخلص دوستوں کی فہرست میں سرفہرست ہیں۔کیوں؟ ''مضراب'' کی اشاعت کے لیے فنڈ کی ضرورت پڑی تو اجنتا میوزک سرکل نے ناندیڑ میں ''شب غزل'' کا پروگرام اس شرط پر منعقد کیا کہ لتا مہندر گے جو چکل تھانہ کی فیکٹری میں سروس کرتی تھی شامل ہوگی۔

اب درپیش مسئلہ یہ تھا کہ سروس کے بعد لتا ناندیڑ کیسے پہنچے گی۔ یہ مشکل کام ناظر علی نے انجام دیا۔وہ اپنی اسکوٹر پر لتا کو لے کر رات ۹ ربجے کلا مندر ہال ناندیڑ پہنچے۔اس وقت تک ہال بھر گیا تھا اور تاخیر ہونے میں خدشہ تھا کہ غزل کے چاہنے والے ہنگامہ نہ برپا کردیں۔لتا نے غزلیں گائیں اور پروگرام کامیاب ہوا۔اس کامیابی کا سہرا بھی ناظر علی کے سر جاتا ہے۔

سحر سعیدی اسی سال اپنی اہلیہ کے ہمراہ حج کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔اسلم مرزا اور شاہ حسین نہری کی کوشش ہے کہ وہ جس دوست سے ناراض ہیں اس سے صلح صفائی کرادی جائے۔ اتفاق سے اسے بھی اپنی اہلیہ کے ساتھ یہ سعادت نصیب ہو رہی ہے مگر یہ ہو نہ سکا اور اب یہ کہنا پڑا:

آدمی آپ بھی کمال کے ہیں

☆☆☆

زاویۂ نظر

(مشاہیر ادب کے تاثرات)

عارف خورشید ایک ہمہ دان فنکار

پروفیسر حمید سہروردی

عارف خورشید ہمہ دان فن کار ہیں ۔ انھوں نے شعر و ادب کی مختلف اصناف میں انفرادی فکروفن کا مظاہرہ کیا ہے ۔ ان کے یہاں تجربہ اور مشاہدہ اور فکر و خیال تحلیل ہو کر فن پارہ کی صورت گری کرتے ہیں ۔ وہ پیچیدہ فکر کو سیال بنا کر پیش کرتے ہیں ۔

عارف خورشید کے افسانے کی بڑی قوت ان کا اسلوب ہے ۔ وہ افسانوں کا خام مواد اپنے اردگرد کے ماحول سے اٹھاتے ہیں اور تخیل اور ذہنی پرواز کو اس کے مناسب حدود میں رکھتے ہیں ۔ 'جنس' ان کے افسانوں اور افسانچوں کا موضوعِ خاص ہے ۔ وہ اس موضوع کو خوبصورتی سے اپنی تحریروں میں ڈھال لیتے ہیں ۔

عارف خورشید ایک تجربہ پسند فن کار ہیں ۔ میں یہ کہنے میں عار نہیں محسوس کرتا کہ خاکہ نگاری کے میدان میں انھوں نے اپنی ایک الگ راہ نکالی ہے ۔ ان کا ہر خاکہ ایک نئے انداز اور نئے احساس کا زائیدہ ہے ۔ انھوں نے خاکہ نگاری میں ایک نمایاں اور معتبر مقام حاصل کیا ہے ۔ انھوں نے جن فن کاروں کے خاکے تحریر کیے ہیں ۔ ان کی خوبیوں اور خامیوں کو ان کی شخصیت اور ان کے فن کے حوالے سے سمجھا ہے اور سمجھانے کی بھرپور سعی کی ہے ۔

عارف خورشید، صاحبِ خاکہ یا موضوع کا الگ الگ فریموں میں فٹ کرتے ہیں ۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ کسی ایک فریم کا سہارا نہیں لیتے ، بلکہ خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ جب بھی خاکہ نگاری کا ذکر ہوگا یا تحقیقی وتنقیدی کام ہوگا ۔ عارف خورشید کے خاکے نہ صرف نمایاں رہیں گے بلکہ اپنا انفراد حاصل کریں گے ۔

☆☆☆

ذکر عارف خورشید کا

رفعت نواز

عارف خورشید دراز قلم اور فعال فنکار ہیں۔ دراز قلم ان معنوں میں کہ پچیس تیس سال کی مشقِ سخن کی معرفت ہی اپنی پندرہ مقبولہ کتابیں شائع کروا چکے ہیں۔ علاوہ ازیں تین کتابوں کے مرتب بھی ہیں۔ ان کتابوں میں بھی ان کے رشحات قلم شامل ہیں اور خوبی یہ ہے کہ وہ کسی ایک صنف سخن میں بند نہیں۔ شاعری، افسانہ، ناول، ناولٹ، خاکے، افسانچے غرض ہر صنفِ سخن میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور کامیاب رہے ہیں۔ فعال ان معنوں میں کہ انھوں نے نہ صرف اپنی تخلیقات کتابی شکل میں پیش کیں بلکہ اس کے دیگر فن کاروں کی تخلیقات بھی مرتب کرتے ہیں۔ اپنے اشاعتی ادارے (نوائے دکن پبلیکیشنز) سے شائع کر کے ان کی نکاسی کا معقول بندوبست کیا۔ اب عالمگیر ادب کے زیر عنوان ایک کتابی سلسلہ شروع کیا ہے۔ اسلم مرزا اور سحر سعیدی کے بارے میں کتابیں شائع ہو چکی اور اب ان کے (فن اور شخصیت) کے بارے میں کتاب زیر اشاعت ہے۔ علاوہ ازیں عارف خورشید ادبی رسائل کی شہر میں نکاسی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ عارف خورشید ہر کام منصوبہ بند طریقے سے اور سلیقے سے انجام دیتے ہیں۔

ان کی فعال شخصیت مجھ جیسے کوتاہ قلم کے لیے، باعث رشک ہے اور قابل تقلید ہے نئے لکھنے والوں کے لیے۔

☆☆☆

وقت کے چاک پر

● نئی فکر ہے.................................سید خالد محمود

افسانوں کے انداز بدکی کی یاد دلاتے ہیں اور ان سب پر بھاری کتاب کا کام وقت کا چاک بہت موزوں ہے۔ چاک پر کنٹرول کے ذرائع اللہ کے احکامات پر تو مسلم ہے اور ہمارا آپ کا ایمان بھی لیکن وقت کی گرفت میں چاک کا محترک ہونا یقیناً نئی فکر ہے۔

● سامری دسترس.................................سید شکیل دسنوی

عارف خورشید کے افسانے انھیں تغیر پذیر عوامل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ خاکہ نگاری کے فن پر بھی سامری دسترس رکھتے ہیں اور منظر کو پس منظر سے روشن کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی تصانیف ''وقت کے چاک پر'' ان کے اسلوب نگارش کا اچھا نقش قائم کرتی ہے اور نئے امکانات کا پانچواں در کھولتی ہے۔

● انوکھا تجربہ.................................ڈاکٹر محمد اقبال

اللہ پاک نے آپ کے قلم میں روشنائی کی جا کچھ اور ہی بھر دیا ہے۔ جیسے جیسے ورق الٹتا گیا کبھی لگا ''منٹو'' ہیں، کبھی ''عصمت'' ہیں کبھی ''بیدی'' اور کبھی کہیں ''علامہ نیاز'' جلوہ گر دکھائی دیے۔ ایک ساتھ لفظ بہ لفظ اتنے لوگوں کو محسوس کرنا اپنے آپ میں انوکھا تجربہ ہے۔ اللہ پاک آپ کا یہ اسٹائل قائم رکھے۔ آمین

● نشتر یا دودھاری خنجر.................................قاضی فراز احمد

آپ کے افسانچے سطری داستانیں ہیں۔ شروع کرنے کے بعد اختتام تک محسوس نہیں ہوا کہ کس دنیا میں گم ہو گیا تھا۔ بعض افسانچے زندگی اور روایات کو چھوتے ہیں۔ فاتحہ والا ''پھاتہا'' یقین مانیں ہماری یہاں روایتاً حقیقت گزشت ہے۔ نمازی، بری عادتیں، کتوں کی نسل، ٹینشن، بعض افسانچے نشتر ہیں یا دودھاری خنجر ہیں۔

● زندگی آموز بھی اور زندگی آمیز بھی.................................شہاب پیکر اعظمی

آپ کے افسانوں کا تاثر دیرپا ہے اس لیے کہ وہ افسانے زندگی آموز بھی ہیں۔ اور زندگی آمیز بھی۔ افسانوں کا پلاٹ اور تھیم مستحکم ہے۔ آپ کے نئے افسانے بھی جاندار ہیں کوزے میں سمندر قید کرنے

کے ہنر سے آپ واقف ہیں۔ مبارکباد آپ کے تبصراتی مضامین اور خاکہ نگاری نے حد درجہ متاثر کیا۔ خاکہ نگاری میں آپ کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ تبصروں اور خاکوں میں حق گوئی، بیباکی، صداقت اور طنز کی چبھن نیز تخیل کی جلوہ سامانیاں موجود ہیں الغرض آپ شعر و نثر کے عارف اور مطلع ادب کے درخشاں خورشید ہیں۔

● قلم کی جادوگری .... شرافت حسین

افسانہ ''شجر ممنوعہ'' پڑھ لیا پیکر تراشی اور جذبات و احساسات کو خوبصورتی کے ساتھ الفاظ کے جامے میں ڈھالنا۔ آپ کے قلم کی جادوگری ہے۔ آپ واقعات پر کم اور سوچ کینوس پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ یہی خاصیت افسانہ نگار کو بلندی عطا کرتی ہے۔

● کیا ہونا چاہیے .... ڈاکٹر شہناز صبیح

''وقت کے چاک پر'' ہدیۂ خلوص موصول ہوا۔ دلی شکریہ۔ بعد مطالعہ کوئی رائے قائم کروں گی۔ چند افسانے پڑھے ہیں۔ ویسے بھی ''گلوبل ولیج'' کے اس دور میں معیار زندگی کے ساتھ نظریات تیزی سے بدل رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی رفتار کتنی بھی تیز کیوں نہ ہو جائے، صالح اقدار کو باقی رکھنا انسان کا فرض اولین ہے ورنہ خواہشات تو غیر ذی عقل بھی پوری کر لیتے ہیں اور جذبات کے طوفان تو نفسانی خواہشات کو سیل رواں کی قوت عطا کرتے ہیں۔ قوت ممیزہ اور عقل سلیم کا کردار کسی بھی افسانہ میں اہم ترین ہونا چاہیے۔ کیا ہو رہا ہے یہ ہر طرف نظر آ رہا ہے کیا ہونا چاہیے اس کے لیے فکر کرنے کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت خیر و شر کے اصلی معنی و مفہوم سمجھنے کے بعد خود بخود پوری ہو جاتی ہے اُس کا راستہ سوائے "اِھدنا الصراط المستقیم" کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ ادب جذبات کو مشتعل کرنے کے بجائے جذبات کی تہذیب کرنے کا کام کرے تو اچھا ہے۔ یہ میرا ماننا ہے......اور عمل بھی۔

● وفاداری بشرط استواری .... شبیر آصف

آپ کا تحفۂ خلوص ''وقت کے چاک پر'' بدست سلیم شہزاد ہمدست ہوا۔ کس منہ سے شکر کیجیے۔ اس لطف خاص کا ویسے میں اسے سلیم سے لے کر پڑھ چکا ہوں اور اب جب کہ آپ نے اسے بطور خاص میرے لیے بھیجا تو بلا مبالغہ کہتا رہوں کہ دوسری بار پڑھنے سے میں خود کو روک نہیں پایا۔ میری رائے میں ایک تخلیق کی کامیابی کی یہی دلیل ہے کہ وہ قاری کو اپنے سحر میں باندھ لے اور اسے بار بار پڑھنے کو جی

چاہے۔ برسوں کی مشق و مزاولت اور اپنے قلم سے وفاداری بشرطِ استواری کے سبب آپ کی تحریر میں پختگی بھی آئی ہے اور جاذبیت بھی۔ آپ اپنے اسلوب میں سوچتے ہیں اور اپنے اسلوب میں لکھتے ہیں۔ اسی کو صاحب طرز کہتے ہیں:

یہ چیز وہ ہے جو دیکھی کہیں کہیں میں نے

● غیر رسمی اندازِ بیان..................................علقمہ شبلی

آپ کی نثری کاوشوں کا مجموعہ ''وقت کے چاک پر'' کئی روز قبل موصول ہوا۔ اس شبلی نوازی کے لیے ممنون کرم ہوں۔ اس سے پہلے ''رنگ امتزاج'' سے بھی محظوظ ہونے کا موقع ملا تھا۔ آپ کا غیر رسمی اندازِ بیان اور شگفتہ زبان قاری کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ افسانہ ہو یا خاکہ، ہر صنف میں آپ کا قلم نت نئے گل بوٹے اگاتا ہے اور وقت کے چاک پر وہ صورت گری کرتا ہے جو جاذب نظر بھی ہے اور دل ربا بھی۔

سوچ کے جزیرے

● سادگی کے ساتھ پرکاری..................................شہاب پیکر اعظمی

آپ کی خوبصورت غزلوں اور ثلاثیوں میں وسعت فکر ہے اور جمالیات کا عکس لرزاں بھی۔ آپ کی ثلاثیاں اور غزلیں سادگی کے ساتھ پرکاری سے مزین ہیں۔ میں حد درجہ محظوظ ہوا۔ آپ کی ثلاثیاں عروض اور فنی لوازمات سے آراستہ ہیں۔ یہ احترام عروض وفن آپ کو انفرادیت بخشتا ہے۔

سنہری رت کا فریب

● رویوں کا تنوع..................................خورشید عالم

''سنہری رت کا فریب'' میں احساس وفکر کی تازگی کے ساتھ ساتھ قارئین کو تخلیقی رویوں کے تنوع کا احساس بھی ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہانیاں داخلیت پسندی کی اس گھٹن، تکرار اور یکسانیت سے پاک ہیں جو جدید افسانے کا شناختی نشان بن گئی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اس مجموعہ میں شامل ساری کہانیاں فن اور تکنیک کے لحاظ سے مکمل اور معیاری ہیں۔ بلاشبہ کچھ کہانیاں اور ان کے بعض حصے خام

اور کمزور ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کا مجموعی تاثر تیکھا اور دیرپا نہیں ہوتا۔ لیکن ادبی سفر کی پہلی منزل میں کون سا ایسا فنکار ہے۔ جس کا فن کوتائیوں سے یکسر پاک ہو۔ اس لحاظ سے یہ بات وثوق کہی جا سکتی ہے کہ یہ کہانیاں آپ کے تابناک مستقبل کا اشاریہ ہیں۔

دھول کی شال

● لب ولہجہ جرأت آمیز .... بلراج کومل

آپ کی شاعری کا مرکز مرد اور عورت کا بنیادی رشتہ ہے۔ آپ نے اس رشتے کی جزئیات پر عورت کے زاویۂ نگاہ سے بھی ردعمل کا اظہار کیا ہے اور مرد کے زاویۂ نگاہ سے بھی۔ میں چونکہ شاعری کو ناگزیر طور پر ''پیمبری'' کے مترادف نہیں سمجھتا۔ اِس لیے صرف اُس کی جمالیاتی کردار کی داد دے سکتا ہوں۔ آپ اپنی شاعری کے آئینے میں جیتے جاگتے انسان کے طور پر تو ابھرتے ہیں لیکن مصلح قوم یا اخلاقیات کے مبلغ کے طور پر نہیں۔ آپ کا لب ولہجہ جرأت آمیز اور غیر روایتی رویوں کا آئینہ دار ہے۔ آپ گوشت پوست کے جیتے جاگتے مرد اور عورت کا ذکر کرتے ہیں اور خلوص اور اظہار کے نوکیلے پن سے ان کی ذہنی اور جذباتی تصویر کشی کرتے ہیں۔

☆☆☆

کلام شاعر بخطِ شاعر

ملاقاتیں

میں تیرے خوابوں میں کھو گیا ہوں گا

میرے گھر کا بلب روشن ہے

اور وہ شخص سو گیا ہوگا

اب کہاں جا کے کھو گئے ہیں لوگ

ہم کو دیتے لپٹی ہیں یادیں کبھی

کیسے کنجوس ہو گئے ہیں لوگ

کیا بتائیں تمھیں کہ کیسے تھے

ریزہ ریزہ بکھر گئے ورنہ

ہم بھی اک دن چٹان جیسے تھے

دھنک رنگ سوچ

(پچھلے شمارے کے بارے میں تاثرات)

● سردار سلیم .... حیدر آباد

میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب ''عالمگیر ادب'' کا ''سحر سعیدی نمبر'' ہمدست ہوا۔ یہ آپ نے عظیم الشان اچیومنٹ ہے۔ یہ نمبر نکال کر آپ نے اردو ماں کے ایک لائق سپوت کا حق ادا کر دیا ہے۔

● ڈاکٹر قطب سرشار .... محبوب نگر (آندھرا پردیش)

سحر سعیدی ذہین ہی نہیں بلکہ عقیل اور مخلص ترین خوش اخلاق انسان بھی ہیں۔ ان کا مقالہ جو انھوں نے شیخ چاند کے مضامین اکٹھا کر کے لکھا ہے۔ وہ اردو کے تحقیقی سرمائے میں ایک وقیع اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ عالمگیر ادب کے سحر سعیدی نمبر کی اشاعت کے لیے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ عارف خورشید صاحب اب ہمیں آپ کے خاص نمبر کا انتظار ہے تاکہ اس عالمگیر ادب کے عارف خورشید نمبر کے وسیلے سے آپ سے بھرپور ملاقات ہو جائے گی۔

● فاروق احمد .... کانپور

آپ کا ارسال کردہ یہ دوسرا خوبصورت تحفہ ''سحر سعیدی فن اور شخصیت'' موصول ہوا۔ میں نے آپ کو فون پر ہی ''زندہ باد پائندہ باد'' کہہ چکا ہوں۔ ہندوستان اور پاکستان سے بے شمار رسائل اور کتابیں شاعروں اور ادیبوں کے گوشے اور خاص نمبروں کے زیر عنوان نکلتے رہتے ہیں مگر ان میں کہیں نہ کہیں کاروباری عنصر ضرور شامل رہتا ہے۔ ان میں چند ہی ایسی کوشش ہوتی ہے جسے ''حق بہ حقدار رسید'' کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ ''عالمگیر ادب'' ان ہی بے لوث مجلوں میں سے ایک ہے۔ ''عالمگیر ادب'' کا یہ دوسرا شمارہ بھی ایسا ہے کہ جس میں دوستی، وفاداری اور اخلاص کے ساتھ ساتھ کروفر بھی موجود ہے۔ مکرمی سحر سعیدی ایسے ہی ادیب و شاعر ہیں جن کی ادبی کاوشوں کو منظر عام پر آنا چاہیے تھا اور یہ کار خیر آپ لوگوں نے جس احسن طریقہ سے انجام دیا ہے وہ دیگر شہروں میں کم کم نظر آتا ہے۔ شاید اورنگ آباد کی مٹی میں ہی وفا شعاری اور احباء پروری کا جوہر ہے۔ دعا بھی کیجئے کہ آپ حضرات کے دیدار کے وسیلہ سے کبھی اورنگ آباد خجستہ بنیاد کی اس مٹی کو آنکھوں سے لگا سکوں، جس کی خوشبو سے فارسی اور اردو ادب مہر مہر مہک رہا ہے۔

● ڈاکٹر محمد ابوالکلام .... ناگپور

عالمگیر ادب کا کتابی سلسلہ نمبر ۲، بنام ڈاکٹر سید منیر الدین سحر سعیدی ملا یاد آوری کا شکریہ۔ عالمگیر ادب کے ذریعے ان کی ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ پیش کر کے ملک و بیرون ملک کے حلقہائے ادب میں

متعارف کرانے کا جو کارنمایاں آپ نے انجام دیا ہے قابل صد ستائش ہے۔ جس کے لیے میں آپ اور عالمگیر ادب کے اراکین کو صد بار مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ گر قبول افتدز ہے عزوشرف۔ ایسی شخصیات کا تعارف کرانا میرے نزدیک کسی کار خیر سے کم نہیں جو تمام تر صلاحیتوں کے باوجود اپنی کسر نفسی کی وجہ سے وہ مقام حاصل نہیں کر پاتے جس کے وہ مستحق ہیں۔

● ڈاکٹر محمود شیخ .... جبلپور

یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اورنگ آباد (دکن) کی ادبی سرگرمیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ڈاکٹر سحر سعیدی نے شیخ چاند (مرحوم) کی حیات وخدمات پر مقالہ پیش کر کے ادبی دنیا میں اپنا کلام روشن کیا ہے۔ حسب سابق اس دوسرے شمارے کی ترتیب وتزئین بھی عمدہ ہے۔ مضامین کے انتخاب میں آپ کی حسن نظر کا قائل ہوں۔

● راشد جمال فاروقی .... دہرادون

ڈاکٹر سحر سعیدی کے بارے میں میری معلومات انتہائی ناقص درجہ کی تھی آپ کا شکر گذار ہوں کہ ایک بھرپور ادیب، باکردار انسان اور عظیم خادم اردو کو میں حسب توفیق کچھ جان سکا۔ لیکن اس بات کا قائل ہوئے دیر نہیں لگی کہ آپ معیار برقرار رکھنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔

● شمیم جوہر .... جالنہ

مدیر ہو تو عارف خورشید جیسا، دوست ہو تو عارف خورشید جیسا، اداریہ کا ایک ایک لفظ گویا ادبیت، شائستگی اور بے شمار جذبہ خلوص ومحبت کا آئینہ دار ہے۔ ایک جملہ "خیال میں آیا کہ اب عالمگیر ادب کے اراکین سات رہ گئے ہیں" اپنے اندر سمندروں گہرا درد سموئے ہوئے ہے۔ اس کتاب کے صفحہ آخر (کورپیج) کی تصویر میں میری نگاہ میں میرے محسن وکرم فرما شفیق ومہرباں قاضی رئیس صاحب کو تلاشتے ہوئے آب دیدہ ہوگئیں۔ عالمگیر ادب کا یہ رکن اب ایک دوسرے عالم کا رکن بن گیا ہے۔ اللہ غریق رحمت کرے۔

● وصیل خان .... بمبئی

گذشتہ دنوں دفتر پہنچا تو عالمگیر ادب کا دوسرا شمارہ میز پر رکھا تھا۔ سرسری نظر ڈالی تو فرحت وانبساط کی ایک لہرسی دوڑ گئی۔ شمارہ واقعتاً انتہائی جاذب اور معیاری لگا اور منفرد۔ اس معنی میں کہ ملک بھر سے شائع ہونے والے دیگر ادبی جرائد سے الگ راہ اس نے اختیار کر رکھی ہے۔ مدیر عارف خورشید نے کسی ایک فنکار کے فن وشخصیت پر بھرپور مواد فراہم کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے۔ وہ خوش آئند اس معنی میں ہے

کہ وہ فنکاران ادب جو اپنی فنی وعلمی خدمات کے باوجود مختلف وجوہات یامدیران کرام وناقدین ادب کی چشم پوشی کے سبب عام قارئین تک نہیں پہنچ سکے۔عالمگیرادب نے برائے متوازن انداز میں شائقین علم وادب تک ان کے رسائی کو ممکن بنادیا۔

مجموعی طور پر ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ عارف خورشید نے اس خوبصورت اور منفرد سلسلے کے آغاز سے ادبی کارواں کی رگوں میں ایک نیا جوش وخروش بھر دیا ہے۔ترتیب وپیشکش کے لحاظ سے بھی جریدہ اپنی انفرادیت قائم کیے ہوئے ہے اورادارتی حسن کا نمونہ بنا ہوا ہے۔

● رفیق شاہین ....علی گڑھ

عالمگیرادب نے بحیثیت نقش اول اسلم مرزا نمبر میں مجلّاتی صحافت کا جو بلندوبالا معیار قائم کیا تھا وہ نقش ثانی میں بھی برقرار نظر آتا ہے۔زیرنظر کتاب نمبر۲ بھی ادب کی تاریخ میں ایک یادگار اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

● پروفیسرڈاکٹرمعین الدین عقیل ....کراچی پاکستان

محترم ڈاکٹرسحرسعیدی صاحب۔السلام علیکم۔کتابی سلسلہ۲ ''عالمگیرادب'' موصول ہوا جو آپ کی شخصیت اورفن کے مطالعے پر مشتمل ہے۔آپ کو قبل ازیں آپ کی تحقیقات کے وسیلے سے جانا تھا اب آپ کی شخصیت،شاعری،آپ کی ادبی خدمات اورسماجی حیثیت یہ سب اب سامنے ہیں اورایک قدرے بھرپور تعارف،مع رنگین تصویروں کے پیش نظر ہے،کافی دیرا ن میں کھویا رہنا لازمی تھا،سو یہی ہوا۔ان سب نے اس دنیا میں پہنچادیا جو اگرچہ آپ کی اورآپ کے دوست احباب اوراعزا کی دنیا ہے لیکن اس سے میرا بھی رشتہ ہے اور جو دیرینہ اورقریبی بھی ہے،یہ سب آپ کے اورعزیزم عارف خورشید صاحب کے ذریعے میسرآیا۔سب ہی کا ممنون رہوں گا۔عارف خورشید صاحب نے کمال کیا اورآپ کے تعلق سے ایک دل کش وپرکشش ہی نہیں مفید ومعلوماتی رسالہ مرتب کردیا جو اب ایک دستاویزی حیثیت کا بن گیا ہے اور یادگار رہے گا۔اس سے آپ کی شخصیت کے کئی اور گوشے بھی اجاگر ہوئے۔یہی کہ آپ نے طویل ومختصر عمدہ مقالات بھی لکھے ہیں،بمثل ''اورنگ آباد کے مشاعرے'' جو نہایت مفید اورخاصے معلوماتی ہیں اور اپنے موضوع پر ایک ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے موضوعاتی اخباری تراشوں کو بھی مرتب کیا ہے،جن کوان کے موضوعات اوران کی اہمیت وافادیت کی

وجہ سے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا ہے۔ اب یہ کس طرح میسر آئیں گے؟

عالمگیر ادب کے حلقے نے یہ بہت عمدہ سلسلہ شروع کیا ہے، جس کے تحت اسلم مرزا صاحب پر مرتبہ مجموعہ بھی خاصے کا کام تھا۔ اس سلسلے کو جاری رہنا چاہیے اور بزرگوں و گوشہ نشینوں کو ترجیح دی جانی چاہیے۔

امید ہے اب مع احباب و متعلقین خیریت سے ہوں گے اور مزید مفید منصوبوں میں منہمک ہوں گے۔ سب کی خدمت میں میرا سلام اور میری جانب سے نیک خواہشات پہنچا دیجئے واحباب کے ساتھ

والسلام۔

● زبیر رضوی .... دہلی

جناب عارف خورشید صاحب۔ 'عالمگیر ادب' کا تازہ شمارہ جو ڈاکٹر سحرؔ سعیدی کے فن اور شخصیات کے لیے مخصوص ہے، مل گیا تھا۔ شکریہ۔ مقامی طور پر یا آس پاس کی آبادیوں میں جو حضرات سنجیدگی سے ادبی مسائل اور امور کے سلسلے میں سرگرم ہیں یا رہے ہیں ان پر ایسے گوشے نکالنا واجب ہے۔ آپ نے پہلے جناب اسلم مرزا اور اب سحرؔ سعیدی صاحب کا واجب قرض اسی خصوصی شمارے کی صورت ادا کر دیا۔ ''الساس'' والے عارف خورشید ملیں تو کہیے میں یاد کر رہا تھا۔ امید آپ بہ عافیت ہوں گے۔

● پروفیسر احمد سجاد .... جھارکھنڈ

محبی عارف خورشید صاحب! سلام ورحمت۔ عالمگیر ادب، کتاب سلسلہ ۲ ''ڈاکٹر سحر سعیدی۔ فن اور شخصیت'' کے مختلف مضامین کو حسب موقع خوب مزے لے لے کر پڑھتے وقت آپ کی ادب نوازی کے ساتھ آپ کی جگر کاوی کا بھی قائل ہوتا جا رہا ہوں۔

''عالمگیری'' کے اس دور میں ''اسلم مرزا صاحب کے بعد'' ضدی محقق'' اور شاعر بے بدل کے بعد سحرؔ سعیدی صاحب کو بھی آپ نے جس عالمی معیار و وقار کے ساتھ پیش کیا ہے اس نے اس وقیع کتابی سلسلے کو بیشک اسم بامسمی بنا دیا ہے۔ پوری توقع ہے کہ اگلا شمارہ کتابی سلسلہ ۳ ''عارف خورشید'' کے بعد ۴ رغالباً ''شاہ حسین نہری'' کے فن اور شخصیت کا شمارہ بھی اسی طرح تاریخ ساز ہوگا۔ یہ شعر سحرؔ سعیدی صاحب کے علاوہ آپ کے بھی حسب حال ہے:

دل میں ارماں منفرد ہیں ، سر میں سودا منفرد
سوچتے تو سب ہیں لیکن میں نے سوچا منفرد

☆☆☆

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے
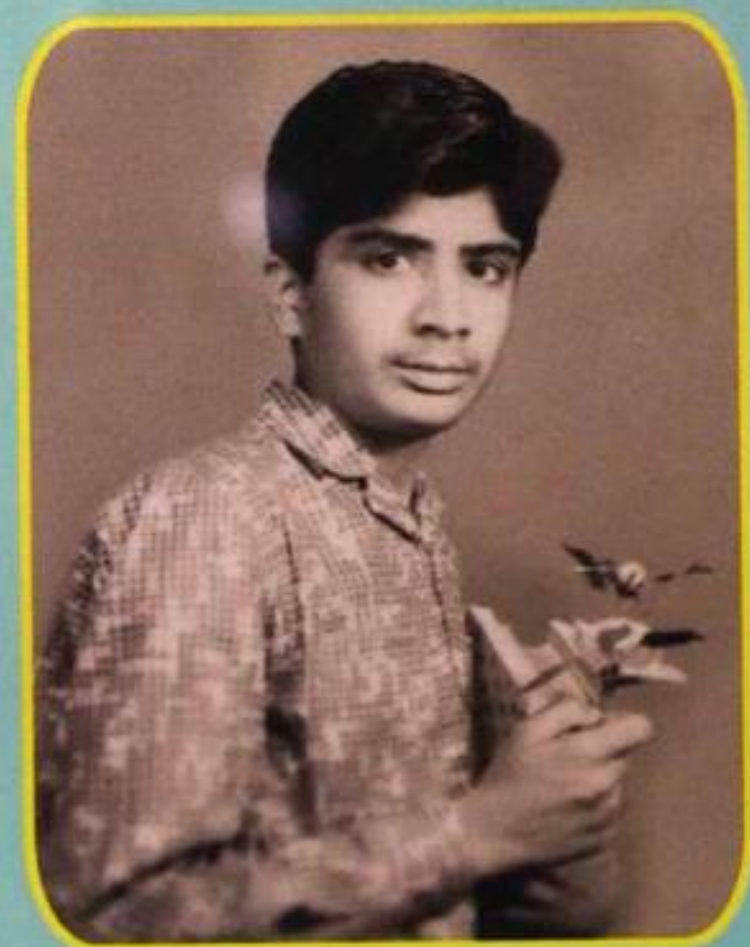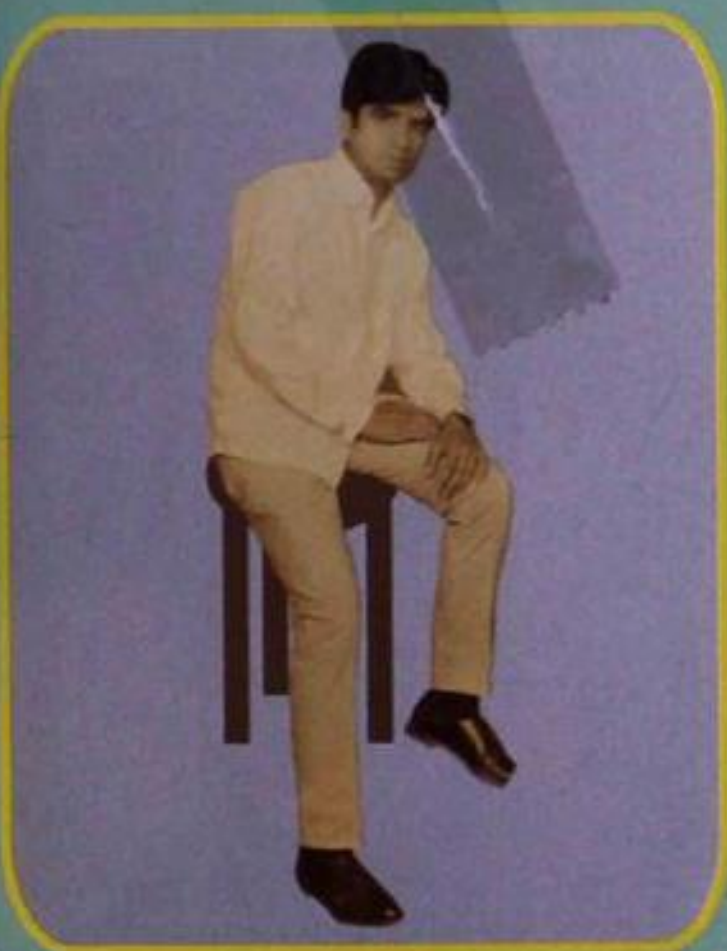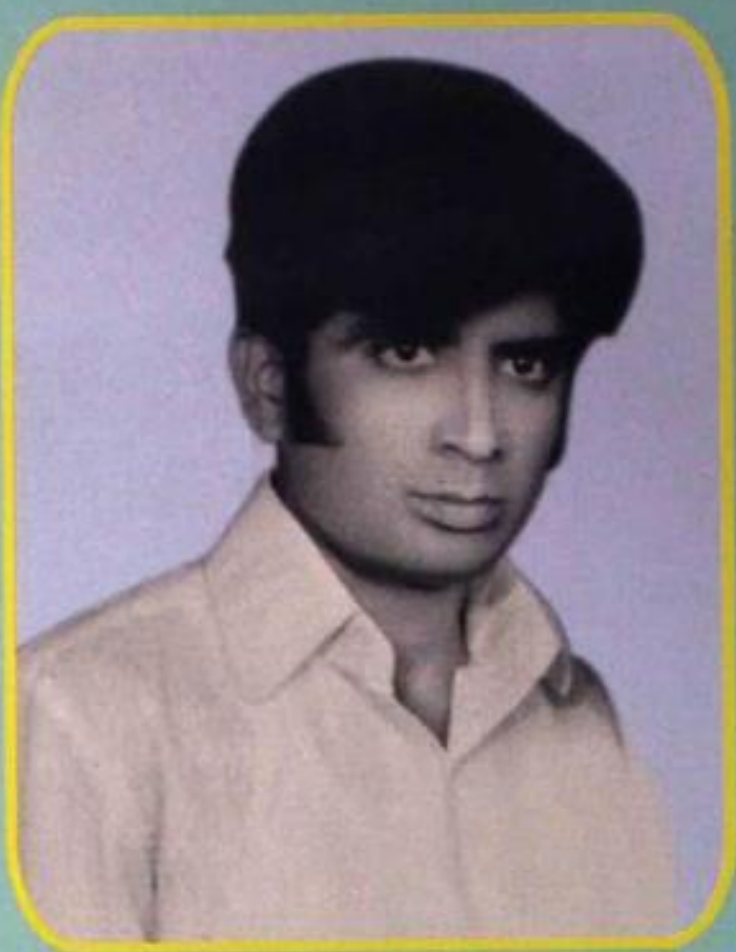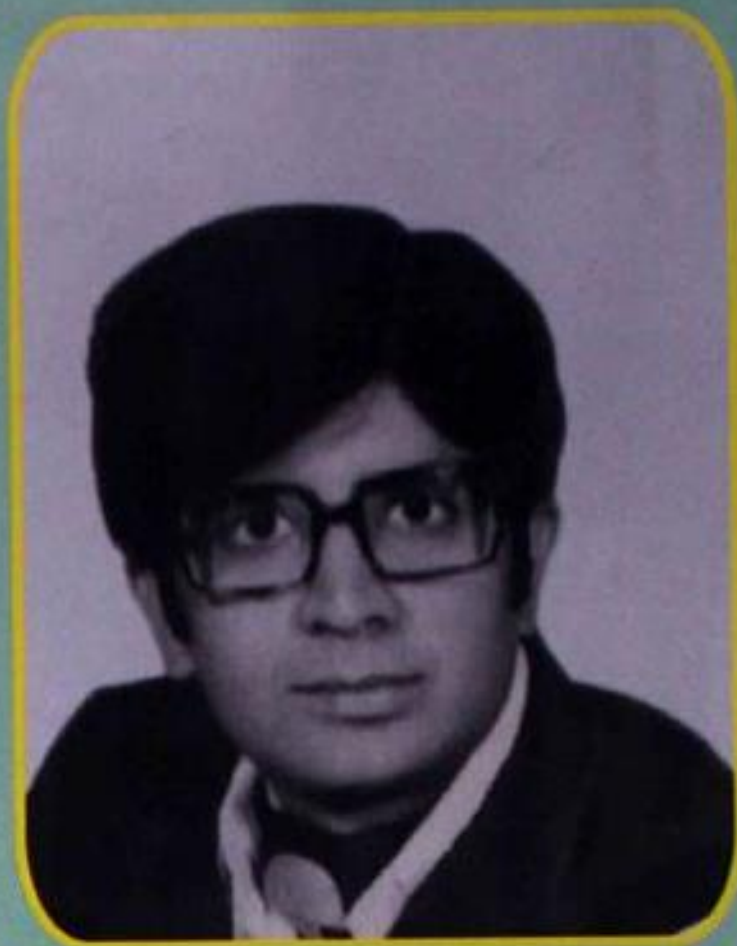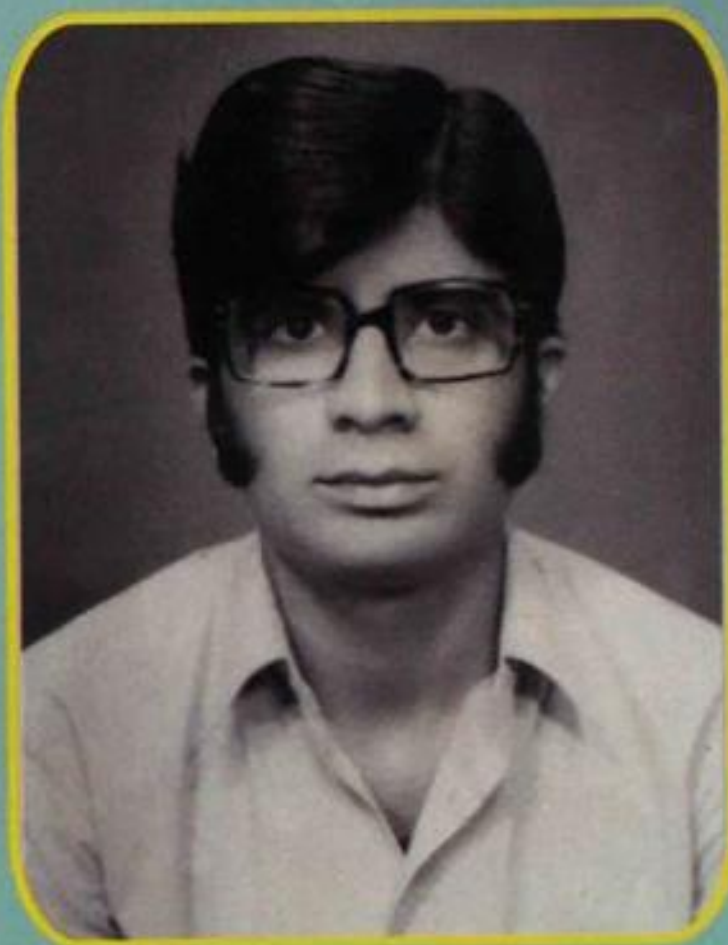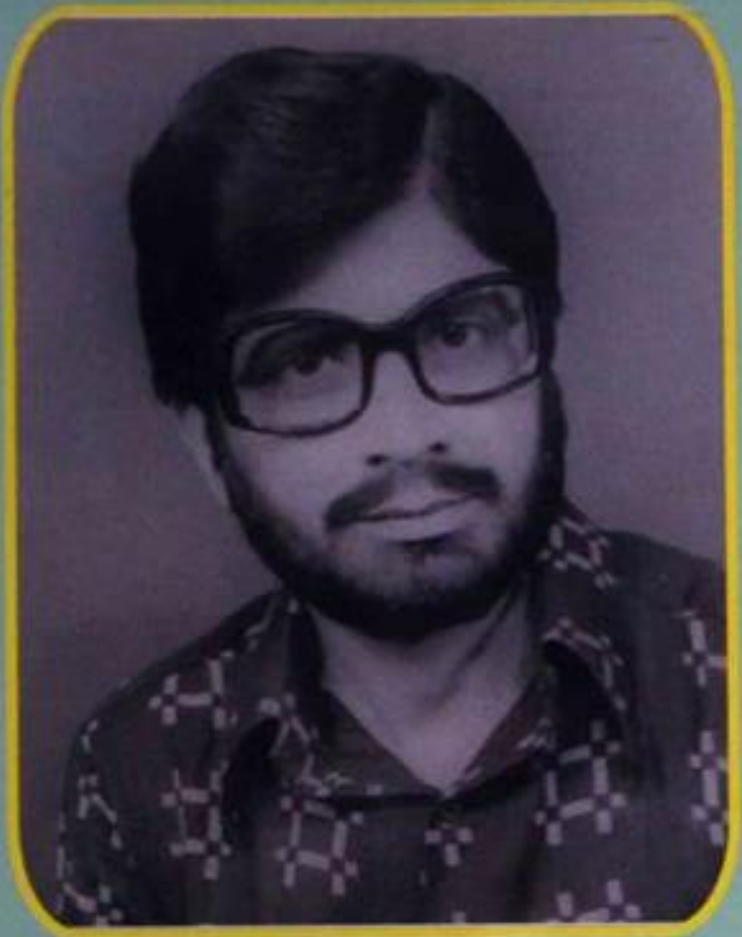
۱۹۵۴ء

۱۹۵۵ء

۱۹۶۴ء

۱۹۶۶ء

سنہ ۱۹۶۹ء

سنہ ۱۹۷۱ء

سنہ ۱۹۷۰ء

۱۹۷۲ء

۱۹۷۴ء

۱۹۷۵ء

۱۹۷۶ء

۱۹۷۷ء

۱۹۷۸ء

۱۹۷۹ء

۱۹۸۰ء

۱۹۸۱ء

۱۹۸۳ء

۱۹۸۴ء

۱۹۸۵ء

۱۹۸۶ء

۱۹۸۷ء

۱۹۸۸ء

۱۹۹۰ء

۱۹۹۵ء

۱۹۹۷ء

سنہ ۱۹۹۹ء

سنہ ۲۰۰۴ء

سنہ ۲۰۱۱ء

سنہ ۲۰۱۲ء
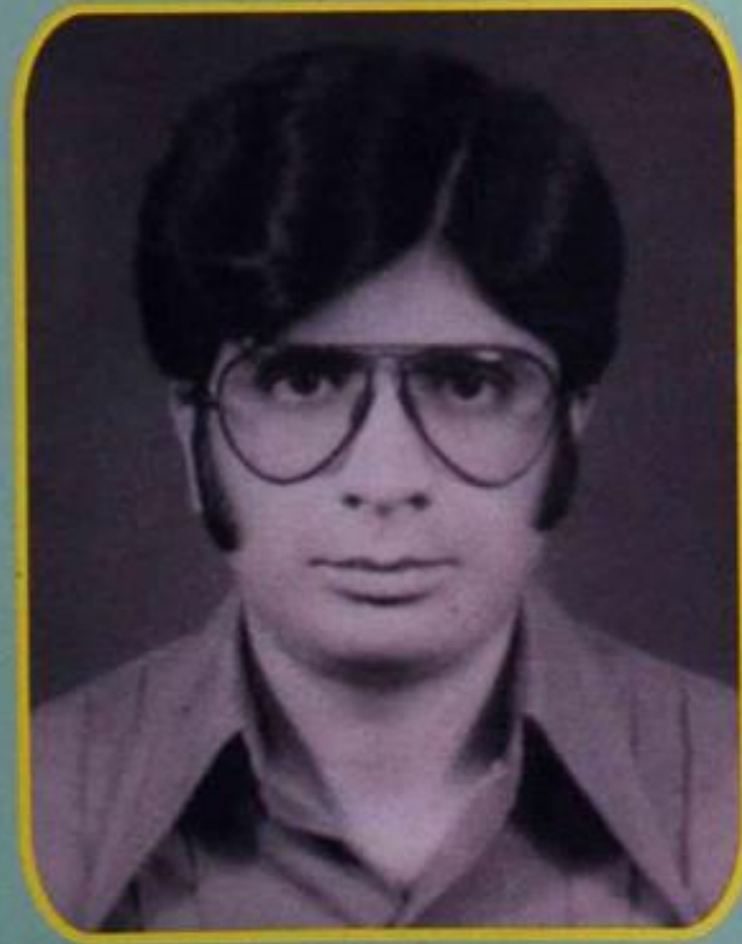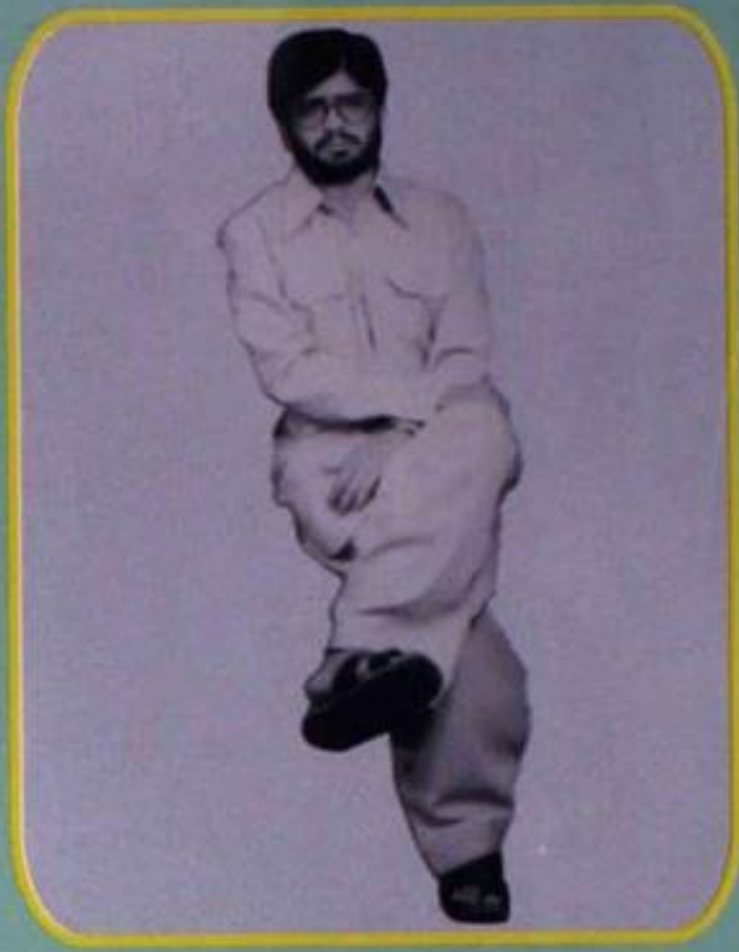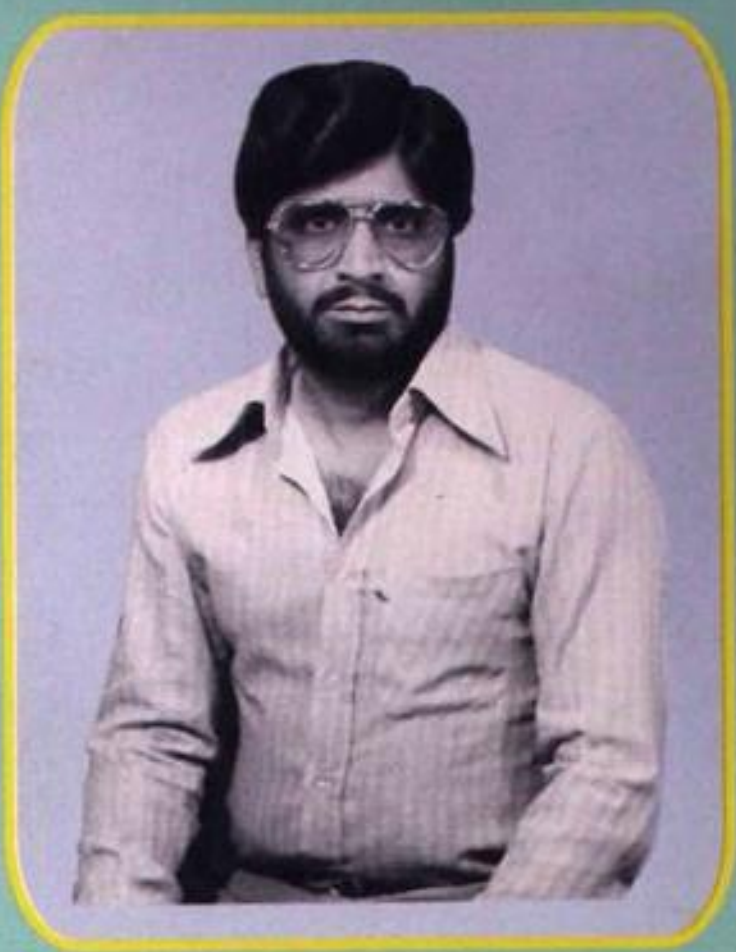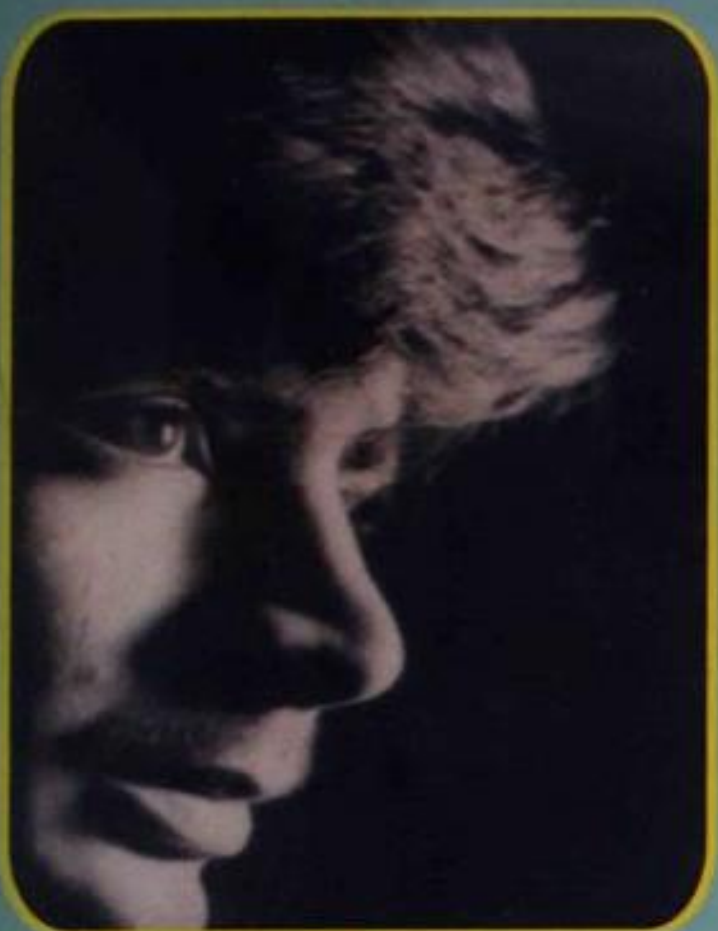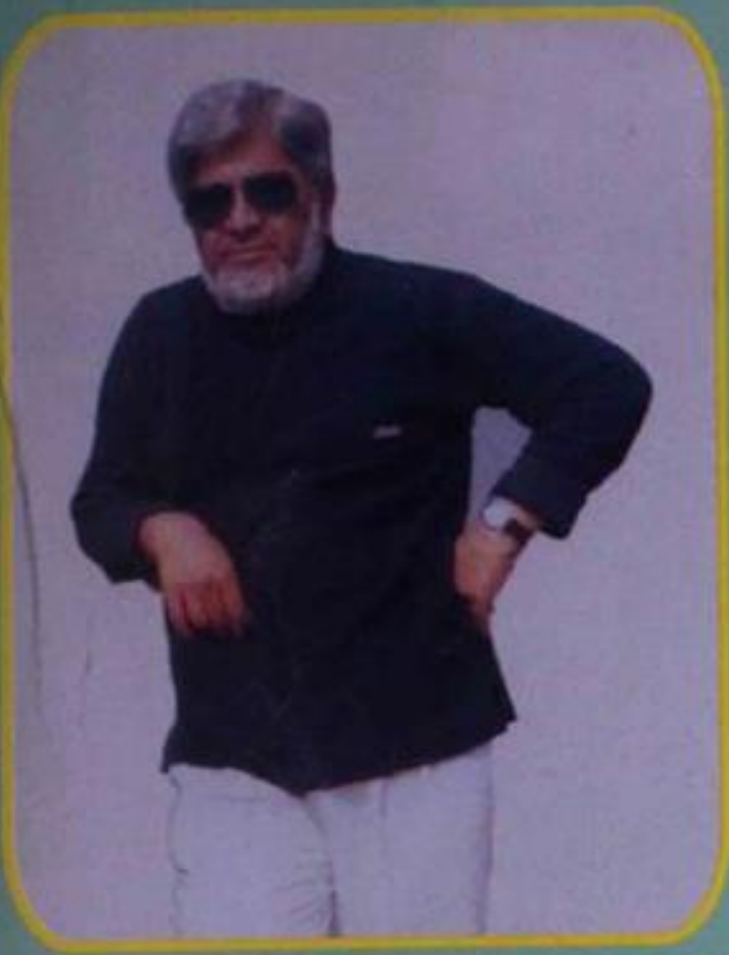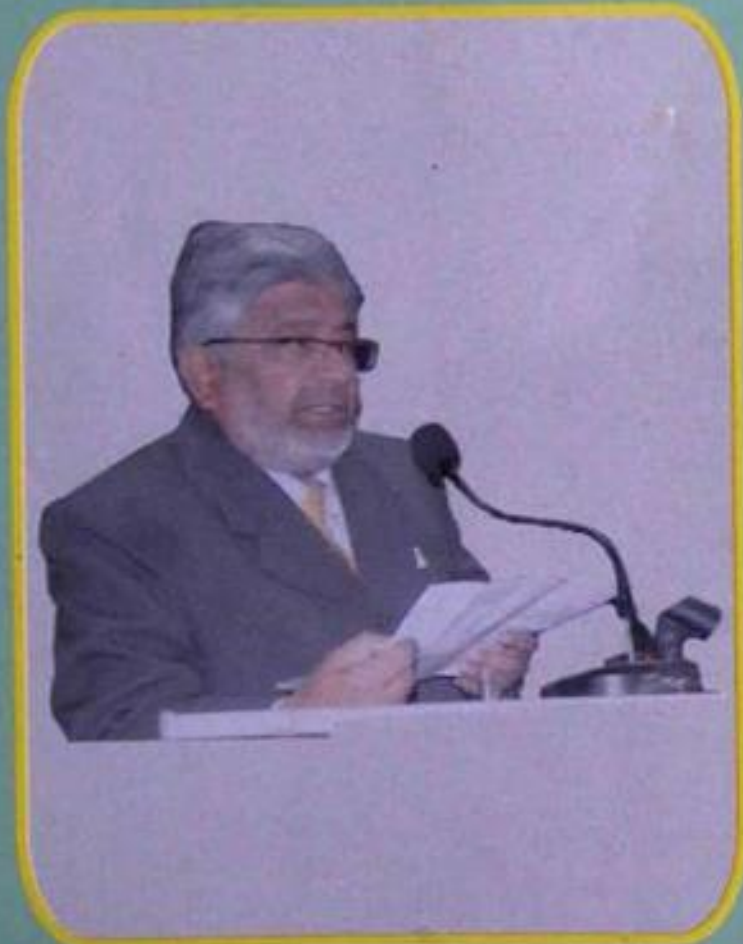
سنہ ۱۹۸۵ء

سنہری رُت کا فریب

عارف خورشید

سنہ ۱۹۸۶ء

یادوں کے سائباں

خورشید

سنہ ۱۹۸۷ء
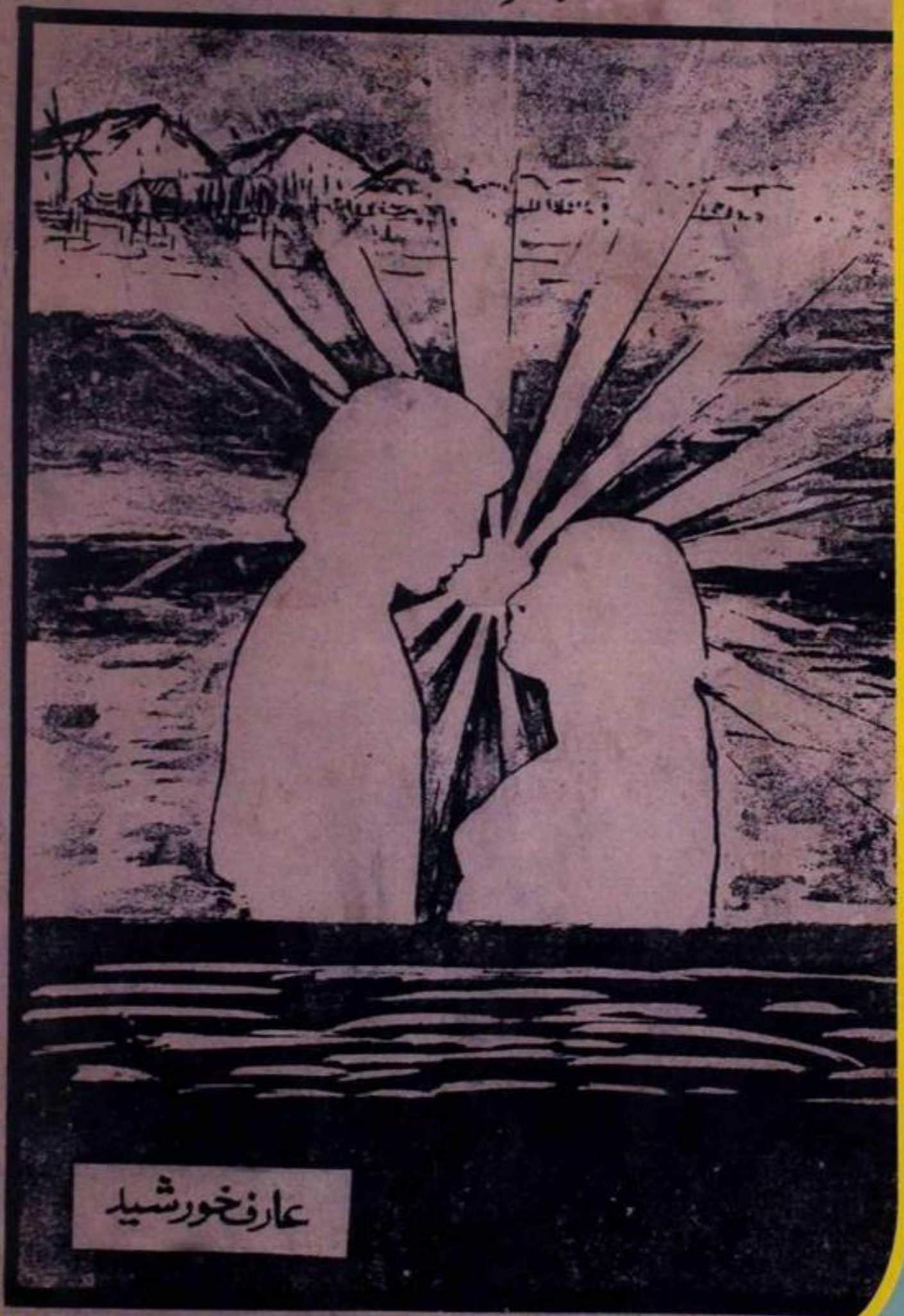
لمحوں کی صلیب
عارف خورشید
عزیز اثر
غوث ہاشمی
سنہ ۱۹۸۷ء
L

یہ شام بھی کنارہ ہوئی

سید عباس
صفی انور
عارف خورشید

سنہ ۱۹۸۷ء

M

آنکھوں کی زبان

• اقبال بلگرامی • مقصود ندیم • عارف خورشید

سنہ ۱۹۸۷ء